تاریخِ اسلام

کی

بہادر خواتین

رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانے سے لیکر عصر حاضر تک مختلف غزوات اور میدان ہائے کارزار میں "مردانہ وار" دادِ شجاعت دینے والی قابل فخر خواتین اسلام کا روح پرور تذکرہ، جس کے مطالعہ سے مردہ دلوں میں بھی عزم وہمت کے جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں

تالیف و ترتیب

مولانا ثناء اللہ سعد شجاع آبادی

مکتبہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

شاہ فیصل کالونی ۵ کراچی

تاریخ اسلام کی بہادر خواتین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ہ

تاریخ اسلام کی

بہادر خواتین

تالیف و ترتیب

(مولانا) ثناء اللہ سعد شجاع آبادی

ناشر

مکتبہ عمر فاروق
بالمقابل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی کراچی

نام کتاب .... تاریخ اسلام کی بہادر خواتین

مرتب .... مولانا ثناءاللہ شجاع آبادی

اشاعت ۲ .... نومبر 2011

تعداد 1100

طابع .... القادر پرنٹنگ پریس کراچی

ناشر .... فیاض احمد 0334-3432345 021-34594144

مکتبہ عمر فاروق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

ای میل ...... E-mail: M forooq12317@yaho.com

ملنے کے پتے

دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ، مقابل بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ، آرام باغ کراچی
ادارۃ الانور، مقابل بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
مکتبہ العارفی، جامعہ امدادیہ ستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار لاہور
مکتبہ علمیہ، بی بی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ، محلہ جنگی قصہ خوانی بازار پشاور

پیش لفظ

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اسے علم وحکمت سے نوازا، اپنی پہچان نصیب فرمائی، بحر و بر کے خزانوں پر اسے تصرف عطا فرمایا اور کائنات کی وسعتوں، گہرائیوں اور بلندیوں کے ہر ظاہر و مخفی گوشے میں موجود اپنی تمام مخلوقات کو اپنی عبادت اور اس کی خدمت پر مامور فرمادیا۔ یہ وہ سیدھی سادی سی حقیقت ہے، جس کے انکار کی کسی سلیم الطبع انسان کو ضرورت بھی نہیں اور اس کے لئے روا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش صرف اس قدر ہے کہ کوئی صاحب اپنی چالیس پچاس سالہ مصروف زندگی میں اس حقیقت تک نہیں پہنچ پائے تو اس سے قبل کہ جامِ عمر لبریز ہو جائے اور پیامِ اجل انہیں بساطِ حیات لپیٹنے پر مجبور کر دے، چاہیے کہ وہ تھوڑا سا وقت نکال کر اس مسئلہ پر غور و فکر فرمالیں تو ان شاء اللہ اس حقیقت تک پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگے گی کہ واقعتًا اس کائنات کے خالق نے ذی روح یا غیر ذی روح کوئی چیز ایسی پیدا نہیں فرمائی جسے بالواسطہ یا بلاواسطہ خدمتِ انسان پر متعین نہ کیا ہو۔

چنانچہ جب اس حقیقت کا ادراک حاصل ہو جائے تو پھر دوسری بڑی اور آسان سی بات سمجھنے میں بھی ذرا سی دیر ہی لگے گی اور وہ یہ کہ اسی خالق کائنات نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت بنی نوع انسان میں بھی جسمانی، اعصابی اور ذہنی اعتبار سے بحیثیت جنس درجہ بندی فرمائی۔ مذکورہ صفات میں مرد کو برتری عطا فرما کر فکرِ معاش، جہدِ بقاء، تقابلِ اعداء اور نظمِ ریاست وسلطنت جیسی صلاحیتوں اور ذمہ داریوں سے سرفراز فرمایا، جبکہ عورت کو نزاکت ولطافت کا مجسم پیکر بنا کر اسے عفت وعصمت

کی ردائے مقدس پہنائی۔ پرورشِ اولاد اور امور خانہ داری کی ذمہ داریاں سونپ کر اسے گھر کی ملکہ بنا دیا۔ وہ شرافت ونجابت کا گوہر تابدار ہے۔ فکرِ معاش میں سرگرداں ہو کر بازاروں اور مارکیٹوں کی خاک نہیں چھانے گی بلکہ یہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ چلچلاتی دھوپ میں، پسینے سے شرابور ہو کر چہرہ خاک آلود کرا کر بھی اس کے لئے کما کر لائے گا اور اسے گھر میں عزت ووقار کے ساتھ بٹھا کر کھلائے گا۔

وہ شرم وحیا کے خمیر سے گندھا ہوا ایک ذی روح مجسمہ ہے، جسے خالقِ ارض وسماء نے صورت میں حسن و جمال اور سیرت میں حسن کردار کی امانت سے نوازا ہے۔ اسے بازاروں، کارخانوں اور مارکیٹوں میں گھسیٹ لانے والے بزدل پست ہمت اور پست کردار معاشرتی ناسور اس کے دامن عصمت پر چھینٹے اڑا کر اسے بدسیرت وبدصورت کر ڈالیں گے۔ خدانخواستہ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ''بنتِ حوا'' بنتِ ہوا ہو جائے گی۔ کائناتِ رنگ وبو اپنا حسن وجمال کھو دے گی اور نسوانیت کی انمول قدریں ہمیشہ کے لئے پامال ہو جائیں گی۔

لیکن ایسا کیوں ہو؟ کیا رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات کا سورج بلند نہیں ہو چکا؟ اور ان مقدس تعلیمات کی اشاعت وترویج کے لئے قافلے گھروں سے باہر نکل نہیں چکے؟ کیا کفر کے اندھیروں سے ایمان کی روشنی کا سفر شروع نہیں ہوا؟ اور کیا ''عورت'' نہیں جانتی کہ اب وہ دورِ جاہلیت کی مخلوق نہیں ہے کہ اسے زندہ گاڑ دیا جائے گا۔ جی ہاں! وہ جانتی ہے، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ بیٹی کی صورت میں وہ رحمت ہے، بہن کی صورت میں مستحقِ شفقت ہے۔ بیوی کی صورت میں وہ خود ''عزت'' سراپا عظمت ہے۔ جبکہ ماں کی صورت میں اس کے قدموں تلے جنت ہے۔

......ایک مسلمان عورت اپنے مقام سے بے خبر نہیں ہو سکتی اور اسلام اس کے مقام کا محافظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر کو ہی اپنی جنت سمجھا، اور شیطانی افکار ونظریات کے سبز باغوں میں اچھل کود کی بجائے اپنی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز گھر ہی کو تصور کیا۔ اِلّا یہ کہ جب صورت ایسی بن گئی کہ اسلام یا اسلامی ریاست کو خطرہ لاحق ہوا اور گویا جان پہ بن آئی تو پھر بھی اس عورت نے اسلام ہی کو اپنا سائبان تصور کرتے ہوئے اپنا کردار ادا

کیا اور اکثر اوقات اپنی جان تک لڑا کر تاریخ اسلام میں اپنا نام غیور و جسور مجاہدین کی فہرست میں لکھوا گئیں۔

زیرِ نظر کتاب ایسی شیر دل خواتین کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ مختلف مشاہیر اصحابِ قلم نے ان خواتین کے جذبہ سرفروشی کی تاریخ کو رقم کیا اور برادرم محمد فیاض مالک مکتبہ عمر فاروق کی خواہش پر ناچیز مرتب نے اس تاریخ کو یکجا کرنے کی سعی کی۔

''تاریخ اسلام کی بہادر خواتین'' کی تعداد بے شمار مگر کافی حد تک عدم دستیاب ہے۔ کیونکہ مسلمان عورت مر مٹنے کے بعد بھی پردۂ اخفاء میں رہنا پسند کرتی ہے۔ گذشتہ سالوں میں کشمیر، افغانستان، فلسطین، چیچنیا اور بوسنیا وغیرہ ریاستوں میں کفر کے مقابل خواتینِ اسلام کی جرأت و بہادری کے سینکڑوں عجیب و غریب واقعات پیش آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت ان واقعات اور ناموں کو مستور ہی رکھا۔

جو چند واقعات تاریخ محفوظ کر سکی، ایک نئے انداز میں آپ کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں۔ کتاب کی تیاری میں محمد قاسم فرشتہ کی ''تاریخِ فرشتہ'' جناب طالب الہاشمی کی ''تذکارِ صحابیات'' اور ''تاریخِ اسلام کی ۴۰۰ باکمال خواتین''، علامہ واقدیؒ کی ''فتوح الشام (اردو ترجمہ)'' طلحہ علی کی ''نامور مغل شہزادیاں'' مولانا غلام رسول مہر کی ''۱۸۵۷ء کے مجاہدینِ آزادی'' کے علاوہ خطباتِ حکیم الاسلام اور ماہنامہ بناتِ عائشہ کراچی کے مختلف پرچوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صنفِ نازک کے ان مجاہدانہ واقعات سے ہمیں عبرت اور سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔ آمین

والسلام

محمد ثناء اللہ سعد

۳-۲-۲۰۰۴ء

محمد رسول الله

فہرست مضامین

حضرت صفیہؓ بنتِ عبدالمطّلب

یہ سعادت ہی کیا کم ہے کہ وہ حضور ﷺ کی واحد پھوپھی تھیں جنہیں قبولِ اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ مگر غزوۂ اُحد میں ان کے بھائی حضرت حمزہؓ کی بے مثال قربانی پر اس عظیم خاتون کے صبر واستقلال اور جذبۂ تسلیم ورضا نے انہیں رہتی دنیا کے لئے ایک مثال بنادیا۔ عورت ذات سے اس قدر صبر واستقامت کی توقع نہیں کی جاسکتی اور صبر واستقامت دراصل شجاعت و بے خوفی کا ایک لازمہ ہے۔

غور فرمایئے، اُحد پہاڑ کے دامن میں عمِ رسول ﷺ حضرت حمزہؓ کی لاش اس حالت میں پڑی ہوئی تھی کہ مشرکین مکہ نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ اور روایات کے مطابق کلیجہ تک نکال کر چبانے سے گریز نہیں کیا تھا۔ یہ ایسا دردناک منظر تھا کہ دیکھنے والوں کے کلیجے منہ کو آتے اور دل دہل جاتے تھے۔ لیکن صفیہؓ خاتون نے جس شان کے ساتھ جا کر اپنے بھائی کی لاش پر سلامِ عقیدت پیش کیا وہ تاریخ اسلام کے ماتھے کا جھومر ہے۔

پھر اس خاتون نے ۵ھ میں غزوہ بنو قریظہ کے دوران اپنی شجاعت کے نقوش تاریخ اسلام پر ثبت کردیئے۔ اس حالت میں کہ وہ دیگر خواتین اسلام کے ساتھ قلعہ بند تھیں، مگر شجاعت ایک ایسا خداداد وصف ہے کہ اس نے اس موقعہ پر بھی اپنا رنگ جما کر دکھادیا اور وہ یہودی جو جاسوسی مشن پر قلعہ کے اردگرد منڈلاتا پھرتا تھا، ایک خاتون کے ہاتھوں کس طرح جہنم واصل ہوا۔ آیئے تاریخ اسلام کی اس بہادر خاتون کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے۔

غزوۂ بنو قریظہ کی قلعہ بند مجاہدہ

غزوۂ احزاب (سن ۵ ہجری) میں سارے عرب کے مشرکین اور یہود نے متحد ہو کر مرکزِ اسلام پر یلغار کر دی تھی اور خاص مدینہ منورہ کے اندر یہودِ بنو قریظہ غداری کر کے اہل حق کی جانوں کے لاگو ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کیلئے یہ بہت بُری آزمائش تھی، لیکن آفریں، اللہ کے ان پاکباز بندوں پر کہ کیا مجال ایک لمحے کے لئے ان کے پائے استقامت میں لغزش آئی ہو۔ انہوں نے تو اپنی جانیں اور مال راہِ حق میں بیچ کر دیئے تھے اور زندگی کے آخری سانس تک کفر و شرک کے طوفانوں سے ٹکرانے نے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ تاہم عورتوں اور بچوں کو گھر کے دشمنوں یہودِ بنو قریظہ کی دست درازی اور شر سے بچانا ضروری تھا۔ چنانچہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمان خواتین اور بچوں کو بنظرِ احتیاط انصار کے ایک قلعہ فارع یا اطم میں منتقل کر دیا اور حضرت حسانؓ بن ثابت (شاعر رسولؐ اللہ) کو ان کی نگرانی پر مامور فرما دیا۔ قلعہ اگر چہ خاصا مضبوط تھا، لیکن پھر بھی یہ انتظام خطرے سے یکسر خالی نہ تھا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام جانثاروں کے ہمراہ جہاد میں مشغول تھے اور بنو قریظۂ کے محلے اور اس قلعے کے درمیان کوئی فوجی دستہ موجود نہ تھا۔ انہی پُرآشوب ایام میں ایک دن ایک یہودی اس طرف آنکلا اور قلعے میں موجود لوگوں کی سن گن لینے لگا۔ حسن اتفاق سے ایک بوڑھی لیکن صحت مند خاتون نے اس یہودی کو دیکھ لیا، وہ اپنی خداداد فراست سے سمجھ گئیں کہ یہ شخص جاسوس ہے، اگر اس نے بنو قریظۂ کے شریر النفس لوگوں کو جا کر بتا دیا کہ قلعے میں صرف عورتیں اور بچے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ میدان خالی دیکھ کر قلعے پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے نگرانِ قلعہ حضرت حسانؓ سے کہا کہ باہر نکل کر اس یہودی کو قتل کر دیں۔

حضرت حسانؓ نے عذر کیا۔ اس کا سبب اہل سیر کے نزدیک ان کی جسمانی یا قلبی کمزوری تھی جو کسی مرض میں مبتلا رہنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے اس موقع پر یہ جواب دیا:

"میں اس یہودی سے لڑنے کے قابل ہوتا تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ ہوتا؟"

وہ خاتون حضرت حسانؓ کا جواب سن کر فوراً اٹھیں، خیمے کی ایک چوب اکھاڑی قلعے سے باہر آئیں اور اس یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں لکھا ہے کہ یہودی کو قتل کرنے کے بعد انہوں نے حضرت حسانؓ سے کہا، جا کر اس کا سر کاٹ کر لاؤ، انہوں نے اس میں بھی عذر کیا تو بہادر خاتون نے خود ہی اُس کا سر کاٹ کر قلعے سے نیچے پھینک دیا۔ یہود بنی قریظہ کو کٹا ہوا سر دیکھ کر یقین ہو گیا کہ قلعہ کے اندر بھی مسلمانوں کی فوج موجود ہے۔ چنانچہ انہیں قلعے پر حملہ کرنے ہمت نہ پڑی۔ علامہ ابن اثیرؒ جزری کا بیان ہے کہ پھر اس خاتون نے حضرت حسانؓ سے کہا: "اب جا کر مقتول یہودی کا سامان اتار لو۔" وہ بولے: "مجھے اس کی خواہش نہیں۔" ابن اثیرؒ کہتے ہیں کہ یہ پہلی بہادری تھی جو ایک مسلمان عورت سے ظاہر ہوئی۔ چنانچہ سرورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مالِ غنیمت میں سے حصہ عطا فرمایا۔

یہ شیر دل خاتون جن کی شجاعت اور بے خوفی نے ایک بڑا خطرہ ٹال دیا اور تمام مسلمانوں عورتوں اور بچوں کو یہودیوں کے دستِ ستم سے بچالیا، بنو ہاشم کی چشم و چراغ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ بنتِ عبدالمطلب تھیں۔

حضور ﷺ کی واحد مومنہ پھوپھی ہونے کا اعزاز

حضرت صفیہؓ بنتِ عبدالمطلب کا شمار بڑی جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ وہ ہالہ بنت وہیب (یا اہیب) بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مرّہ کے بطن سے تھیں۔ جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہیب بن عبد مناف کی چچازاد بہن تھیں۔ اس رشتے سے وہ حضورؐ کی خالہ زاد بہن بھی ہوتی تھیں۔ شیرِ خدا حضرت حمزہؓ شہیدِ اُحد اُن کے حقیقی بھائی تھے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد عبداللہ بن عبدالمطلب کی دوسری بیوی...... بنت عمرو کے بطن سے تھے۔ اس رشتے سے حضرت صفیہ حضورؐ کی پھوپھی تھیں، اس لئے انہیں عمۃ النبی کہا جاتا ہے۔ حضورؐ کی دوسری پھوپھیوں، ام حکیم بیضاء، امیمہ، عاتکہ، عاتکہ، ...... کے اسلام کے بارے میں ...... میں اختلاف ہے، لیکن حضرت صفیہؓ کے اسلام پر سب کا اتفاق ہے۔ ابن اثیرؒ نے "اسد الغابہ" میں لکھا ہے۔ "صحیح یہ ہے کہ ان کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی پھوپھی نے اسلام قبول نہیں کیا"۔

اگرچہ ابنِ سعدؒ اور حافظ ابنِ قیمؒ نے عاتکہ...... کو بھی اسلام لانے والی خواتین شامل کیا ہے۔ لیکن حضرت صفیہؓ...... شرف پھر بھی باقی رہتا ہے کہ وہ دعوتِ حق کے آغاز ہی میں سعادت اندوزِ ایمان ہوگئیں اور سابقون الاولون کی اس مقدس جماعت میں شمار ہوئیں جس کو اللہ تعالیٰ نے کھلے لفظوں میں جنت کی بشارت دی ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی ولادت کے زمانے میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ اس لئے وہ قریب قریب حضور کی ہم سِن تھیں۔

زبیرؓ جیسے شیر دل بیٹے کی تربیت میں سیدہ صفیہؓ کا کردار

حضرت صفیہؓ کا پہلا نکاح حارث بن اموی سے ہوا جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کے انتقال کے بعد عوام بن خویلد قریشی الاسدی کے عقدِ نکاح میں آئیں جو اُم المومنین حضرت خدیجہؓ الکبریٰ کے بھائی تھے۔ حواریٔ رسولؐ حضرت زبیرؓ ابن عوام انہی سے پیدا ہوئے۔ حضرت زبیرؓ ابھی کمسن ہی تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ اس وقت حضرت صفیہؓ بالکل جوان تھیں، لیکن اس کے بعد انہوں نے ساری زندگی بیوگی کے عالم میں کاٹ دی۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم معبوث ہوئے اور لوگوں کو حق کی طرف رجوع کیا تو حضرت صفیہؓ نے بلا تامل اسلام قبول کرلیا۔ ان کے ساتھ ہی ان کے سولہ سالہ فرزند حضرت زبیر بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئے۔

حضرت صفیہؓ نے زبیرؓ کی تربیت نہایت عمدہ طریق سے کی، اُن کی خواہش تھی کہ اُن کا فرزند بڑا ہو کر ایک نڈر بہادر سپاہی بنے۔ چنانچہ وہ حضرت زبیرؓ سے سخت محنت ومشقت کا کام لیتیں اور وقتاً فوقتاً زجر وتوبیخ اور زدوکوب سے بھی گریز نہ کرتیں۔ حضرت زبیرؓ کے چچا نوفل بن خویلد ایک دن بھتیجے کو ماں کے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر بے تاب ہوگئے اور حضرت صفیہؓ کو سختی سے ڈانٹا کہ اس طرح تو تم بچے کو مار ڈالوگی۔ نوفل نے بنوہاشم اور اپنے قبیلے کے بعض دوسرے لوگوں سے بھی کہا کہ وہ صفیہؓ کو بچے پر سختی کرنے سے روکیں۔ جب اُن کی سخت گیری کا چرچا عام ہوا تو انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ رجز پڑھا۔

مَنْ قَالَ اِنِّی اَبْغَضُہٗ فَقَدْ کَذَبَ
اِنَّمَا اَضْرِبُہٗ لِکَیْ یَلَبَّ

''جس نے یہ کہا کہ میں اس (زبیرؓ) سے بغض رکھتی ہوں اس نے غلط کہا، میں اس کو اس لئے پیٹتی ہوں کہ عقلمند ہو۔''

وَيَهْزِمُ الْجَيْشَ وَيَأْتِي السَّلَبَ

''اور فوج کو شکست دے اور مالِ غنیمت حاصل کرے۔''

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ''اصابہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ کو لڑکپن میں ایک جوان اور قوی آدمی سے مقابلہ پیش آ گیا۔ انہوں نے ایسی ضرب لگائی کہ اس کا ہاتھ ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لوگوں نے حضرت صفیہؓ سے شکایت کی تو انہوں نے معذرت کرنے کی بجائے لوگوں سے سوال کیا: ''تم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو کیسا پایا بہادر یا بزدل؟''

غرض ماں کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت زبیرؓ بڑے ہو کر ایک دلاور صف شکن اور ضیغم شجاعت بنے۔ مبدأ فیض نے حضرت زبیرؓ کو یوں بھی فطرت سعید سے نوازا تھا، ماں کی تربیت نے اُن کی خوبیوں کو اور بھی چمکا دیا اور ان کے دل میں اسلام اور داعی اسلامؐ کی محبت کُوٹ کُوٹ کر بھر دی۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت زبیرؓ کی دلیرانہ شیفتگی کا عجیب عالم تھا بعثت کے ابتدائی زمانے میں ایک دن جب یہ افواہ سنی کہ حضورؐ کو نصیب دشمناں مشرکین نے گرفتار کر لیا ہے یا شہید کر دیا ہے تو ایسے بے قرار ہوئے کہ آؤ دیکھا نہ تاؤ تلوار سونت کر برق رفتاری سے آستانہ نبوی پر پہنچے۔ حضورؐ کو وہاں بخیریت موجود پایا تو جان میں جان آئی اور چہرہ فرطِ بشاشت سے گلنار ہو گیا۔ حضورؐ نے ان کی شمشیر برہنہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''زبیرؓ یہ کیا ہے؟''

عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں نے سنا تھا، کہ آپ کو دشمنوں نے گرفتار کر لیا ہے یا شاید آپ شہید کر دیئے گئے ہیں۔''

حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''اگر واقعی ایسا ہو جاتا تو تم کیا کرتے؟''

حضرت زبیرؓ نے بے ساختہ عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ خدا کی قسم میں اہلِ مکہ سے لڑ مرتا۔''

واقعاتِ ہجرت

۵ھ بعثت میں حضرت صفیہؓ کو اپنے محبوب لخت جگر کی عارضی جدائی کا صدمہ سہنا پڑا،

قبول اسلام کے بعد دوسرے مسلمانوں کی طرح زبیرؓ بھی کفار کے جوروستم کا ہدف بن گئے تھے، بالخصوص اُن کا چچا نوفل بن خویلد اُن پر بُرا ظلم وستم ڈھاتا تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے ایما پر پندرہ بلاکشانِ اسلام کا ایک قافلہ رجب ۵ھ میں حبش کی طرف ہجرت کر گیا، اس میں حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے۔ ماں پر ان کی جدائی سخت شاق تھی، لیکن حضورؐ کے ایما اور بیٹے کی سلامتی کے خیال سے انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ فرزندِ عزیز کو کالے کوسوں دُور روانہ کر دیا۔ اُن مہاجرین راہ حق کو حبش میں ابھی تین ہی مہینے گزرے تھے کہ انہوں نے ایک دل خوش کن خبر سنی۔ یہ کہ مشرکین مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے یا (ایک دوسری روایت کے مطابق) یہ کہ رسول اکرمؐ اور کفار کے درمیان مصالحت ہو گئی ہے۔ چنانچہ شوال ۵ھ بعد بعثت میں سب (یا ان میں سے اکثر) مہاجرین مکہ واپس آ گئے۔ ان میں زبیرؓ بھی تھے۔ جب وہ مکے کے قریب پہنچے، تو معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل غلط تھی، چنانچہ واپس آنے والے سبھی حضرات قریش کے کسی نہ کسی سردار کی پناہ حاصل کر کے مکے میں داخل ہوئے۔ علامہ بلاذریؒ کا بیان ہے کہ حضرت زبیرؓ بن العوام نے زمعہ بن الاسود کی پناہ حاصل کی۔ حضرت صفیہؓ اپنے لختِ جگر سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور ان کے یوں اچانک بخیریت واپس آ جانے پر سجدۂ شکر بجا لائیں مکے میں کچھ عرصہ قیام کے بعد حضرت زبیرؓ نے تجارت کا شغل اختیار کر لیا اور تجارتی قافلوں کے ساتھ شام آنے جانے لگے۔ اُسی زمانے میں حضرت صفیہؓ نے حضرت زبیرؓ کی شادی حضرت اسماءؓ بنتِ ابوبکر صدیقؓ سے کر دی یوں وہ صدیقِ اکبرؓ کی سمدھن بن گئیں۔

ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے اپنے فرزند حضرت زبیرؓ کے ساتھ مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔ مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر عازمِ مدینہ ہوئے، تو حضرت زبیرؓ تجارت کے لئے شام گئے ہوئے تھے۔ جب وہ شام سے مکے واپس آ رہے تھے تو راستے میں سرورِ عالمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاقات ہوئی جو مکے سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے۔ حضرت زبیرؓ نے حضورؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ (اپنے خسر) کی خدمت میں چند سفید کپڑے تحفۃً پیش کئے اور وہ بھی سفید کپڑے زیب تن فرما کر مدینے میں داخل ہوئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے:

''زبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ کو سفید کپڑے پہنائے۔''

(بخاری کتاب المناقب باب ہجرۃ النبیؐ)

مکے واپس آنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد حضرت زبیرؓ نے اپنی والدہ حضرت صفیہؓ اور اہلیہ حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیقؓ کے ہمراہ مدینے کی طرف ہجرت کی اور کچھ مدت قباء میں قیام پذیر رہے۔ وہیں سنہ ۱ھ (اور ایک دوسری روایت کے مطابق ۲ھ میں) حضرت اسماءؓ کے بطن سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے۔ حضرت صفیہؓ کے اس پوتے کی ولادت تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کی ولادت سے پہلے کئی ماہ تک کسی مہاجر کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی اور یہود مدینہ نے مشہور کر دیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے، اور ان کا سلسلۂ نسل منقطع کر دیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ پیدا ہوئے تو مسلمانوں کو بے حد مسرت ہوئی اور انہوں نے جوشِ انبساط میں اس زور سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کئے کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ مدینہ منورہ میں حضرت صفیہؓ حضرت زبیرؓ کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور وہ ان کی دل و جان سے خدمت کرتے تھے

سیدنا حمزہ ؓ کی شہادت پر صفیہؓ کا بے مثال صبر و استقلال

غزوہ اُحد (سنہ ۳ ہجری) میں ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا، تو حضرت صفیہؓ ہاتھ میں نیزہ لئے مدینہ سے نکلیں۔ جو لوگ میدانِ جنگ سے منہ موڑ کر مدینہ کی طرف آرہے تھے ان کو شرم اور غیرت دلاتی تھیں اور نہایت غصے سے فرماتی تھیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر چل دیئے؟''

رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو میدان جنگ کی طرف آتے دیکھا تو ان کے ثابت قدم فرزند حضرت زبیرؓ کو پاس بلا کر ارشاد فرمایا:

''صفیہؓ اپنے بھائی حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔''

حضرت حمزہؓ مردانہ وار لڑتے ہوئے جبیر بن مطعم کے غلام بن حرب کے برچھے سے شہید ہو گئے تھے۔ ہند بنت عتبہ نے اپنے باپ عتبہ (مقتول بدر) کے جوش انتقام میں اُن کی نعش کا مثلہ کیا تھا۔ یعنی ناک اور کان کاٹ ڈالے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سید الشہدا ؓ کا پیٹ چاک

کر کے اُن کا کلیجہ نکال کر چباڈالا تھا۔ رسول اکرمؐ نہیں چاہتے تھے کہ صفیہؓ اپنے محبوب اور شجاع بھائی کی لاش کو اس حالت میں دیکھیں۔ حضرت زبیرؓ نے اپنی ماں کو حضورؐ کے ارشاد سے مطلع کیا تو وہ اس کا سبب سمجھ گئیں، بولیں: "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائی کی لاش بگاڑی گئی ہے۔ خدا کی قسم مجھے یہ پسند نہیں، لیکن میں صبر کروں گی اور انشاء اللہ ضبط سے کام لوں گی۔"

حضور ﷺ حضرت صفیہؓ کے جواب سے آگاہ ہوئے تو آپؐ نے انہیں شہید راہ حق حضرت حمزہؓ کی لاش دیکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ بادیدۂ پُرنم لاش پر آئیں اور اپنے محبوب بھائی کے جسم کے ٹکڑے بکھرے دیکھ کر ایک آہِ سرد کھینچی اور اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر خاموش ہو گئیں، پھر اُن کے لئے دعائے مغفرت مانگی اور ان کی تدفین کے لئے دو چادریں حضورؐ کی خدمت میں پیش کر کے واپس مدینہ چلی گئیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے "اصابہ" میں بیان کیا ہے کہ حضرت صفیہؓ نے حضرت حمزہؓ کی شہادت پر ایک پُر درد مرثیہ کہا جس کے ایک شعر میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں مخاطب کیا:

اِنَّ یَوْمًا اَتٰی عَلَیْکَ لَیَوْمٌ

کُوِّرَتْ شَمْسُہٗ وَکَانَ مُضِیْئًا

"آج آپ پر وہ دن آیا ہے کہ آفتاب سیاہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے سے پہلے وہ روشن تھا۔"

ایک روایت میں ہے کہ حضرت صفیہ محبوب بھائی کیلئے دعائے مغفرت مانگ کر اپنے آنسو ضبط نہ کر سکیں اور بے اختیار رونے لگیں، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روتے دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے بھی سیلِ اشک رواں ہو گیا۔ پھر آپؐ نے حضرت صفیہؓ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے جبریل امین علیہ السلام نے خبر دی ہے کہ عرشِ معلّٰی پر حمزہؓ بن عبدالمطلب کو اسداللہ واسدالرسول (اللہ کا شیر اور رسول کا شیر) لکھا گیا ہے۔"

سیدہ صفیہؓ شاعرہ بھی تھیں

غزوۂ احزاب (سنہ ۵ ہجری) میں حضرت صفیہؓ نے جس بے مثال شجاعت اور بے خوفی

کا مظاہرہ کیا اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔اس وقت اُن کی عمر اٹھاون برس کے لگ بھگ تھی۔

ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ نہایت زیرک، دور اندیش، شجاع اور صابر خاتون تھیں اور تمام عرب میں اپنے حسب و نسب اور قول و فعل کے اعتبار سے امتیازی درجہ رکھتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ملکہ شاعری بھی عطا کیا تھا۔ سیرت کی بعض کتابوں میں ان کے کہے ہوئے چند مرثیے ملتے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام میں نہایت فصاحت و بلاغت تھی۔ اپنے والد عبدالمطلب کی وفات پر انہوں نے جو مرثیہ کیا اس کے چند اشعار یہ ہیں:

(ترجمہ) ''رات کو ایک نوحہ کرنے والی کی آواز نے مجھے رُلایا ہے۔ وہ ایک مردِ کریم پر نوحہ کناں تھی۔

اور اس حال میں میرے آنسو موتیوں کی طرح میرے گالوں پر بہنے لگے۔ افسوس ہے اس مردِ کریم کی موت پر

جو بیہودہ نہ تھا اور اس کی بزرگی کا چرچا دُور دُور تک تھا۔ وہ عالی نسب، صاحب جود و سخا اور قحط سالی میں لوگوں کے لئے ابرِ رحمت تھا۔

پس اگر انسان کو اپنی قدیم بزرگی کی وجہ سے دوام ہوتا (لیکن دوام کی کوئی صورت نہیں)

تو وہ مردِ کریم اپنی قدیم شرافت اور فضیلت کی بنا پر بہت زمانے تک زندہ رہتا۔''

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہؓ کے بھتیجے، خالہ زاد بھائی اور شوہر کے بہنوئی تھے۔ بچپن میں انہوں نے حضورؐ کے ساتھ ایک ہی گھر میں پرورش پائی تھی اس لئے انہیں حضور ﷺ کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی۔ سرور عالم کو بھی ان سے بڑا تعلق خاطر تھا اور آپؐ اُن کے فرزند حضرت زبیر ؓ کو اکثر ''ابن صفیہؓ'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ سنہ ۱۱ ہجری میں حضور ﷺ نے رحلت فرمائی تو حضرت صفیہؓ پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ اس موقع پر انہوں نے جو دردناک مرثیہ کہا، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

''یارسولؐ اللہ آپ ہماری امید تھے، آپ ہمارے محسن تھے، ظالم نہ تھے۔ آپ رحیم تھے، ہدایت کرنے والے اور تعلیم دینے والے تھے۔ آج ہر رونے والے کو آپؐ پر رونا چاہئے۔ رسولؐ اللہ پر میری ماں، خالہ، چچا اور ماموں قربان ہوں، پھر میں خود

اور میرا مال بھی۔کاش! اللہ ہمارے آقا کو ہمارے درمیان رکھتا، تو ہم کیسے خوش قسمت تھے، لیکن حکم الٰہی اٹل ہے۔آپؐ پر اللہ کا سلام ہو اور آپؐ جنات عدن میں داخل ہوں۔''

ایک اور مرثیہ کا مطلع ہے۔

''اے آنکھ رسول اللہ کی وفات پر خوب آنسو بہا''

حضرت صفیہؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔اس وقت ان کی عمر ۷۳ برس کی تھی۔آخری آرام گاہ قبرستان بقیع میں ہے۔رضی اللہ تعالیٰ عنہا

❁❁❁❁

مکمل حالات معلوم کرنے کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔
اسد الغابہ۔الطبقات الکبریٰ۔سیر اعلام النبلاء۔الاصابہ۔الاستیعاب۔
حیات الصحابہ۔تاریخ طبری۔فتوح البلدان۔المعارف لابن قتیبہ۔
المستطرف فی کل فن مستظرف

حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر صدیقؓ

اس عظیم صحابیہ نے ہر طرف سے شرف و مجد اپنے لئے جمع کر لیا تھا۔

☆اس کا باپ صحابی......

اور وہ عظیم صحابی جسے دنیا خلیفہ بلا فصل سیدنا صدیق اکبرؓ کے نام سے جانتی ہے۔

☆اس کا دادا صحابیؓ......

ابو قحافہؓ، جسے صدیق اکبرؓ کا باپ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

☆اس کی بہن صحابیہؓ......

جسے افقِ عالم پر ام المومنین اور محبوبہ رسول اللہ کے اعزاز سے شہرتِ دوام حاصل ہے، سیدہ عائشہ صدیقہ سلام اللہ علیہا۔

☆اس کا خاوند صحابیؓ......

حواریٔ رسول زبیر بن عوام ؓ

☆اس کا بیٹا صحابیؓ......

عبداللہ بن زبیرؓ

اس بچی نے ابو جہل کا زناٹے دار تھپڑ اپنے رخساروں پر کھانا گوارہ کر لیا مگر اپنے چچا (صلی اللہ علیہ وسلم) اور والد کا پتہ بتانا گوارہ نہیں کیا۔

وہ نوجوان خاتون بدامنی کے زمانے میں اپنے سرہانے خنجر رکھ کر سوتی تھیں کہ کوئی چور یا ڈاکو میرے گھر میں گھسا تو خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر دوں گا۔

اس سوسالہ بوڑھی شیرنی نے اپنے ۲۷ سالہ شیر دل فرزند سے کہا:

''بیٹا میں تمہارا انجام دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں کہ اگر تمہیں شہادت نصیب ہو تو اپنے ہاتھوں سے تمہاری تجہیز و تکفین کروں اور اگر تم فتح پاؤ تو میرا دل ٹھنڈا ہو''۔

بیٹے نے جب کہا ''اماں جان میں موت سے نہیں ڈرتا، صرف یہ خیال ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کا مثلہ کریں گے اور صلیب پر لٹکائیں گے جس سے آپ کو رنج ہوگا'' تو ماں نے جواب دیا، بیٹا! جب بکری ذبح کر ڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کیے جائیں اسے کیا پرواہ؟ تم اللہ پر بھروسہ کر کے اپنا کام کیے جاؤ۔

اس نے حجاج بن یوسف جیسے جابر و قاہر شخص کے سامنے حق گوئی کی مثال قائم کر دی اور اسے صاف لفظوں میں کہا:

''تو نے میرے فرزند کی دنیا خراب کی، اور اس نے تیری آخرت برباد کر دی ہے''۔

شب ہجرت کی وہ ابتلاء، جو ننھی اسماءؓ پہ گذری!

جس رات کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے غار ثور میں تشریف فرما ہوئے، مشرکین نافرجام ساری رات کاشانۂ نبوت کے گرد گھیرا ڈال کر اس بات کا انتظار کرتے رہے کہ حضور ﷺ کب باہر تشریف لائیں اور وہ اپنا ناپاک منصوبہ پورا کریں۔ لیکن ان بدبختوں کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے رات کو ان کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات پڑھتے ہوئے ان کے درمیان سے نکل کر مکہ معظمہ کو الوداع کہہ چکے تھے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا اور انہوں نے حضور ﷺ کے بستر اقدس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو استراحت فرماتا دیکھا تو سر پیٹ کر رہ گئے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آ گئی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان کا سرخیل ابوجہل اپنے منصوبے کی ناکامی پر غم و غصہ سے دیوانہ ہو گیا

اور سیدھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچ کر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگا، اندر سے ایک نوجوان خاتون باہر آئیں۔

ابوجہل نے کڑک کر پوچھا: ''لڑکی تیرا باپ کدھر ہے؟

خاتون نے جواب دیا: ''میں کیا بتا سکتی ہوں؟''

یہ سن کر ابوجہل نے خاتون کے چہرے پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ اُن کے کان کی بالی ٹوٹ کر دور جا پڑی۔ مظلوم خاتون بڑے صبر اور خاموشی کے ساتھ گھر کے اندر چلی گئیں اور ابوجہل بکتا جھکتا وہاں سے دفع ہو گیا۔

یہ خاتون جنہوں نے فرعونِ قریش ابوجہل کے قہر وغضب کی مطلق پرواہ نہ کی اور ہجرت کے پُر خطر راز کو اپنے نہاں خانۂ دل میں محفوظ رکھا۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تھیں۔

سیدہ اسماءؓ کا حسب ونسب اور ولادت

حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ (بن ابوقحافہ عثمانؓ بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرّہ بن کعب بن لوی القرشی) کا شمار نہایت بلند مرتبہ صحابیات میں ہوتا ہے۔ والدہ کا نام قتیلہ بنت عبدالعزیٰ تھا، نانا عبدالعزیٰ قریش کے نامور رئیس تھے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت اسماءؓ کی سوتیلی بہن تھیں اور ان سے عمر میں چھوٹی تھیں۔ حضرت عبداللہؓ بن ابی بکرؓ حضرت اسماءؓ کے حقیقی بھائی تھے۔

حضرت اسماءؓ ہجرتِ نبویؐ سے ستائیس سال قبل مکہ معظمہ میں پیدا ہوئیں۔ والد ماجد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ روزِ اوّل سے ہی نہایت اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے پاکباز اور فرشتہ سیرت باپ کے زیرِ سایہ ان کی تربیت کیسی ہوئی ہوگی۔

ایمان لانے میں اٹھارواں نمبر

قبولِ اسلام کے لحاظ سے بھی حضرت اسماءؓ کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔ وہ اوائلِ بعثت میں اس وقت سعادت اندوزِ اسلام ہوئیں جب صرف سترہ نفوسِ قدسی مخفی طور پر ایمان لائے

تھے۔اس طرح السابقون الاولون کی صف میں ان کا اٹھارہواں نمبر ہے۔

سیدہ اسماءؓ کا نکاح

حضرت اسماءؓ کا نکاح حواریٔ رسولؐ حضرت زبیرؓ بن العوام سے ہوا جو اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں۔وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھتیجے تھے۔

سیدہ اسماءؓ مصائب کی عینی گواہ

بعثت کے چوتھے سال کے اوائل میں رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانیہ تبلیغِ حق کا آغاز کیا تو مشرکینِ قریش کے قہر وغضب کا آتش فشاں پوری قوت سے پھٹ پڑا اور انہوں نے پرستارانِ حق پر ایسے دلدوز مظالم ڈھانے شروع کر دیئے کہ انسانیت سر پیٹ کر رہ گئی۔حضرت اسماءؓ نے ایسے کئی مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھے۔مسندِ ابویعلیٰ میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت اسماءؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے ہاتھوں جو تکالیف پہنچیں آپ نے ان میں سے کون سی تکلیف زیادہ سخت دیکھی۔حضرت اسماءؓ نے بیان کیا کہ:

> ''ایک دن بہت سے مشرکین مسجد الحرام میں بیٹھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے معبودوں کو یہ اور یہ کہا۔اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے۔تمام مشرکین حضور ﷺ پر جھپٹ پڑے۔حضرت ابوبکرؓ تک اُن کے شور وغوغا کی آواز پہنچی۔اُس وقت وہ گھر میں ہمارے پاس بیٹھے تھے کسی نے آ کر بتایا کہ قریش محمد (ﷺ) کے قتل پر آمادہ ہیں۔حضرت ابوبکرؓ مسجد حرام کی طرف بھاگ کر گئے۔اس وقت اُن کے سر پر چار زلفیں تھیں اور وہ کفار سے کہہ رہے تھے،تمہارا ناس جائے کیا تم اس آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس اپنے رب کی جانب سے واضح دلائل لے کر آیا ہے۔مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ پر

ٹوٹ پڑے۔ اتنا زدوکوب کیا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ جب انہیں اٹھا کر گھر لائے تو زخموں کی وجہ سے اُن کی یہ حالت تھی کہ ہم سر کی جس مینڈھی کو ہاتھ لگاتے تھے بال جھڑ جاتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ کہہ رہے تھے "یا ذا الجلال والاکرام"۔

اپنے آقا و مولا، شفیق والدِ گرامیؓ اور دوسرے اہلِ حق پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر حضرت اسماءؓ کے دل پر جو گزرتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تاہم وہ نہایت صبر واستقامت کے ساتھ یہ روحانی کلفت سہتی رہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔

وہ "ذات النطاقین" کیوں کہلائیں؟

سفرِ ہجرت میں حضرت اسماءؓ کے پدرِ گرامی کو "رفاقتِ خیر البشرؐ" کا مہتم بالشان شرف حاصل ہوا۔ شب ہجرت کو حضورؐ نے اپنے بستر مبارک پر اپنے جاں نثار ابن عم حضرت علی المرتضیٰؓ کو سلایا اور خود سورۂ یٰسین کی ابتدائی آیات پڑھتے ہوئے دشمنوں کے درمیان سے گزر کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ مشرکین کو اللہ تعالیٰ نے ایسا غافل کیا کہ انہیں خبر ہی نہ ہوئی کہ حضورؐ کب اپنے کاشانۂ اقدس سے باہر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ مل کر فوراً سامانِ سفر درست کیا، حضرت اسماءؓ نے دو تین دن کا کھانا تیار کر رکھا تھا۔ اسے ایک تھیلے میں ڈالا اور ایک مشکیزے میں پانی ڈالا۔ اتفاق سے تھیلے اور مشکیزے کا منہ باندھنے کے لئے گھر میں کوئی رسی موجود نہ تھی اور وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، حضرت اسماء نے فوراً اپنا کمر بند (نطاق) کھول کر اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک سے کھانے کے تھیلے کا منہ باندھا اور دوسرے سے مشکیزے کا۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماءؓ کی اس خدمت سے بہت خوش ہوئے اور انہیں "ذات النطاقین" کا لقب عطا فرمایا۔

بعض روایتوں میں اس واقعہ کو ایک دوسری صورت میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ شب ہجرت میں حضورؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں مکے سے نکل کر غارِ ثور میں نزولِ اجلال فرمایا۔ حضرت اسماءؓ اس راز سے آگاہ تھیں وہ روزانہ رات کو اپنے بھائی حضرت عبداللہؓ بن ابی

بکرؓ کے ساتھ خفیہ طور پر غارِ ثور میں تشریف لے جاتیں اور حضور ﷺ اور اپنے والد ماجد کو تازہ کھانا کھلا کر واپس آتیں۔ تیسری رات کے آخری حصے میں عبداللہ بن اُریقط جسے راہ نمائی کے لیے مقرر کیا گیا تھا، حسب ہدایت دو اونٹنیاں لے کر غارِ ثور پر پہنچ گیا۔ اسی وقت حضرت اسماءؓ بھی ایک تھیلے میں کھانا ڈال کر آ پہنچیں۔ جلدی میں گھر سے چلتے وقت اس کو باندھنے کے لیے کوئی چیز ساتھ لانے کا خیال نہ رہا۔ چنانچہ انہوں نے اپنا نطاق (وہ رومال یا کپڑا جو اس زمانے میں عورتیں قمیص کے اوپر کمر پر لپیٹتی تھیں) کھول کر اسے پھاڑا۔ ایک حصے سے زادِ راہ کے تھیلے کا منہ باندھ کر ایک اونٹنی کے کجاوے کے ساتھ لٹکا دیا اور دوسرا حصہ اپنی کمر پر لپیٹ لیا۔ اسی لیے انہیں ذات النطاقین کہا جاتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت اسماءؓ کا اپنا بیان یہ ہے کہ جب توشہ دان کو باندھنے کے لئے اور کوئی چیز نہ ملی تو میرے والد نے مجھے اپنا نطاق پھاڑنے کا حکم دیا۔ اسی وجہ سے میرا نام ذات النطاقین رکھا گیا۔

بعض روایتوں میں ان کا لقب ذات النطاق بھی بیان کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری (باب الہجرۃ) میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ اسماءؓ نے اپنے نطاق کا ایک ٹکڑا پھاڑا اور اس کو تھیلی کے منہ پر لپیٹا، اسی لیے ان کا نام ذات النطاق پڑ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن زبیرؓ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کی ماں ذات النطاق ہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ حضرت اسماءؓ کو ''ذات النطاقین'' بھی کہتے تھے اور ''ذات النطاق'' بھی۔

واقعہ کی صورت خواہ کچھ بھی ہو، اس خدمت کی بدولت حضرت اسماءؓ کو بارگاہِ رسالت سے جو لقب مرحمت ہوا، وہ آج چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود زندہ ہے اور تا ابد زندہ رہ کر ان کے عز و شرف پر مہر تصدیق ثبت کرتا رہے گا۔

ابوبکرؓ خیر کثیر چھوڑ گئے

شب ہجرت کی صبح کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔ جب ابوجہل بکتا جھکتا چلا گیا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نابینا والد ابوقحافہ (جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے) حضرت اسماءؓ

سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''بیٹی ابو بکرؓ نے تمہیں دوہری مصیبت میں ڈالا ہے۔ خود بھی چلا گیا اور سارا مال بھی ساتھ لے گیا''۔

حضرت ابو بکر صدیق ﷛ واقعی گھر میں رکھا ہوا سارا روپیہ ساتھ لے گئے تھے لیکن حضرت اسماءؓ نے ضعیف العمر اور نابینا دادا کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا اور جواب دیا:

''نہیں دادا جان، انہوں نے خیر کثیر ہمارے لیے چھوڑی ہے''۔

پھر انہوں نے ایک کپڑے میں کچھ پتھر ڈالے اور اس گڑھے یا طاق میں رکھ دیئے جہاں حضرت ابو بکر صدیق ﷛ اپنا مال رکھا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ابو قحافہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئیں اور کہا:

''دادا جان آپ ہاتھ لگا کر دیکھ لیں، یہ کیا رکھا ہے''

ابو قحافہ نے اس کپڑے کی پوٹلی پر ہاتھ رکھا تو مطمئن ہو گئے اور بولے:

''ابو بکرؓ نے اچھا کیا، تمہارے لیے کافی انتظام کر گیا''۔

سیدہ اسماءؓ مدینہ میں

ہجرت کے بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند دن قُباء میں قیام فرمایا اور پھر مدینہ منورہ کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا۔ چند ماہ بعد حضور ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابو رافع ؓ کو مکے بھیجا کہ وہ آپ ؐ کے اہلِ خانہ اور متعلقین کو مدینہ لے آئیں۔ حضرت ابو بکر صدیق ﷛ نے ان دونوں کے ساتھ عبداللہ بن اُریقِط کو اپنے صاحبزادے عبداللہؓ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی والدہ (اُمّ رومانؓ) اور بہنوں کو مدینہ لے آئیں۔ چنانچہ حضرت زیدؓ اور حضرت ابو رافع ؓ، ام المومنین حضرت سودہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراءؓ، حضرت اُمّ کلثومؓ، حضرت اُمّ ایمنؓ (زوجہ حضرت زیدؓ) اور اُسامہؓ بن زید ﷛ کو لے آئے اور حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ حضرت اُمّ رومانؓ، حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت اسماءؓ نے چند دن بعد اپنے شوہر حضرت زبیرؓ بن العوام اور خوش دامن حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب کے ساتھ ہجرت کی اور قباء میں قیام کیا لیکن جمہور اربابِ سِیَر نے پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عروہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ ہجرتِ نبویؐ سے کچھ عرصہ پہلے حضرت زبیر ﷺایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام گئے تھے۔ حضور ﷺ کے سفرِ ہجرت کے دوران میں وہ شام سے پلٹ رہے تھے۔ راستے میں کسی جگہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ (اپنے خسر) کی خدمت میں کچھ سفید کپڑے تحفۃً پیش کیے اور آپ یہی کپڑے زیب تن فرما کر مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ مکہ واپس پہنچ کر حضرت زبیرؓ نے بھی ہجرت کی تیاری کی اور اپنی والدہ حضرت صفیہؓ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے قباء میں مستقل اقامت اختیار کی اور وہیں حضرت اسماءؓ کو بھی (خاص مدینہ منورہ شہر سے) بلا لیا۔

عبداللہ بن زبیر ﷺ پیدا ہوتے ہیں

ہجرت کے بعد اتفاق سے عرصہ تک کسی مہاجر کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ اس پر یہودِ مدینہ نے مشہور کر دیا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے اور اُن کا سلسلۂ نسل منقطع کر دیا ہے۔ یہی دن تھے کہ سنہ ا ہجری میں حضرت اسماءؓ کے بطن سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے۔ گویا ہجرت کے بعد وہ مسلمانوں کے نومولودِ اوّل تھے۔ مسلمانوں کو حضرت عبداللہؓ کی ولادت پر بے حد مسرّت ہوئی اور انہوں نے فرطِ انبساط میں اس زور سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کیے کہ دشت و جبل گونج اٹھے۔ یہودی سخت شرمندہ ہوئے کیونکہ ان کے دجل و تلبیس کا پردہ چاک ہوگیا۔

حضرت اسماءؓ بچے (عبداللہؓ) کو گود میں لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپؐ نے بچے کو اپنی آغوش مبارک میں لے لیا۔ ایک کھجور اپنے دہنِ مبارک میں ڈال کر چبائی اور پھر اسے اپنے لعابِ دہن کے ساتھ ملا کر ننھے عبداللہ کے منہ میں ڈالا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے بچے کے لئے دعائے خیر و برکت مانگی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنے انہی بھانجے کے نام پر اپنی کنیت اُمّ عبداللہ رکھی تھی۔

تنگ دستی کا عالم عجیب تھا

مدینہ منورہ (قباء) میں اقامت گزیں ہونے کے بعد حضرت اسماءؓ نے پہلے چند سال

بڑی تنگی ترشی سے بسر کیے۔ اس زمانے میں ان کے شوہر حضرت زبیرؓ بہت مفلس اور تنگ دست تھے اور ان کی ساری متاع لے دے کر ایک گھوڑے اور ایک اونٹ پر مشتمل تھی۔ حضور ﷺ نے انہیں نخلستانِ بنی نضیر میں کچھ زمین بطور جاگیر عطا فرمائی تھی۔ چنانچہ شروع شروع میں وہ اس میں کاشت کر کے اپنی معاش کا سامان پیدا کرتے تھے۔ یہ زمین مدینہ منورہ سے تین فرسخ دور تھی۔ حضرت اسماءؓ روزانہ وہاں سے کھجور کی گٹھلیاں جمع کر کے لاتیں، انہیں کوٹ کر اونٹ کو کھلاتیں۔ گھوڑے کے لیے گھاس مہیا کرتیں، پانی بھرتیں، مشک پھٹ جاتی تو اس کو سیتیں۔ ان کاموں کے علاوہ گھر کا دوسرا سب کام بھی خود ہی انجام دیتی تھیں۔ روٹی اچھی طرح نہ پکا سکتی تھیں۔ پڑوس میں چند انصاری خواتین تھیں وہ از راہِ محبت و اخلاص ان کی روٹیاں پکا دیتی تھیں۔ صحیح بخاری میں خود حضرت اسماءؓ سے روایت ہے:

"زبیرؓ نے مجھ سے نکاح کیا، اُس وقت نہ تو اُن کے پاس زمین تھی نہ غلام، نہ کچھ اور سوائے ایک اونٹ اور ایک گھوڑے کے۔ میں اُن کے گھوڑے کو دانہ کھلاتی تھی، پانی بھرتی تھی، ڈول سیتی تھی۔ آٹا گوندھتی تھی، انصار کی چند عورتیں جو میری ہمسایہ تھیں روٹی پکا دیتی تھیں۔ وہ عورتیں مخلص تھیں۔ میں زبیرؓ کی زمین سے جو انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی، سر پر گٹھلیاں رکھ کر لاتی تھی۔ یہ زمین میرے گھر سے تین فرسخ کی مسافت پر تھی"۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ اور طبرانیؒ نے حضرت اسماءؓ کی تنگ دستی کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جو خود حضرت اسماءؓ کی زبانی مذکور ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:...... "ایک مرتبہ میں اس زمین میں تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسلمہؓ اور حضرت زبیرؓ کو عطا فرمائی تھی یہ بنو نضیر والی زمین کہلاتی تھی۔ ایک دن زبیرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہیں باہر گئے۔ ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ اس نے ایک بکری ذبح کی اور بھونی۔ اس کی خوشبو جب میری ناک میں پہنچی تو مجھے ایسی سخت اشتہا پیدا ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ان دنوں میری بیٹی خدیجہ پیدا ہونے والی تھی، مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں یہودی عورت کے پاس آگ لینے کے لئے گئی اس ارادہ سے کہ شاید وہ مجھ سے کھانے کی بات پوچھے ورنہ مجھے آگ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

وہاں پہنچ کر خوشبو سے میری اشتہا میں اور اضافہ ہو گیا لیکن یہودیہ نے کھانے کی بات ہی نہ کی۔ میں آگ لے کر اپنے گھر آ گئی اور کچھ دیر بعد پھر یہودیہ کے گھر گئی پھر بھی اس نے کھانے کی بات نہ کی۔ تیسری مرتبہ میں نے پھر اس کے گھر پھیرا ڈالا لیکن کسی نے بات نہ پوچھی۔ اب میں اپنے گھر میں بیٹھ کر رونے لگی اور اللہ سے دعا کی کہ الٰہی میری اشتہا کا سامان مہیا کر دے۔ اتنے میں اس یہودیہ کا شوہر اپنے گھر آیا اور آتے ہی پوچھا، کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟ یہودیہ نے کہا، ہاں پڑوس کی عرب عورت آئی تھی۔ یہودی نے کہا، جب تک اس گوشت میں سے تو اس کے پاس کچھ نہ بھیجے گی میں ہرگز اس کو نہ کھاؤں گا (کیونکہ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کھانے کو نظر نہ لگ گئی ہو) چنانچہ اس نے میرے پاس گوشت کا ایک پیالہ بھیج دیا۔ (اس زمانے میں میرے اُس جگہ اس سے زیادہ پسندیدہ اور عجیب کوئی کھانا نہ تھا)۔

یہ روایت حضرت اسماءؓ کی صاف گوئی پر دلالت کرتی ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی عسرت اور ایک بشری کمزوری کا حال صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ اُسی زمانے میں ایک دن حضرت اسماءؓ کھجور کی گٹھلیوں کا گٹھا سر پر لادے چلی آ رہی تھیں کہ راستے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ اصحاب کے ہمراہ مل گئے۔ حضور ﷺ نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور چاہا کہ اسماءؓ اس پر سوار ہو جائیں لیکن حضرت اسماءؓ شرم کی وجہ سے اونٹ پر نہ بیٹھیں اور گھر پہنچ کر حضرت زبیر ؓ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے کہا "سبحان اللہ! سر پر بوجھ لادنے سے شرم نہ آئی لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اونٹ پر بیٹھنے میں شرم و حیا مانع ہوئی"۔

ناپ تول کر خرچ کرنے والے متوجہ ہوں

کچھ عرصہ بعد حضرت ابو بکر صدیق ؓ نے حضرت زبیرؓ اور اسماء کو ایک غلام عطا کیا جس نے گھوڑے اور اونٹ کی نگہداشت سنبھال لی اور حضرت اسماءؓ کی مصیبت کم ہوئی۔ شروع شروع میں حضرت اسماءؓ افلاس کی وجہ سے ہر چیز ناپ تول کر خرچ کیا کرتی تھیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے حضرت اسماءؓ سے فرمایا:

"اسماءؓ ناپ تول کر مت خرچ کیا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی ناپ تول کر روزی دے گا"۔

جب دولت کی ریل پیل ہوئی

حضرت اسماءؓ نے حضورؐ کے ارشاد کو حرزِ جان بنالیا اور کھلے دل سے خرچ کرنے لگیں۔ خدا کی قدرت اسی وقت سے حضرت زبیرؓ کی آمدنی بڑھنے لگی اور تھوڑی ہی مدت میں ان کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہوگئی۔

آسودہ حالی کے بعد بھی حضرت اسماءؓ نے اپنی سادہ وضع ترک نہ کی۔ ہمیشہ روکھی سوکھی روٹی سے شکم پُری کرتیں اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنتیں۔ البتہ اپنی دولت کو خیر خیرات کے کاموں میں بے دریغ صرف کرتی تھیں۔ جب کبھی بیمار ہوتیں تمام غلاموں کو آزاد کر دیتیں۔ اپنے بچوں کو ہمیشہ ہدایت کیا کرتی تھیں کہ مال جمع کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ حاجت مندوں کی امداد کے لیے ہوتا ہے۔ اگر تم بخل کرو گے تو اللہ بھی تمہیں اپنے فضل و کرم سے محروم رکھے گا۔ ہاں جو صدقہ کرو گے اور راہِ خدا میں خرچ کرو گے، وہ تمہارے کام آئے گا کہ اس ذخیرہ کے ضائع ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں۔

حضرت اسماءؓ نے اپنی سادہ اور درویشانہ وضع آخر دم تک برقرار رکھی۔ علامہ ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ ان کی زندگی کے آخری دور میں ان کے صاحبزادے منذر بن زبیرؓ عراق کی فتح کے بعد لڑائی کے میدان سے واپس آئے تو ان کے مالِ غنیمت کے حصے میں کچھ قیمتی زنانہ کپڑے بھی تھے۔ انہیں لے کر اپنی والدہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت اسماءؓ نے یہ کپڑے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا "بیٹا مجھے تو موٹا کپڑا پسند ہے"۔ چنانچہ منذرؒ ان کے لیے موٹے کپڑے لائے جو انہوں نے خوشی سے قبول کر لیے اور فرمایا: "بیٹا مجھے ایسے ہی کپڑے پہنایا کرو"۔

طبعی فیاضی کا ماجرا

حضرت عبداللہؓ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ماں سے بڑھ کر کسی کو فیاض نہیں دیکھا۔ ایک اور روایت میں کہتے ہیں کہ میں نے اپنی خالہ عائشہؓ اور والدہ اسماءؓ سے زیادہ سخی اور کریم النفس کسی کو نہیں دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ ذرا ذرا جوڑ کر جمع کرتی تھیں جب کچھ رقم جمع ہو جاتی تھی تو سب کی سب راہِ خدا میں لٹا دیتی تھیں اور حضرت اسماءؓ جو کچھ پاتی تھیں اسی وقت تقسیم کر دیتی تھیں۔

حضرت اسماءؓ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ترکے میں ایک جائیداد پائی تھی۔ اس کو انہوں نے ایک لاکھ درہم پر فروخت کر دیا اور ساری رقم قاسمؒ بن محمد اور ابن ابی عتیق کو (جو ان کے قرابت دار تھے) دے دی کیونکہ وہ حاجت مند تھے۔ (یہ واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وفات کے بعد کا ہے)

باوجود کشادہ دستی اور فیاضی کے حضرت اسماءؓ اپنے شوہر کے گھر بار کی حفاظت انتہائی دیانت داری سے کرتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت زبیرؓ کی غیر حاضری میں ایک سوداگر آیا اور ان کے دروازے پر کھڑے ہو کر التجا کی کہ اپنے گھر کی دیوار کے سایہ میں مجھے سودا بیچنے کی اجازت دیجئے۔ بولیں:

''اگر میں اجازت دے دوں اور زبیرؓ انکار کر دیں تو بڑی مشکل بن جائے گی۔ تم زبیرؓ کی موجودگی میں آ کر اجازت طلب کرنا''۔

حضرت زبیرؓ گھر تشریف لائے تو سوداگر پھر آیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر درخواست کی:

''اُمِ عبداللہ! میں مسکین آدمی ہوں، آپ کی دیوار کے سائے میں کچھ سودا بیچنا چاہتا ہوں، اجازت مرحمت فرمائیں''۔

بولیں: ''میرے گھر کے سوا تمہیں مدینہ میں اور کوئی گھر نہ ملا؟''

حضرت زبیرؓ نے فرمایا: ''تمہارا کیا بگڑتا ہے جو ایک مسکین کو بیع و شراء سے روکتی ہو''۔

حضرت اسماءؓ نے اسے فوراً اجازت دے دی کیونکہ ان کا دلی منشاء بھی یہی تھا۔

حضرت اسماءؓ کا دستِ سخاوت بے حد کشادہ تھا لیکن حضرت زبیرؓ کے مزاج میں ذرا سختی تھی۔ حضرت اسماءؓ نے ایک دن سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

''یا رسول اللہ! کیا میں شوہر کے مال سے ان کی اجازت کے بغیر یتیموں مسکینوں کو کچھ دے سکتی ہوں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا ''ہاں دے سکتی ہو''۔

ایک مرتبہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ تمام صحابہ کرامؓ نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ارشادِ نبوی کی تعمیل کی۔ صحابیاتؓ نے اپنے زیور تک اتار کر دے دیئے۔ حضرت اسماءؓ کے پاس ایک لونڈی تھی، انہوں نے

اسے فروخت کر دیا اور روپیہ لے کر بیٹھ گئیں۔ جب حضرت زبیرؓ گھر تشریف لائے تو انہوں نے حضرت اسماءؓ سے وہ روپیہ مانگا۔ انہوں نے فرمایا "میں نے صدقہ کر دیا ہے"۔

حضرت زبیرؓ خاموش ہو گئے کیونکہ اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی کے وہ بھی طالب تھے۔

کافرہ ماں بھی صلہ رحمی کی مستحق ہے

حضرت اسماءؓ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھیں لیکن ان کی والدہ قتیلہ بنت عبدالعزیٰ شرف اسلام سے بہرہ یاب نہ ہوئیں اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو ہجرت سے پہلے طلاق دے دی تھی۔ (ایک روایت کے مطابق طلاق کے بعد انہوں نے کسی دوسرے شخص سے شادی کر لی تھی۔) صحیح بخاری میں ہے کہ ایک دفعہ قتیلہ مدینہ منورہ آئیں اور حضرت اسماءؓ سے کچھ روپے مانگے۔ حضرت اسماءؓ ان کی مدد کرنا چاہتی تھیں لیکن اُن کے شرک کی وجہ سے روپے دینے میں متامل ہوئیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میری والدہ مشرک ہیں اور وہ مجھ سے روپے مانگتی ہیں، کیا میں ان کی امداد کر سکتی ہوں اور ان کے سوال کو پورا کر سکتی ہوں؟"

حضورؐ نے فرمایا: "ہاں"۔ (یعنی اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو)

ایک اور روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ صلہ رحمی سے نہیں روکتا"۔

طبقات ابنِ سعد اور مسند احمد بن حنبل میں روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت اسماءؓ کی والدہ قتیلہ ان کے لیے کچھ تحائف لے کر ملنے آئیں، حضرت اسماءؓ کی غیرتِ دینی نے گوارا نہ کیا کہ اپنی مشرک ماں کے تحائف قبول کریں یا انہیں اپنے مکان میں ٹھہرائیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی معرفت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اس موقع پر میرے لیے کیا حکم ہے؟ حضورﷺ نے فرمایا کہ ان کے تحائف قبول کر لو اور ان کو اپنے گھر میں مہمان رکھو۔

حضورﷺ سے اجازت ملنے پر انہوں نے والدہ کو اپنے مکان میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی اور ان کے تحفے قبول کر لیے۔

وہ کمال درجے کی عابدہ تھیں

حضرت اسماءؓ کمال درجے کی عابدہ اور زاہدہ تھیں۔ کثرتِ عبادت کی وجہ سے ان کے

تقدس کا عام شہرہ ہو گیا تھا اور طرح طرح کے مریض ان کے پاس دعائے خیر کرانے آتے تھے۔ اگر کوئی بخار کا مریض ان کے پاس آتا تو اس کے لیے دعا کرتیں اور پھر اس کے سینے پر پانی چھڑکتیں۔ اللہ تعالیٰ اسے شفا دے دیتا۔ فرمایا کرتی تھیں:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ بخار نارِ جہنم کی گرمی ہے۔ اسے پانی سے ٹھنڈا کرو"۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک جبہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں تھا جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے یہ جُبہ مبارک حضرت اسماءؓ کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے اسے سر آنکھوں پر رکھا اور جب تک زندہ رہیں اسے اپنی جان کے ساتھ رکھا۔ اگر کبھی گھر میں کوئی علیل ہو جاتا تو اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کا پانی مریض کو پلا دیتی تھیں۔ اس کی برکت سے بیمار کو شفا ہو جاتی تھی۔ خود حضرت اسماء کو کبھی دردِ سر ہوتا تو اپنے سر کو ہاتھ میں پکڑ کر کہتیں۔ "الٰہی اگرچہ میں بہت خطا کار ہوں لیکن تیری رحمت اور فضل بے پایاں ہے"۔ اللہ تعالیٰ انہیں آرام دے دیتا۔

ایک مرتبہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسوف کی نماز پڑھا رہے تھے۔ متعدد صحابیات جن میں حضرت اسماءؓ بھی شامل تھیں، آپ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ حضور ﷺ نے نماز کو کئی گھنٹے طول دیا۔ حضرت اسماء کی طبیعت کچھ کمزور تھی، تھک کر چور چور ہو گئیں لیکن بڑے استقلال سے کھڑی رہیں۔ جب نماز ختم ہوئی تو غش کھا کر گر پڑیں۔ چہرے اور سر پر پانی چھڑکا گیا تو ہوش میں آئیں۔ صحیح بخاری میں خود حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ:

"ایک دفعہ سورج گرہن لگا تو میں عائشہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئی۔ وہاں دیکھا کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہیں اور عائشہؓ بھی نماز میں مشغول تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا، لوگوں کو کیا ہوا؟ انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کہا سبحان اللہ! میں نے پوچھا، کیا یہ خدائی نشان ہے؟ انہوں نے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ میں بھی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ (نماز اتنی طویل ہوئی کہ تھکاوٹ کے مارے) مجھے غش آ گیا اور بعد میں اپنے سر پر میں نے پانی ڈالا۔

نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا، میں نے ابھی جو کچھ دیکھا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں تک کہ دوزخ اور جنت بھی میرے مشاہدے میں آئے۔ مجھے بتایا گیا کہ تم لوگ قبروں میں آزمائش میں ڈالے جاؤ گے جیسا کہ فتنۂ دجال کے موقع پر تمہاری آزمائش ہوگی۔ فرشتے تم میں سے ہر ایک کی طرف آئیں گے اور (میری صورت دکھا کر) پوچھیں گے، کیا تم ان کو جانتے ہو؟ مومن جواب دے گا، یہ محمد رسول اللہ ہیں جو ہماری طرف واضح حق اور ہدایت کے ساتھ آئے۔ ہم ان پر ایمان لائے اور ان کی متابعت کی۔ پس فرشتے ان سے کہیں گے کہ تم اب چین کی نیند سو جاؤ کیونکہ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم مومن ہو۔ اس کے برعکس ایک منافق یا شک رکھنے والا آدمی جواب دے گا کہ مجھے معلوم نہیں لیکن میں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا اور میں نے بھی (ان کے دیکھا دیکھی) اسی طرح کہہ دیا (پس وہ فرشتوں کے عتاب کی زد میں آ جائے گا)۔''

حضرت اسماءؓ نے اپنی زندگی میں کئی حج کیے۔ صحیحین میں ہے کہ انہوں نے پہلا حج سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تھا اور اس کی ذرا ذرا تفصیل ان کو یاد تھی۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ایک دفعہ حج کے لیے گئیں اور مزدلفہ میں ٹھہریں تو رات کو نماز پڑھی۔ چاند ڈوبنے کے بعد رمی کے لئے گئیں اور پھر صبح کی نماز پڑھی۔ غلام نے جو ساتھ تھا کہا، آپ نے بڑی جلدی کی ہے۔ فرمایا، حضور ﷺ نے پردہ نشینوں کو اس کی اجازت دی ہے۔ جب حجون سے گزرتیں تو فرماتیں کہ ہم رسول اللہ کے زمانے میں یہاں ٹھہرے تھے۔ اس وقت ہمارے پاس بہت کم سامان تھا۔ ہم نے اور عائشہؓ اور زبیرؓ نے عمرہ کیا تھا۔

وہ یرموک کی مجاہدہ تھیں

حضرت اسماءؓ بہت نڈر اور شجاع تھیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ اپنے شوہر اور فرزند کے ساتھ شام کے میدانِ جہاد میں تشریف لے گئیں اور کئی دوسری خواتین کی طرح یرموک کی ہولناک لڑائی میں جنگی خدمات انجام دیں۔

حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن عاص کے دورِ امارت میں مدینہ منورہ میں بہت بدامنی پھیل گئی اور کثرت سے چوریاں ہونے لگیں۔ اس زمانے میں حضرت اسماءؓ اپنے سرہانے خنجر رکھ کر سویا کرتی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا، آپ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ تو جواب دیا، اگر کوئی چور یا ڈاکو میرے گھر آئے گا تو اس خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر دوں گی۔

خداداد قوتِ حافظہ

حضرت اسماءؓ کو اللہ تعالیٰ نے بڑا قوی حافظہ عطا کیا تھا اور وہ کبھی کبھی اپنے بچپن اور جوانی کے واقعات بڑی صحت کے ساتھ بیان کیا کرتی تھیں۔ ''واقعۂ فیل'' تاریخ کا مشہور واقعہ ہے اور اس کا ذکر قرآنِ مجید میں بھی آیا ہے۔ اس واقعہ میں یمن کے حبشی حاکم ابرہہ نے ایک جرار لشکر کے ساتھ مکہ معظمہ پر فوج کشی کی تھی اس کے لشکر میں ''محمود'' نامی ایک دیو پیکر ہاتھی اور چند دوسرے (سات، آٹھ یا بروایتے بارہ) ہاتھی بھی شامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لشکر پر ابابیلوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیئے جو ''اصحابِ فیل'' پر کنکریاں برسانے لگے اور آن کی آن میں ان کو کھائے ہوئے بھوسے (عَصفِ مأکول) کی مانند کر کے رکھ دیا۔ خدا کی قدرت، اس لشکر میں سے دو فیل بان (ایک مہاوت اور ایک چرکٹا یعنی ہاتھی کے لیے چارہ لانے والا) کسی طرح بچ گئے لیکن ان کی زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔ کیونکہ وہ اندھے اور لنجے ہو گئے تھے۔ قیاس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نشانِ عبرت بنانے کے لیے زندہ چھوڑ دیا۔ حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ میں نے ان دونوں لنجے فیل بانوں کو اِساف اور نائلہ (بتوں) کے پاس بیٹھے دیکھا ہے کہ بھیک مانگا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچازاد بھائی زید بن عمرو بن نفیل العدوی القرشی ان مستقیم الفطرت انسانوں میں تھے جو کفر و شرک کے ظلمت کدہ (جاہلی عرب) میں توحید کے علمبردار تھے۔ انہیں حضور ﷺ کی بعثت سے پانچ سال قبل کسی نے بلادِ لخم میں قتل کر ڈالا تھا۔ ایک مرتبہ ان کی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات بھی ہوئی تھی اور حضور ﷺ ان کے عقیدۂ توحید اور محاسنِ اخلاق کے مداح تھے۔ حضرت سعید بن مسیبؒ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، زیدؒ کے فرزند حضرت سعیدؓ (جو اصحابِ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمتِ

اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"یارسول اللہ! زیدؓ کے خیالات کا آپ کو علم ہے کیا ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں"

حضورﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ زیدؓ بن عمرو کی مغفرت فرمائے اور ان پر رحم کرے ان کی وفات دینِ ابراہیمؑ پر ہوئی''۔

ایک اور روایت میں زیدؓ کے بارے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ وہ قیامت کے دن تنہا ایک اُمت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔

حضرت اسماءؓ نے لڑکپن میں زید کو دیکھا تھا اور ان کے محاسنِ اخلاق کا اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا، صحیح بخاری میں حضرت اسماءؓ سے روایت ہے کہ میں نے زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا، کعبہ کی دیوار کا سہارا لیے کھڑے تھے اور کہہ رہے تھے، اے گروہِ قریش! واللہ میرے سوا تم میں سے کوئی دینِ ابراہیم پر نہیں ہے۔ وہ موؤدہ کو جلا لیتے تھے (یعنی زندہ رکھتے تھے) جب کوئی شخص اپنی لڑکی کو مارنا چاہتا تھا تو وہ کہتے تھے اسے مت قتل کرو میں اس کا بار اٹھاؤں گا۔ یہ کہہ کر لے جاتے تھے۔ جب جوان ہو جاتی تھی، اس کے باپ سے کہتے تھے کہ اگر تم چاہو تو اس کو لے جا سکتے ہو ورنہ میرے پاس رہنے دو میں اس کے اخراجات برداشت کروں گا۔

ازدواجی زندگی میں ابتلاء

طویل عرصہ کی ازدواجی زندگی کے بعد حضرت اسماءؓ کی زندگی میں ایک افسوسناک واقعہ رونما ہوا یعنی حضرت زبیرؓ بن العوام نے انہیں طلاق دے دی۔ مؤرخین نے طلاق کی مختلف وجوہ بیان کی ہیں لیکن اصل سبب اللہ ہی کو معلوم ہے۔ قیاس غالب یہ ہے کہ حضرت زبیرؓ اور حضرت اسماءؓ کے درمیان خانگی معاملات میں اختلاف کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہوگئی۔ حضرت زبیرؓ کے مزاج میں کچھ درشتی تھی۔ ایک دن کسی بات پر غصہ میں آگئے اور حضرت اسماءؓ کو زدوکوب کرنا چاہا۔ ان کے بڑے فرزند عبداللہؓ اتفاق سے گھر میں موجود تھے۔ حضرت اسماءؓ نے ان کی مدد چاہی۔ حضرت زبیرؓ نے عبداللہؓ کو دخل اندازی سے منع کیا اور کہا کہ اگر تم نے اپنی ماں کی حمایت کی تو اسے طلاق

ہے۔ حضرت عبداللہ ؓ کو گوارا نہ ہوا کہ اپنی آنکھوں کے سامنے والدہ کو تشدد کا شکار ہوتا دیکھیں۔ آگے بڑھے اور ان کا بازو حضرت زبیر ؓ کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس کے بعد حضرت زبیرؓ اور حضرت اسماءؓ کے درمیان ہمیشہ کے لئے علیحدگی ہوگئی اور حضرت اسماء مستقل طور پر فرزندِ اکبر حضرت عبداللہؓ کے ساتھ رہنے لگیں۔ وہ اپنی والدہ کے بے حد خدمت گزار تھے اور زندگی کے آخری سانس تک ان کے کفیل رہے۔

حضرت اسماءؓ بڑی فراخ حوصلہ اور نیک دل خاتون تھیں۔ حضرت زبیرؓ سے علیحدگی کے بعد بھی وہ انہیں ہمیشہ عزت واحترام سے یاد کرتی تھیں اور ان کی خوبیوں کی مدح وتوصیف کیا کرتی تھیں۔

۳۶ھ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے درمیان ''جنگ جمل'' کا افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ حضرت زبیرؓ اس جنگ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پُرجوش حامیوں میں تھے لیکن جب لڑائی شروع ہونے سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد یاد دلایا تو وہ میدانِ جنگ سے کنارہ کش ہو کر پلٹ پڑے۔ واپسی کے سفر میں وادیٔ سباع میں پہنچے اور نماز پڑھتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوئے تو ایک شخص عمرو بن جرموز نے انہیں شہید کر دیا۔ حضرت اسماءؓ کو ان کی شہادت کی خبر سن کر سخت صدمہ پہنچا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے اس موقع پر یہ اشعار کہے:

''ابن جرموز نے لڑائی کے دن ایک بلند ہمت شہسوار سے دغا کی جب کہ وہ نہتا اور بے سروسامان تھا۔

اے عمرو! اگر تو اپنے ارادے سے زبیر ؓ کو مطلع کر دیتا تو تُو ان کو ایک نڈر اور بے خوف شخص پاتا۔

خدا تجھے غارت کرے تو نے ایک مسلمان کو (ناحق) قتل کیا۔ خدا کا عذاب تجھ پر ضرور نازل ہوگا۔

یہ اشعار درّ المنثور میں حضرت اسماءؓ سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن علامہ ابنِ اثیرؒ نے لکھا ہے کہ یہ اشعار حضرت زبیر ؓ کی ایک دوسری بیوی حضرت عاتکہؓ بنتِ زید بن عمرو بن نفیل نے

کہے تھے جو شعر و شاعری میں کافی درک رکھتی تھیں۔ اس کے برعکس حضرت اسماءؓ کے شعر و شاعری میں درک رکھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بہرصورت اس بات پر اہلِ سیَر کا اتفاق ہے کہ حضرت زبیرؓ کی شہادت پر حضرت اسماءؓ نے سخت غم واندوہ کا اظہار کیا۔

فرزند دلبند کے امتحان میں سرخرو

حضرت اسماءؓ کے فرزند حضرت عبداللہ بن زبیرؓ تاریخ اسلام میں بڑی اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ امام حسینؓ کی المناک شہادت کے بعد انہوں نے بنی امیہ کی قاہر طاقت کا جس استقامت اور شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن زبیر کو امام حسینؓ کے رفقاء جیسے چند ساتھی مل جاتے تو وہ بنی امیہ کی سلطنت کا تختہ الٹ کر رکھ دیتے اور خلافتِ راشدہ کا نقشہ قائم کر دیتے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کی شہادت تاریخ کا ایک دردناک باب ہے۔ اس موقع پر حضرت اسماءؓ نے جس حق پرستی، بے خوفی، صبر و رضا اور جرأتِ ایمانی کا ثبوت دیا وہ ان کی کتابِ زندگی کا ایک تابناک ورق ہے۔ ۳۰ھ یا ۳۱ھ سے حضرت اسماءؓ شوہر کے علیحدگی کے بعد مستقل طور پر حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ کے پاس رہتی تھیں۔ حضرت عبداللہؓ ان کی بے حد تعظیم اور خدمت کرتے تھے اور اپنی شہادت ۷۳ھ تک انہوں نے مسلسل اپنی ضعیف العمر ماں کی اطاعت اور رضا جوئی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا حضرت اسماءؓ بھی اپنے سعادت مند فرزند کے لیے ہر وقت دعا گو رہتی تھیں۔ یہ انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر ؓ علم و فضل، زہد و اتقا، حق گوئی، شجاعت اور بے خوفی کا ایک مثالی پیکر بنے۔ امام حسین ؓ کی طرح انہوں نے بھی مرتے دم تک یزید کی بیعت نہ کی اور پھر اس کی موت کے بعد بھی اس کے جانشینوں کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ ۶۶ ہجری میں عراق اور حجاز وغیرہ کے لوگوں نے انہیں متفقہ طور پر اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ ۷۳ ہجری تک انہوں نے مکہ معظمہ میں اپنا علمِ خلافت بلند رکھا۔ ان چھ سالوں میں انہیں بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑا۔ ایک طرف مختار بن ابی عبید ثقفی کی زبردست جماعت تھی اور دوسری طرف بنو اُمیہ کی قاہر قوت۔ وہ بڑے عزم اور حوصلہ کے ساتھ ان دونوں محاذوں پر لڑتے رہے۔ جب عبدالملک بن مروان مسندِ حکومت پر بیٹھا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ختم کر کے رہے گا۔ اس مقصد کے لئے اس نے اپنے ایک آزمودہ کار جرنیل حجاج بن یوسف ثقفی کو مقرر کیا۔

حجاج بن یوسف نے ایک زبردست فوج کے ساتھ یکم ذی الحجہ ۷۲ ہجری کو مکہ معظمہ کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بے مثال استقامت دکھائی اور چھ ماہ تک اموی فوج کو مکہ معظمہ پر قابض نہ ہونے دیا۔ حجاج نے محاصرے میں اتنی سختی برتی کہ مکہ میں اناج کا ایک دانہ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے بیت اللہ کی عزت و حرمت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور جبل بوقبیس پر منجنیق نصب کر کے اس سے کعبۃ اللہ پر لگاتار پتھر برسائے۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پتھروں کی بارش میں بھی اس انہماک سے نماز پڑھتے تھے کہ کبوتر ان کے کندھوں اور سر پر آ آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ محاصرے کی شدت اور خوراک کی قلت سے تنگ آ کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اکثر ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج بن یوسف سے جا ملے۔ حتیٰ کہ ان کے فرزندوں نے بھی بے وفائی کی اور حجاج کے پاس جا کر امان کے طالب ہوئے۔ لیکن اس بہتر سال کے بوڑھے شیر نے بنو اُمیہ کے اقتدار کو تسلیم نہ کرنے کا حلف اٹھا رکھا تھا۔ اثنائے محاصرہ میں ایک دن حضرت اسماءؓ کی مزاج پرسی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ کچھ علیل تھیں۔ گفتگو کے دوران میں حضرت عبداللہؓ کے منہ سے نکل گیا۔ ”اماں جان، موت میں بڑی راحت ہے“ بولیں ”شاید تم کو میرے مرنے کی آرزو ہے (کہ ضعیف العمری کے دکھوں سے نجات پا جاؤں) لیکن بیٹے میں تمہارا انجام دیکھ کر مرنا چاہتی ہوں تا کہ اگر تمہیں شہادت نصیب ہو تو اپنے ہاتھوں سے تمہارا کفن دفن کروں اور اگر تم فتح پاؤ تو میرا دل ٹھنڈا ہو“۔ اس واقعہ کے دس دن بعد جب گنتی کے صرف چند ساتھی رہ گئے تو وہ آخری بار حضرت اسماءؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

”اماں جان! میرے ساتھیوں نے بے وفائی کی ہے اب سوائے چند جاں نثاروں کے کوئی بھی میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر ہتھیار ڈال دوں تو ہوسکتا ہے کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو امان مل جائے“۔

حضرت اسماءؓ نے جواب دیا:

”اے میرے فرزند! اگر تم حق پر ہو تو مردوں کی طرح لڑ کر رتبۂ شہادت پر فائز ہو

جاؤ اور کسی قسم کی ذلت برداشت نہ کرو۔ اور اگر یہ تمہارا کھکھیڑ دنیا طلبی کے لیے تھا تو تم سے بُرا کوئی شخص نہیں جس نے اپنی عاقبت بھی خراب کی اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالا''۔

ایک اور روایت میں حضرت اسماءؓ سے یہ الفاظ منسوب ہیں:

''بیٹا! قتل کے خوف سے ہرگز کوئی ایسی شرط قبول نہ کرنا جس میں تم کو ذلت برداشت کرنی پڑے۔ خدا کی قسم عزت کے ساتھ تلوار کھا کر مر جانا اس سے بہتر ہے کہ ذلت کے ساتھ کوڑے کی مار برداشت کی جائے''۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے جواب دیا:

''اماں جان میں حق وصداقت کے لیے لڑا اور حق وصداقت کے لیے ساتھیوں کو لڑایا۔ اب آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں''۔

حضرت اسماءؓ نے فرمایا:

''بیٹا! اگر تم حق پر ہو تو حالات کی ناموافقت اور ساتھیوں کی بے وفائی کے سبب دشمنوں سے دب جانا شریفوں اور دینداروں کا شیوہ نہیں''۔

ابنِ زبیرؓ نے عرض کیا:

''اماں جان! میں موت سے نہیں ڈرتا، صرف یہ خیال ہے کہ میری موت کے بعد دشمن میری لاش کا مُثلہ کریں گے اور صلیب پر لٹکائیں گے جس سے آپ کو رنج ہوگا''۔

صدیق اکبرؓ کی جلیل القدر بیٹی نے فرمایا:

''بیٹے جب بکری ذبح کر ڈالی جائے تو پھر اس کی کھال کھینچی جائے یا اس کے جسم کے ٹکڑے کیے جائیں، اسے کیا پروا؟ تم اللہ پر بھروسا کر کے اپنا کام کیے جاؤ، راہِ حق میں تلواروں سے قیمہ ہونا گمراہوں کی غلامی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ موت کے خوف سے غلامی کی ذلت کبھی قبول نہ کرنا''۔

اپنی عظیم ماں کے حوصلہ افزاء کلمات سن کر ابن زبیرؓ پر رقت طاری ہوگئی اور فرطِ محبت و عقیدت سے انہوں نے اپنی والدہ کا سر چوم لیا۔ پھر عرض کیا:

''اماں جان! میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ راہِ حق میں مردانہ وار لڑ کر جان دے دوں لیکن آپ سے مشورہ کرنا ضروری سمجھا تا کہ میرے مرنے کے بعد آپ رنج وغم نہ کریں۔ الحمد للہ کہ میں نے آپ کو اپنے سے بڑھ کر ثابت قدم اور راضی برضا پایا۔ آپ کی باتوں نے میرا ایمان تازہ کر دیا ہے۔ آج میں ضرور قتل ہو جاؤں گا مجھے یقین ہے کہ میرے قتل کے بعد بھی آپ صبر و شکر سے کام لیں گی۔ خدا کی قسم میں سچ عرض کرتا ہوں کہ آج تک میں نے جو کچھ کیا وہ سب حق کو سربلند کرنے کے لیے تھا۔ میں نے کبھی برائی کو پسند نہیں کیا۔ کسی مسلمان پر ظلم نہیں کیا۔ کبھی بدعہدی نہیں کی۔ کبھی امانت میں خیانت نہیں کی۔ اپنے عُمّال کا کڑا محاسبہ کیا اور اپنی حدودِ خلافت میں جہاں تک بن پڑا، عدل جاری کیا۔ لوگوں سے خدا اور رسولؐ کے احکام کی تعمیل کرائی اور اعمالِ بد سے انہیں روکا۔ بخدا میں دین کے آگے دنیا کو ہیچ سمجھتا ہوں۔ اللہ کی رضا کے سوا مجھے کوئی شے مطلوب نہیں''۔

پھر آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور کہا:

''الٰہی! میں نے یہ باتیں فخر کی راہ سے نہیں کہیں بلکہ صرف اپنی والدہ محترمہ کی تسکین اور اطمینان کے لیے کہی ہیں''۔

حضرت اسماءؓ نے انہیں دعا دی اور فرمایا:

''بیٹے تم اللہ کی راہ میں جان دو، میں انشاء اللہ صابر و شاکر رہوں گی، اب آگے آؤ تا کہ آخری بار تمہیں پیار کرلوں'':

حضرت عبداللہ آگے بڑھے، ضعیف العمر ماں نے اپنے لختِ جگر کو گلے لگایا اور ان کا منہ سر چوما۔ اس وقت حضرت عبداللہ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ حضرت اسماءؓ کا ہاتھ ان کی زرہ پر پڑا تو پوچھا: ''بیٹے یہ تمہارے جسم پر کیا ہے؟'' عرض کیا ''زرہ ہے تا کہ دشمن کے حربوں سے بچاؤ ہو''۔

حضرت اسماءؓ نے فرمایا:

''بیٹے اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لیے نکلتے ہو اور ان عارضی چیزوں کا سہارا لیتے ہو''۔

حضرت عبداللہؓ نے اسی وقت زرہ اتار پھینکی، سر پر سفید رومال باندھ لیا اور ماں سے کہا: ''اماں جان اب میرے جسم پر معمولی لباس ہے''۔ حضرت اسماءؓ نے فرمایا: ''بیٹا اب میں خوش ہوں، جاؤ اللہ کے راستے میں لڑو اور اس کے ہاں اسی لباس میں جاؤ''۔

حضرت عبداللہؓ نے تلوار سونت لی اور رجز پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس گئے، کافی دیر تک دادِ شجاعت دیتے رہے آخر زخموں سے چُور چُور ہو کر صدیق اکبرؓ کا یہ اولوالعزم نواسہ اور حضرت اسماءؓ کا لختِ جگر اپنے مولائے حقیقی سے جاملا۔

حجاج بن یوسف کے دانت کھٹے کر دیئے

ابنِ زبیرؓ کی شہادت کی خبر سن کر حجاج بن یوسف کو بڑی مسرت ہوئی اور اس نے حکم دیا کہ ابن زبیرؓ کی لاش کو مقامِ حجون میں سولی پر لٹکا دیا جائے۔ حضرت اسماءؓ کو حجاج کی اس حرکت کا علم ہوا تو انہوں نے پیغام بھیجا کہ خدا تجھے غارت کرے، تو نے میرے لختِ جگر کی لاش کو دار پر کیوں لٹکایا؟

حجاج نے جواب میں کہلا بھیجا: ''میں لوگوں کو ابنِ زبیرؓ کے انجام سے عبرت دلانا چاہتا ہوں''۔

حضرت اسماءؓ نے اسے پھر پیغام بھیجا کہ میرے بچے کی لاش میرے حوالے کر دو تا کہ میں اس کی تجہیز و تکفین کر سکوں۔

سنگ دل حجاج نے صاف انکار کر دیا۔

ابن زبیرؓ کی شہادت کے ایک دو دن بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مقامِ حجون سے گزر ہوا، ان کی لاش سولی پر لٹکتے دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور اس کے نیچے کھڑے ہو کر فرمایا:

''اے ابو خبیب السلام علیک! میں نے تم کو اس (سیاست) میں پڑنے سے منع کیا تھا۔ تم نمازیں پڑھاتے تھے۔ روزے رکھتے تھے اور صلہ رحمی کرتے تھے''۔

شہادت کے تیسرے دن حضرت اسماءؓ ایک کنیز کے سہارے مقامِ حجون تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے اس وقت حجاج بھی وہاں گشت کر رہا تھا۔ حضرت اسماءؓ کو لوگوں نے حجاج کی

موجودگی کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا:

''کیا اس سوار کے اترنے کا وقت ابھی نہیں آیا؟''

حجاج نے کہا: ''وہ ملحد تھا اس کی یہی سزا تھی''۔

حضرت اسماءؓ تڑپ اٹھیں، فرمایا:

''خدا کی قسم وہ ملحد نہ تھا، بلکہ نماز گزار، روزہ دار اور متقی تھا''۔

حجاج نے جھلا کر کہا: ''بڑھیا یہاں سے چلی جاؤ، تمہاری عقل سٹھیا گئی ہے''۔

حضرت اسماءؓ نے بڑی بے باکی سے جواب دیا:

''میری عقل نہیں سٹھیا گئی۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ بنو ثقیف میں ایک کذاب اور ایک ظالم (سفاک) پیدا ہوگا، سو کذاب (یعنی مختار بن ابو عبید ثقفی) کو تو ہم نے دیکھ لیا اور ظالم (سفاک) تو ہے''۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حجاج نے سنا کہ ابن عمرؓ نے ابن زبیرؓ کی لاش کے نیچے کھڑے ہو کر ان کی تعریف کی ہے تو اس نے لاش کو اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دیا اور حضرت اسماءؓ کو بلا بھیجا۔ انہوں نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ حجاج نے کہلا بھیجا کہ میرے حکم کی تعمیل کرو ورنہ چوٹی پکڑ کر گھسٹواؤں گا۔

حضرت اسماءؓ نے جواب میں کہلا بھیجا: ''خدا کی قسم، اس وقت تک نہ آؤں گی جب تک تو چوٹی پکڑ کر نہ گھسٹوائے گا''۔

حجاج اب مجبور ہو کر خود حضرت اسماءؓ کے پاس پہنچا اور دلآزارانہ لہجے میں کہنے لگا: ''اے ذات النطاقین، سچ کہنا خدا کے دشمن کا انجام کیسا ہوا؟''

حضرت اسماءؓ نے فرمایا:

''ہاں تو نے میرے فرزند کی دنیا خراب کی لیکن اس نے تیری آخرت برباد کر دی ہے۔ میں نے سنا ہے تو میرے بیٹے کو طنزاً ابنِ ذات النطاقین کہتا تھا تو خدا کی قسم میں ذات النطاقین ہوں، میں نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا توشہ دان اپنے نطاق سے باندھا تھا لیکن میں نے خود حضور ﷺ

سے سنا ہے کہ بنی ثقیف میں ایک کذاب اور ایک سفاک ہوگا۔ کذاب کو ہم نے دیکھ لیا۔ سفاک کا دیکھنا باقی تھا، سو وہ تو ہے''۔

حجاج حضرت اسماءؓ کی بے باکانہ گفتگو سن کر سکتے میں آ گیا اور کان دبا کر وہاں سے چل دیا۔

شبلی نعمانیؒ کا منظوم خراجِ تحسین

شبلی نعمانیؒ نے حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ کا واقعۂ شہادت اور حضرت اسماءؓ کی جرأتِ ایمانی اور صبر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

مسند آرائے خلافت جو ہوئے ابنِ زبیرؓ	سب نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائے یکبار
ابنِ مروان نے حجاج کو بھیجا پئے جنگ	جس کی تقدیر میں تھا مرغانِ حرم کا شکار
حرمِ کعبہ میں محصور ہوئے ابنِ زبیرؓ	فوج بے دین نے کیا کعبۂ ملت کا حصار
دامنِ عرش ہوا جاتا تھا آلودۂ گرد	بارش سنگ سے اٹھتا تھا جو ہر سو اُڑ کے غبار
تھا جو سامانِ رَسد چار طرف سے مسدود	ہر گلی کوچہ بنا جاتا تھا ایک گنجِ مزار
جب یہ دیکھا کہ کوئی ناصر و یاور نہ رہا	ماں کی خدمت میں گئے ابنِ زبیرؓ آخر کار
جا کے عرض کی کہ اے اختِ حریم نبوی	نظر آتے نہیں اب حرمتِ دیں کے آثار
آپ فرمایئے اب آپ کا ارشاد ہے کیا	کہ میں ہوں آپ کا اک بندۂ فرماں بردار
صلح کر لوں؟ کہ چلا جاؤں حرم سے باہر	یا یہیں رہ کے اسی خاک پہ ہو جاؤں نثار
بولیں وہ پردہ نشینِ حرم سرِّ عفاف	حق پہ گر تو ہے تو پھر صلح ہے مستوجبِ عار
یہ زمیں ہے وہی قرباں گہِ اسمٰعیلی	فدیۂ نفس ہے خود دینِ خلیلی کا شعار
ماں سے رخصت ہوئے یہ کہہ کے باآدابِ ونیاز	آپ کے دودھ سے شرمندہ نہ ہوں گا زنہار
پہلے ہی حملہ میں دشمن کی الٹ دیں فوجیں	جس طرف جاتے تھے یہ ٹوٹتی جاتی تھی قطار
منجنیقوں سے برستے تھے جو پتھر پیہم	ایک پتھر نے کیا آ کے سر و رخ کو فگار
خون ٹپکا جو قدم پہ تو کہا از رہِ فخر	یہ ادا وہ ہے کہ ہم ہاشمیوں کا ہے شعار

اس گھرانے نے کبھی پشت پہ کھایا نہیں زخم — خون ٹپکے گا قدم پہ ہر بار
زخم کھا کھا کے لڑے جاتے تھے لیکن کب تک — آخر الامر گرے خاک پہ مجروح و نزار
لاش منگوا کے جو حجاج نے دیکھی تو کہا — اس کو سولی پہ چڑھاؤ کہ یہ تھا قابلِ دار
لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن — ان کی ماں نے نہ کیا رنج و الم کا اظہار
اتفاق سے اک دن جو ادھر جا نکلیں — دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں یک بار

ہو چکی دیر کہ منبر پہ کھڑا ہے خطیب
اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار

لاش کا حصول اور تجہیز و تکفین

حضرت اسماءؓ جب حجاج بن یوسف کی طرف سے مایوس ہو گئیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ان کے لختِ جگر کی لاش ان کے حوالے نہیں کرے گا تو انہوں نے کسی ذریعہ سے عبدالملک کو دمشق پیغام بھجوایا۔ ایک روایت میں ہے کہ ابنِ زبیرؓ کے بھائی عروہ بن زبیرؓ محاصرۂ مکہ کے دوران میں آخر وقت تک ان کے ساتھ تھے۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ شہید ہو گئے اور حجاج نے ان کی لاش سولی پر لٹکوا دی تو وہ مکہ سے پوشیدہ طور پر عبدالملک کے پاس دمشق پہنچے۔ وہ عروہؒ سے بڑی محبت اور تکریم سے پیش آیا اور تخت پر اپنے پاس جگہ دی۔ عروہؒ نے اسے مکہ کے سارے حالات بتائے اور اس سے درخواست کی کہ حجاج کو ابنِ زبیرؓ کی لاش حضرت اسماءؓ کے حوالے کرنے کا حکم بھیجے۔ عبدالملک نے اسی وقت حجاج کو ایک غضب آلود خط لکھا جس میں اس کی حرکت پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور حضرت ابنِ زبیرؓ کی لاش فوراً حضرت اسماءؓ کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ عبدالملک کا خط پہنچنے پر حجاج نے ابنِ زبیرؓ کی لاش حضرت اسماءؓ کے حوالے کر دی۔

ابنِ ابی ملیکہؒ ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ میں سب سے پہلا شخص تھا جس نے حضرت اسماءؓ کو ابن زبیرؓ کی لاش ان کے حوالے کیے جانے کی بشارت دی انہوں نے مجھے حکم دیا کہ اسے غسل دو۔ لاش کا جوڑ جوڑ الگ ہو چکا تھا۔ ہم ایک ایک حصۂ بدن کو غسل دے کر کفن میں لپیٹتے جاتے تھے۔ جب سارے اعضاء کا غسل ہو چکا تو حضرت اسماءؓ نے اپنے لختِ جگر کے لیے دعائے

مغفرت کی۔ پھر ہم نے جنازہ پڑھ کر ابن زبیر ؓ کو مقامِ حجون میں سپردِ خاک کر دیا۔ اس سے پہلے حضرت اسماء فرمایا کرتی تھیں کہ الٰہی مجھے اس وقت تک زندہ رکھنا جب تک میں اپنے فرزند کا جثہ کفنا دفنا کر مطمئن نہ ہو جاؤں۔

وفات

اس واقعہ کے سات دن (یا بعض روایتوں کے مطابق بیس دن یا سو دن) کے بعد حضرت اسماءؓ نے بھی پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ وفات کے وقت ان کی عمر سو برس کے لگ بھگ تھی لیکن سارے دانت سلامت تھے اور ہوش وحواس بالکل درست تھے۔ قد دراز اور جسم فربہ تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اخیر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی۔ اس لیے عبداللہ بن زبیر ؓ کا واقعۂ شہادت بچشمِ خود نہیں دیکھا بلکہ ٹٹول ٹٹول کر یا پوچھ پوچھ کر ہر کیفیت سے آگاہ ہوتی تھیں۔

چند دیگر معلومات

حضرت زبیر ؓ سے حضرت اسماءؓ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں عطا کی تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں: عبداللہؓ، عروہؒ، منذرؒ، مہاجرؒ، عاصمؒ، خدیجہ الکبریٰؒ، اُمّ الحسن اور عائشہؒ۔

ان میں سے حضرت عبداللہؓ اور عروہؒ نے تاریخ میں لازوال شہرت حاصل کی۔ حضرت اسماء علم وفضل کے اعتبار سے بھی بڑا اونچا درجہ رکھتی تھیں۔ ان سے چھپن احادیث مروی ہیں۔ راویوں میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، عروہؒ بن زبیرؒ، ابوبکر عباد و عامر پسرانِ عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن عروہؒ، عبداللہ بن کیسانؒ، فاطمہ بنتِ منذر بن زبیرؒ، محمدؒ بن منکدر، ابن ابی ملیکہؒ، وہب بن کیسانؒ، مطلب بن خطبؒ، ابونوفل ابن ابوعقربؒ، مسلم معریؒ، صفیہ بنتِ شیبہؒ اور عبادہ بن حمزہ بن عبداللہ بن زبیرؒ شامل ہیں۔

حضرت اسماءؓ نے اپنی طویل زندگی میں زمانے کے بے شمار نشیب وفراز دیکھے۔ وہ تاریخِ اسلام کی ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے جاہلیت کا زمانہ بھی دیکھا اور پورا دورِ رسالت اور خلفائے راشدین کا عہد باسعادت بھی دیکھا۔ اپنے عظیم المرتبت فرزند کا

دورِ عروج بھی دیکھا اور ان کی المناک شہادت کا منظر بھی دیکھا۔ ان پر بارہا مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے لیکن انہوں نے ہر موقع پر بے پناہ عزم و استقلال اور جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا۔ بلاشبہ وہ تاریخِ اسلام کی ایک مہتم بالشان شخصیت ہیں اور ان کا درخشندہ و تابندہ کردار مسلمانوں کے لیے تا ابد مشعل راہ بنا رہے گا۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

مفصل حالات معلوم کرنے کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں۔
البدایہ والنہایہ۔ اسد الغابہ۔ صفوۃ الصفوہ۔ تہذیب التہذیب۔ اعلام النساء۔
تاریخ اسلام علامہ ذہبی۔ الاستیعاب ابن عبد البر۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ۔
سیر اعلام النبلاء۔ قلائد الجمان۔

حضرت اُمِّ عمارہؓ......خاتونِ اُحد

اس نصیبہ ور خاتون کا نام "نسیبہ" اور کنیت ام عمارہ تھی، کنیت سے ہی مشہور ہوئیں اور ایسی کہ تاریخ اسلام کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو کر رہ گئیں۔

غزوۂ اُحد میں آپ کی شجاعت اور عزم وہمت نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے زبردست خراجِ تحسین وصول کیا اور "خاتون اُحد" کا لقب پایا۔ اس غزوہ میں اس بلند ہمت خاتون نے ۱۲ زخم کھائے لیکن زخمی شیرنی کی طرح میدان میں ڈٹی رہی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اُحد کے دن میں دائیں بائیں جدھر نظر ڈالتا تھا ام عمارہؓ ہی ام عمارہؓ نظر آتی تھیں"

خلیفۂ بلافصل حضرت صدیق اکبرؓ کے دور میں آپ کے فرزند حبیبؓ کو مسیلمہ کذاب نے نہایت بے دردی سے شہید کیا۔ تو آپؓ نے عہد کیا کہ مسیلمہ سے اپنے لختِ جگر کا بدلہ لیں گی۔ چنانچہ اللہ نے آپ کی اس حسرت کی تکمیل یوں کرائی کہ دورانِ جنگ مسیلمہ کے باغ "حدیقۃ الرحمان" میں گھس کر جہاں وحشیؓ بن حرب نے مسیلمہ کو نیزے سے گھائل کیا، وہاں ام عمارہؓ کی موجودگی میں ان کے دوسرے فرزند عبداللہ کی تلوار بھی اس کے ملعون وجود میں اتری اور یوں مسیلمۂ کذاب جہنم واصل ہوا۔

جناب طالب الہاشمی اپنے دلنشین انداز میں خاتونِ اُحد حضرت ام عمارہؓ کا تذکرہ فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو!

دوپٹہ کس کو ملنا چاہئے!

امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ مالِ غنیمت میں بہت سے قیمتی کپڑے مرکزِ خلافت مدینہ منورہ میں موصول ہوئے۔ ان میں ایک زرکار دوپٹا بے حد قیمتی تھا۔ مالِ غنیمت تقسیم ہونے لگا تو سیدنا عمر فاروق ؓ نے حاضرینِ مجلس سے پوچھا کہ اس دوپٹے کا سب سے بڑھ کر حصہ دار کون ہے؟ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ آپ یہ دوپٹا اپنے فرزند (حضرت) عبداللہ کی بیوی کو دے دیں۔

حضرت عمر ؓ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر فرمایا:

''نہیں نہیں! میں یہ دوپٹا اُمّ عمارہؓ کو دوں گا وہ اس کی سب سے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ غزوۂ اُحد کے بعد میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ اُحد کے دن میں اُمّ عمارہ کو برابر اپنے دائیں اور بائیں لڑتے دیکھتا تھا''۔

یہ کہہ کر آپؓ نے وہ دوپٹا حضرت اُمِ عمارہؓ کے پاس بھیج دیا جو مدینہ منورہ کے ایک مکان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یادوں کو اپنے دل میں بسائے اپنی زندگی کا آخری زمانہ گزار رہی تھیں۔ ان کی کتابِ حیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور راہِ حق میں اپنی جان، اولاد اور مال قربان کر دینے کے جذبہ کے ابواب اتنے روشن تھے کہ فاروقِ اعظم ؓ سمیت تمام صحابہ کرامؓ ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور انہیں خاتونِ اُحد کہہ کر یاد کیا کرتے تھے۔

نام، کنیت اور حسب ونسب

حضرت اُمّ عمارہؓ کا نام ''نَسِیبَہ'' تھا لیکن تاریخ میں انہوں نے اپنی کنیت ہی سے شہرت پائی۔ وہ انصار کے قبیلہ خزرج کے خاندانِ نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

نَسِیبَہ بنت کعب بن عمرو بن عوف بن مبذول بن عمرو بن غنم بن مازن بن نجار۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پردادی سلمٰی (حضرت عبدالمطلب کی والدہ اور ہاشم بن عبدمناف کی اہلیہ) بھی خاندانِ نجار ہی سے تھیں۔ یہ خاندان یوں تو شروع ہی سے مدینہ منورہ میں معزز سمجھا جاتا تھا لیکن بعد میں حضرت عبدالمطلب کا ننھیال ہونے کی بنا پر اور یوں سرورِ عالم ﷺ

سے بالواسطہ قرابت داری اس کو مدینہ کا ممتاز ترین خاندان سمجھا جانے لگا۔ رسولِ اکرم ﷺ بنونجار کو بہت عزیز جانتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے فرمایا:

''اگر میں انصار کے کسی گھرانے میں شامل ہوتا تو بنونجار میں شامل ہوتا''۔

نصف صدی بعد حضور ﷺ کی یادیں

رحمتِ عالم ﷺ جب چھ برس کے تھے تو آپ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ اپنی لونڈی ام ایمنؓ اور ننھے حضور ﷺ کے ہمراہ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئیں اور وہاں کم وبیش ایک ماہ تک خاندانِ بنونجار کے ہاں مقیم رہیں۔ واپسی کے سفر میں جب اَبواء کے مقام پر پہنچیں تو بیمار ہو گئیں اور وہیں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ننھے حضورؐ ام ایمنؓ کے ہمراہ مکہ پہنچے۔ مدینہ منورہ میں اس زمانہ قیام کی باتیں حضور ﷺ کو ساری عمر یاد رہیں۔ سالہا سال بعد آپؐ ایک دفعہ بنونجار کے محلے سے گزرے تو ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، ''یہی وہ مکان ہے جہاں میں اپنی والدہ کے ہمراہ ٹھہرا تھا''۔ پھر آپؐ نے ایک تالاب اور ایک میدان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ''یہی وہ تالاب ہے جس میں مَیں نے تیرنا سیکھا تھا اور یہی وہ میدان ہے جہاں میں ایک لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ ہجرت کے بعد حضور ﷺ قبا سے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کی میزبانی کا شرف حضرت ابوایوب انصاریؓ کو حاصل ہوا جو بنونجار ہی کے رئیس تھے۔

بنونجار کی سعادتیں

حضور ﷺ کے نزولِ اجلال کے وقت یوں تو انصار کا بچہ بچہ جوشِ مسرت سے بے خود ہو گیا تھا، لیکن بنونجار کے جوش وخروش اور ابتہاج ومسرت کی تو کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ ان کی معصوم بچیاں دف بجا بجا کر یہ گیت گا رہی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِنْ بَنِی النَّجَّارِ

یَا حَبَّذَا مُحَمَّدٌ مِنْ جَارِ

''ہم بنونجار کی لڑکیاں ہیں.......... محمد کیا ہی اچھے ہمسایہ ہیں''

حضور ﷺ ان بچیوں کے پاس سے گزرے تو مسکرا کر ان سے فرمایا:

''بچیو! کیا تم مجھ سے الفت رکھتی ہو؟''۔

سب نے مل کر جواب دیا: ''ہاں یا رسول اللہ!''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم بھی مجھ کو بہت عزیز ہو''۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق اہلِ مدینہ نے دینی امور کی حفاظت کے لیے اپنے بارہ نقیب منتخب کیے تھے ان میں حضرت اسعدؓ بن زرارہ بنونجار کے نقیب تھے۔ ہجرت کے تھوڑے ہی عرصہ بعد حضرت اسعدؓ نے وفات پائی تو بنونجار کے لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''یا رسول اللہ! اسعدؓ کی جگہ اب کسی اور کو بنونجار کا نقیب مقرر فرمائیں''۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ میرے ماموں ہو اس لیے اب بنونجار کا نقیب میں خود ہوں''۔

اُمّ عمارہؓ کا حقیقی سرمایۂ افتخار، رسولؐ سے والہانہ محبت

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر بنونجار کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا، فی الحقیقت یہ ایک عظیم سعادت تھی جو بنونجار کو حاصل ہوئی اور وہ حقیقی معنوں میں انصار کا بہترین خاندان بن گیا۔ حضرت اُمّ عمارہؓ اسی عظیم خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے خاندان سے تعلق رکھنا ہی بجائے خود ایک بہت بڑا شرف تھا۔ لیکن سچ پوچھئے تو حضرت اُمّ عمارہؓ کا حقیقی سرمایۂ افتخار کچھ اور تھا...... وہ تھا دینِ حق کی خاطر ہر وقت سر بکف رہنے کا جذبہ اور ہادیٔ اکرم ﷺ سے والہانہ محبت اور عقیدت جس نے ان کو اپنی جان مال اور اولاد ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اسی عقیدت اور جذبۂ اخلاص نے ان کو اتنا بلند مرتبہ عطا کیا کہ بڑے بڑے صحابہ کرامؓ ان پر فخر کیا کرتے تھے۔

حضرت اُمّ عمارہؓ کا نکاح اور اولاد

حضرت اُمّ عمارہؓ کا پہلا نکاح زید بن عاصمؓ سے ہوا جو اُن کے چچازاد بھائی تھے۔ زیدؓ سے ان کی دو اولادیں ہوئیں۔ عبداللہؓ اور حبیبؓ۔ ان دونوں بھائیوں نے شرف صحابیت حاصل کیا اور تاریخ میں بڑی شہرت پائی۔

زیدؓ کی وفات کے بعد حضرت اُمّ عمارہؓ عربہؓ بن عمرو کے عقدِ نکاح میں آئیں، ان سے دو بچے تمیم اور خولہ پیدا ہوئے۔

امّ عمارہؓ نے حضور ﷺ کی بیعت کی

حضرت اُمّ عمارہؓ کا شمار انصار کے سابقین اولین میں ہوتا ہے۔ وہ اس زمانے میں اپنے سارے خاندان سمیت مشرف بہ اسلام ہوئیں جب بیعت عقبہ اولیٰ کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر یثرب میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد ۱۳ سنہ نبوت میں انہیں اُن پچھتر نفوسِ قدسی میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا جنہوں نے عقبہ کبیرہ میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی اور یہ عہد کیا کہ حضور ﷺ یثرب تشریف لائیں تو وہ اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ آپؐ کی تائید ونصرت کریں گے۔ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ ان کے شوہر عربہؓ بن عمرو بھی بیعت عقبہ کبیرہ میں شریک تھے۔ لیکن سیرت کی اکثر کتابوں میں بیعت عقبہ کبیرہ کے شرکاء میں ان کا نام نہیں ملتا، البتہ حضرت اُمّ عمارہؓ کے اس بیعت میں شریک ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔

ام عمارہؓ خاتونِ اُحد کیونکر بنیں؟

ہجرتِ نبویؐ کے تیسرے سال مسلمانوں کو اُحد کا معرکہ پیش آیا۔ حضرت اُمّ عمارہؓ بھی اس میں شریک ہوئیں اور ایسی شجاعت، جانبازی اور عزم وثبات کا مظاہرہ کیا کہ تاریخ میں ''خاتونِ اُحد'' کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ طبقات ابنِ سعد کی روایت کے مطابق ان کے شوہر عربہؓ بن عمرو اور دونوں بڑے فرزند عبداللہؓ اور حبیبؓ بھی غزوۂ اُحد میں ان کے ساتھ شریک تھے۔

جب تک مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، اُمّ عمارہؓ دوسری خواتین کے ساتھ مشکیزوں میں پانی بھر بھر کر مجاہدین کو پلاتی تھیں اور زخمیوں کی خبر گیری کرتی تھیں، ۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مجاہدین انتشار کا شکار ہو گئے، تو اس وقت رسولِ اکرم ﷺ کے پاس گنتی کے چند سرفروش باقی رہ گئے۔ حضرت اُمّ عمارہؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو انہوں نے مشکیزہ پھینک کر تلوار اور ڈھال سنبھالی اور حضور ﷺ کے قریب پہنچ کر کفار کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔ کفار بار بار یورش کر کے حضور ﷺ کی طرف بڑھتے اور اُمّ عمارہؓ انہیں دوسرے ثابت قدم مجاہدین کے ساتھ مل کر تیر اور

تلوار سے روکتیں۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ بڑے بڑے بہادروں کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ لیکن یہ شیر دل خاتون کوہِ استقامت بن کر میدانِ جنگ میں ڈٹی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایک مشرک نے ان کے سر پر پہنچ کر اپنی تلوار کا وار کیا۔ اُمّ عمارہؓ نے اسے اپنی ڈھال پر روکا اور پھر اس کے گھوڑے کے پاؤں پر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ گھوڑا اور سوار دونوں زمین پر آ رہے۔ سرورِ عالم ﷺ یہ ماجرا دیکھ رہے تھے آپؐ نے اُمّ عمارہؓ کے بیٹے عبداللہؓ کو پکار کر فرمایا، ''عبداللہ اپنی ماں کی مدد کرو''۔ وہ فوراً ادھر لپکے اور تلوار کے ایک ہی وار سے اس مشرک کو جہنم واصل کر دیا۔ عین اس وقت ایک دوسرا مشرک تیزی سے ادھر آیا اور حضرت عبداللہؓ کا بایاں بازو زخمی کرتا ہوا نکل گیا۔ حضرت اُمّ عمارہؓ نے اپنے ہاتھ سے عبداللہؓ کا زخم باندھا اور پھر فرمایا: ''بیٹے جاؤ اور جب تک دم میں دم ہے لڑو''۔ حضورؐ نے ان کا جذبۂ جاں نثاری دیکھ کر فرمایا: "من یطیق ما تطیقین یا اُمّ عماره" (اے امّ عمارہؓ! جتنی طاقت تجھ میں ہے اور کسی میں کہاں ہوگی؟) اسی اثنا میں وہی مشرک جس نے عبداللہ کو زخمی کیا تھا پلٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ حضور ﷺ نے اُمّ عمارہؓ سے فرمایا: ''اُمّ عمارہؓ، سنبھلنا۔ یہ وہی بدبخت ہے جس نے عبداللہ کو زخمی کیا تھا''۔ حضرت اُمّ عمارہؓ جوشِ غضب میں اس کی طرف جھپٹیں اور تلوار کا ایسا وار کیا کہ وہ دو ٹکڑے ہو کر نیچے گر پڑا۔ سرورِ عالم ﷺ یہ دیکھ کر متبسم ہو گئے اور فرمایا: ''اُمّ عمارہؓ تو نے اپنے بیٹے کا خوب بدلہ لیا''۔

اثنائے جنگ میں ایک بدبخت نے دور سے حضور ﷺ پر پتھر پھینکا جس سے آپؐ کے دو دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ شمعِ رسالتؐ کے پروانے مضطرب ہو کر ادھر متوجہ ہوئے تو ابن قمیئہ نامی ایک کافر درّاتا ہوا حضور ﷺ کے قریب پہنچ گیا اور تلوار کا ایک بھرپور وار کیا۔ حضور ﷺ خود پہنے ہوئے تھے۔ ابنِ قمیئہ کی تلوار خود پر پڑی۔ اس کی دو کڑیاں رُخسار مبارک میں کھُب گئیں اور خون کی دھاریں پھوٹ نکلیں۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ اُمّ عمارہؓ بے تاب ہو گئیں اور آگے بڑھ کر ابنِ قمیئہ کو روکا۔ یہ شخص قریش کا نامی شہسوار تھا لیکن شیر دل اُمّ عمارہؓ مطلق ہراساں نہ ہوئیں اور اس پر نہایت جرأت کے ساتھ حملہ کیا۔ وہ دوہری زرہ پہنے ہوا تھا اس لیے اُمّ عمارہؓ کی تلوار اُچٹ گئی اور ابن قمیئہ کو جوابی وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس سے ان کے کندھے پر شدید زخم آیا لیکن ابن قمیئہ کو بھی وہاں ٹھہرنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ تیزی سے گھوڑا دوڑا کر بھاگ گیا۔ حضرت اُمّ عمارہؓ کے

زخم سے خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے ان کے زخم پر خود پٹی بندھوائی اور کئی بہادر صحابہؓ کا نام لے کر فرمایا:

''واللہ آج اُمّ عمارہؓ نے ان سب سے بڑھ کر بہادری دکھائی''۔

اُمّ عمارہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میرے لیے دعا فرمایئے کہ جنت میں بھی آپ کی معیت نصیب ہو''۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے خشوع سے ان کے لیے دعا مانگی اور بآواز بلند فرمایا:

" اللّٰھم اجعلھم رفقائی فی الجنة "

حضرت اُم عمارہؓ کو بڑی مسرت ہوئی اور ان کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ جاری ہو گئے:

"ما اُبالی ما اصابنی فی الدنیا ...... "

''اب مجھے دنیا میں کسی مصیبت کی پرواہ نہیں''۔

لڑائی ختم ہوئی تو حضورؐ اس وقت تک گھر تشریف نہ لے گئے جب تک آپؐ نے حضرت عبداللہؓ بن کعب مازنی کو بھیج کر حضرت اُمّ عمارہؓ کی خیریت دریافت نہ کر لی۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''اُحد کے دن میں دائیں بائیں جدھر نظر ڈالتا تھا اُمّ عمارہؓ ہی اُم عمارہؓ نظر آتی تھیں''۔

ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ اُحد میں حضرت اُمّ عمارہؓ کے جسم پر بارہ زخم لگے تھے۔

علامہ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد انہوں نے بیعتِ رضوان، جنگِ خیبر، عمرۃ القضاء اور غزوۂ حنین میں بھی شرکت کی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہیں فتح مکہ کے موقع پر بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا۔

فرزندِ امّ عمارہؓ کی مسیلمہ کذاب کے ہاتھوں شہادت

۱۱ھ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سریر آرائے خلافت ہوئے تو دفعۃً سارے عرب میں فتنۂ ارتداد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مرتدین کی سرکوبی کے لیے جو معرکے پیش آئے ان میں سب سے شدید معرکہ مسیلمہ کذاب کا تھا۔ یہ شخص یمامہ علاقہ نجد کے قبیلہ بنو حنیفہ کا رئیس تھا۔ اس نے سرورِ عالم کی حیاتِ پاک کے آخری دنوں میں

مرتد ہو کر نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور حضور ﷺ کو یہ خط بھیجا تھا۔

''مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کے نام۔ میں تمہاری رسالت میں شریک کیا گیا ہوں، نصف ملک میرا نصف قریش کا۔ لیکن قریش ایک زیادتی پسند قوم ہے۔''

حضور ﷺ نے اس خط کا جو جواب بھیجا، اس کا مضمون یہ تھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ کا خط مسیلمہ کذاب کے نام!

جو شخص ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو۔ اس کے بعد تجھ کو معلوم ہو کہ ملک اللہ کا ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دے اور آخرت کی بہتری پرہیزگاروں کے لیے ہے''۔

اس مکتوب مبارک کے بھیجنے کے کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ نے رحلت فرمائی۔ اب مسیلمہ کذاب کھل کھیلا۔ اس نے اپنی شعبدہ بازیوں اور ستم رانیوں کے بل پر لوگوں کو زبردستی اپنا معتقد بنانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی مدت میں چالیس ہزار سے زیادہ جنگجو اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ جو شخص اس کی نبوت سے انکار کرتا اس پر سخت ظلم کرتا۔

اسی زمانے میں ایک دن حضرت اُمّ عمارہؓ کے فرزند حبیبؓ بن زید عمان سے مدینہ آ رہے تھے کہ راستے میں اس ظالم کے ہاتھ پڑ گئے۔ اس نے ان سے پوچھا:

''محمدؐ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

حضرت حبیبؓ نے بلا تامل جواب دیا: ''وہ خدا کے سچے رسول ہیں''۔

مسیلمہ بولا: ''نہیں یہ کہو مسیلمہ اللہ کا سچا رسول ہے''۔

حضرت حبیبؓ نے اس کی بات نہایت حقارت سے ٹھکرا دی۔ مسیلمہ نے غضبناک ہو کر اپنی تلوار کے وار سے ان کا ایک ہاتھ شہید کر ڈالا اور ان سے کہا:

''اب میری بات مانو گے یا نہیں؟''

حضرت حبیبؓ نے جواب دیا۔ ''ہرگز نہیں''۔

مسیلمہ نے اب ان کا دوسرا ہاتھ بھی شہید کر ڈالا اور بولا: ''اب بھی میری رسالت تسلیم کر

لوتو تمہاری جان بچ سکتی ہے"۔ اس عاشقِ رسولؐ نے اُمِّ عمارہؓ جیسی ماں کا دودھ پیا تھا، بولے:

"ہرگز نہیں ہرگز نہیں، اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ"

اس پر مسیلمہ غضبناک ہو گیا اور اس نے ان کا ایک ایک بند کاٹنا شروع کیا، حبیب ضربوں اور زخموں کی شدت سے تڑپتے تھے تو مسیلمہ کذاب انہیں اس حال میں دیکھ کر قہقہے لگاتا تھا۔ حضرت حبیبؓ نے اس حال میں بھی تسلیم و رضا سے قدم نہ ہٹایا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت اُمِّ عمارہؓ نے اپنے فرزند کی مظلومانہ شہادت کی خبر سنی تو ان کی ثابت قدمی پر خدا کا شکر بجالائیں لیکن عہد کرلیا کہ مسیلمہ سے اس ظلم کا بدلہ لے کر رہیں گی۔

ام عمارہؓ شہید فرزند کا بدلہ لیتی ہیں

اس واقعہ کے کچھ عرصہ کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ کی سرکوبی پر مامور کیا تو حضرت اُمِّ عمارہؓ بھی حضرت خالدؓ کے لشکر میں شامل ہو گئیں۔ مسیلمہ نے بھی مقابلہ کی زبردست تیاری کی۔ اس نے بنوحنیفہ اور اپنے دوسرے حامیوں کی قبائلی عصبیت کو خوب بھڑکایا اور چالیس ہزار جنگجوؤں کو حضرت خالدؓ کے مقابلے پر لا کھڑا کیا۔ دونوں فوجوں کے درمیان گھمسان کا رَن پڑا۔ مسلمانوں اور مرتدین کی تعداد میں ایک اور چار کی نسبت تھی۔ لیکن مجاہدینِ اسلام دینِ حق کی خاطر اس پامردی سے لڑے کہ مسیلمہ کی فوج کا منہ پھیر دیا۔

اب مسیلمہ کے بیٹے شرحبیل نے اپنے قبیلے کو خطاب کر کے کہا:

"اے بنوحنیفہ، اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کا مقابلہ کرو۔ آج قومی غیرت و حمیت کا دن ہے۔ اگر تم نے شکست کھائی تو تمہارے اہل و عیال پر مسلمان قبضہ کر لیں گے۔ اس لیے اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لئے کٹ مرو"۔

شرحبیل کی اس تقریر نے بجلی کا کام کیا اور بنوحنیفہ اس شدت سے لڑے کہ مسلمانوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ مسلمانوں کو اب تک ایسی سخت لڑائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اب حضرت خالدؓ

نے مسلمانوں کے تمام قبائل کو الگ الگ کر دیا اور اعلان کیا کہ ہر قبیلہ اپنے اپنے علم کے نیچے لڑے تا کہ پتہ چل جائے آج کون راہِ حق میں ثابت قدمی دکھاتا ہے۔ اس تدبیر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ہر قبیلے نے شجاعت اور استقامت میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی اور ایسی جانبازی سے لڑے کہ مسیلمہ کی فوج اپنے متواتر و مسلسل خوفناک حملوں کے باوجود انہیں پیچھے نہ دھکیل سکی۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے تجربہ کار افسر شہید ہو گئے۔ جن میں حضرت زیدؓ بن خطاب، حضرت ابوحذیفہؓ، حضرت سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہؓ اور حضرت ثابتؓ بن قیس جیسے اکابر صحابہ بھی تھے۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ اب مسیلمہ کی فوج پیچھے ہٹی اور اس کے باغ (حدیقۃ الرحمٰن) میں گھس کر اندر سے پھاٹک بند کر لیا۔ حضرت براءؓ بن مالک دیوار پھاند کر باغ کے اندر کود گئے اور لڑتے بھڑتے باغ کے دروازے پر پہنچ کر پھاٹک اندر سے کھول دیا۔ اب مرتدین اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن لڑائی شروع ہو گئی۔ حضرت اُمّ عمارہؓ بھی شروع سے لے کر اب تک بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ کئی بار مسیلمہ تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن ہر بار بنوحنیفہ کی آہنی دیوار راستے میں حائل ہو گئی۔ ادھر حضرت خالدؓ بھی مسیلمہ کو جہنم واصل کرنے کی فکر میں تھے لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس وقت بارہ سو کے قریب مسلمان جامِ شہادت نوش کر چکے تھے لیکن مرتدین اس سے کہیں زیادہ تعداد میں مارے جا چکے تھے۔ لڑائی کا رُخ پلٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مسیلمہ نے لڑائی کا رنگ دیکھا تو اپنے مریدوں سے کہا کہ اپنا ننگ و ناموس بچانا ہے تو بچا لو۔ اسی وقت اُمّ عمارہؓ نے اسے تاک لیا اور زخم پر زخم کھاتی اور اپنی برچھی سے رستہ بناتی اس کی طرف بڑھیں۔ اس کوشش میں انہیں گیارہ زخم آئے اور ایک ہاتھ بھی کلائی سے کٹ گیا۔ مسیلمہ کے قریب پہنچ کر اپنی برچھی سے اس پر حملہ کیا چاہتی تھیں کہ اتنے میں دو ہتھیار اس پر ایک ساتھ پڑے اور وہ کٹ کر گھوڑے سے نیچے جا پڑا۔ اُمّ عمارہؓ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اپنے پہلو میں اپنے فرزند عبداللہ کو کھڑے پایا اور قریب ہی وحشیؓ کھڑے تھے۔ وحشیؓ نے اپنا حربہ مسیلمہ پر پھینکا تھا اور عبداللہؓ نے اسی وقت اس پر تلوار کا وار کیا تھا۔ اُمّ عمارہؓ اپنے فرزند حبیبؓ کے قاتل اور مسلمانوں کے اس بدترین دشمن کی موت پر سجدۂ شکر بجا لائیں...... امیر لشکر حضرت خالدؓ بن ولید، حضرت اُمّ عمارہؓ کی فضیلت اور مرتبے سے آگاہ تھے، انہوں نے بڑی تندہی سے ان کا علاج کرایا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے زخم مندمل

ہو گئے لیکن ایک ہاتھ ہمیشہ کے لیے راہِ خدا میں داغِ جدائی دے گیا۔ جب کبھی اس واقعہ کا ذکر ہوتا تو حضرت اُمّ عمارہؓ حضرت خالدؓ بن ولید کی بہت تعریف کرتیں اور فرماتیں: ''خالد ؓ نے بڑی غمخواری سے میرا علاج کرایا وہ بڑے ہمدرد اور نیک سرشت ہیں''۔

تاریخِ وفات اور چند دیگر معلومات

حضرت اُمّ عمارہؓ کے سالِ رحلت کے بارے میں تمام تاریخیں خاموش ہیں البتہ بعض رواتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ کے عہدِ خلافت میں موجود تھیں اور انہی کے دورِ خلافت میں انہوں نے وفات پائی۔

حضرت اُمّ عمارہؓ کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے غایت درجہ کی عقیدت اور محبت تھی اور وہ ہر وقت حضور ﷺ پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتی تھیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور کبھی کبھار ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ مسند احمدؒ اور ''اصابہ'' میں روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور ﷺ حضرت اُمّ عمارہؓ کے ہاں تشریف لے گئے ، انہوں نے حضور ﷺ کے سامنے کھانا پیش کیا۔ آپ ؐ نے فرمایا: ''تم بھی کھاؤ''۔ عرض کیا: ''یارسول اللہ میں روزے سے ہوں''۔ ارشاد ہوا: ''روزہ دار کے سامنے کچھ کھایا جائے تو فرشتے اس پر درود بھیجتے ہیں''۔ پھر آپ ؐ نے حضرت اُمّ عمارہؓ کے سامنے کھانا کھایا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیق ؓ بھی کبھی کبھی حضرت اُمّ عمارہؓ کے گھر ان کی خبر گیری کے لیے جایا کرتے تھے۔

حضرت اُمّ عمارہؓ نے چند احادیث بھی روایت کی ہیں جو اُمّ سعدؓ، حارث بن عبداللہؓ، عبادؓ بن تمیم بن زید، لیلیٰؒ (کنیز) اور عکرمہؒ سے مروی ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

❀❀❀❀❀

حضرت عمر فاروق ؓ کے عہدِ خلافت میں یرموک کی ہولناک لڑائی پیش آئی تو شوقِ جہاد نے حضرت اسماءؓ کو گھر نہ بیٹھنے دیا۔ وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ اس لڑائی میں شریک ہوئیں اور بڑی ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ ایک موقع پر عیسائی مسلمانوں کو دباتے دباتے عورتوں کے خیموں تک آ پہنچے، حضرت اسماءؓ اور دوسری دخترانِ اسلام خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر دشمنوں پر پل پڑیں اور ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ اہلِ سیَر نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں حضرت اسماءؓ نے تنہا اپنی لکڑی سے نو رومیوں کو جہنم واصل کیا۔

حضرت اسماءؓ بنت یزید انصاریہ

تاریخی تعارف

مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں جلوہ فرما ہوئے تو اہلِ مدینہ (اوس اور خزرج) میں سے جو لوگ عقبہ کی بیعت سے محروم رہ گئے تھے جوق در جوق آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر زیارت اور بیعت کی سعادت حاصل کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ایک دن سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کچھ جاں نثاروں کے درمیان رونق افروز تھے کہ خواتین کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان میں سے ایک خاتون نے آگے بڑھ کر یوں عرض کیا:

انی رسول من وراء نی من جماعة نساء المسلمین کلّھن یقلن بقولی وعلی مثل رایی. ان اللّٰہ تعالٰی بعثک الی الرجال والنساء فامنّا بک واتبعناک ونحن معاشر النساء مقصورات مخدرات قواعد بیوت ومواضع شھوات الرجال وحاملات اولادھم وان الرجال فُضّلوا بالجمعات وشھود الجنائز والجھاد واذا خرجوا للجھاد حفظنا لھم اموالھم وربّینا اولادھم افنشارکھم فی الاجر یا رسول اللّٰہ؟ فالتفت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجھہ الی اصحابہٖ فقال ھل سمعتم

مقالة امرأةٍ احسن سؤالًا عن دينها من هذا فقالوا بلٰى والله يا رسول اللّٰه فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم انصرفى يا اسماء واعلمى من وراكِ من النساء ان حسن تبعّل احداكنّ لزوجها وطلبها المرضاته يعدل كل ما ذكرت للرّجال فانصرفت اسماء وهى تهلّل وتكبر استبشارًا بما قال لها رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم.

(استیعاب وترغیب منذری بروایت بزار وطبرانی)

''یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں تمام مسلمانوں کی عورتوں سے ایک پیغام لے کر آئی ہوں۔ سب کا قول اور رائے وہی ہے جو میری ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مردوں اور عورتوں کے لئے رسول کر کے بھیجا ہے۔ سو ہم آپ پر ایمان لائی ہیں اور آپ کی اتباع کرتی ہیں اور ہم عورتوں کی قوم چار دیواری میں پردہ نشین رہتی ہیں۔ مرد ہم سے اپنی جائز خواہش پوری کرتے ہیں۔ ان کی اولاد کو ہم پیٹوں میں اٹھاتی ہیں اور مرد لوگ جمعہ، جماعت، جنازہ، جہاد کو جاتے ہیں تو پیچھے ہم ان کے مالوں کی حفاظت کرتی ہیں، ان کی اولاد کو پالتی ہیں۔ کیا ہم ان حالات کے ماتحت ان کے ساتھ اجر میں شریک ہوں گی؟

اس پر حضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ کی طرف توجہ فرمائی اور پوچھا کیا تم لوگوں نے اس عورت کا کلام جس میں دین کے بارے میں ایسا بہتر سوال کیا گیا ہے سنا ہے؟ سب نے کہا، ہاں! اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے اسماء! تم واپس جاؤ اور تمام عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے خاوند کی اچھی طرح خدمت کرنا اور اس کو راضی رکھنا مردوں کے ان تمام کمالات کے برابر ہے۔ پس وہ عورت تہلیل وتکبیر کہتی ہوئی خوشی بخوشی واپس چلی گئی۔''

یہ خاتون جن کی فصیح البیانی اور حسنِ تقریر کا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتراف و استحسان فرمایا، حضرت اسماءؓ بنت یزید انصاریہ تھیں۔

سلسلۂ نسب

حضرت اسماءؓ بنت یزید کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابیات میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق اوس کے خاندان بنو عبدالاشہل سے تھا جو اوس کا شریف ترین گھرانا تھا اور سارے قبیلے کی سیادتِ عمومی اس میں وراثتاً چلی آتی تھی...... سید الاوس صدیقِ انصار حضرت سعدؓ بن معاذ بھی اسی خاندان سے تھے، حضرت اسماءؓ کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

"اسماء بنت یزید بن السکن بن رافع بن امراء القیس بن زید بن عبدالاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج بن عمرو بن مالک بن اوس۔"

ان کا نسب امراء القیس پر حضرت سعدؓ بن معاذ سے اور رافع پر جلیل القدر صحابی حضرت اُسیدؓ بن حضیر الکتائب اشہلی سے مل جاتا تھا۔ حضرت سعدؓ رشتہ میں ان کے چچا ہوتے تھے اور حضرت اُسیدؓ بھتیجے۔

قبولِ اسلام

عام روایتوں میں ہے کہ حضرت اسماءؓ بنتِ یزید نے ہجرتِ نبویؐ کے بعد اسلام قبول کیا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ تمام اہلِ سیر اس بات پر متفق ہیں کہ بیعتِ عقبہ کبیرہ سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر کی تبلیغی مساعی کے نتیجہ میں سید الاوس حضرت سعدؓ بن معاذ اور بنو عبدالاشہل کے دوسرے سردار حضرت اُسیدؓ بن حضیر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے اور ان دونوں کے اثر و رسوخ کی بدولت سوائے ایک آدھ آدمی کے سارا قبیلہ عبدالاشہل ایک دن میں مسلمان ہو گیا تھا۔

قیاس غالب یہ ہے کہ حضرت اسماءؓ بنتِ یزید بھی اسی وقت سعادت اندوز اسلام ہو گئیں۔ اوپر جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ ہجرتِ نبویؐ کے چند دن بعد پیش آیا۔ حضرت اسماءؓ کی تقریر سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے ہی دولت ایمان سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں۔

خاندان کے دیگر افراد کی کیفیت

ایک روایت میں حضرت اسماءؓ کے والد یزید بن سکن کو صحابی بتایا گیا ہے لیکن عام طور پر کتب سیَر ان کے بارے میں خاموش ہیں، اس لیے ان کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یزید کے حقیقی بھائی (حضرت اسماءؓ کے چچا) حضرت زیاد بن سکن اور ان (یزید) کے بھتیجے حضرت عمارہؓ بن زیادؓ نہایت مخلص اور قدیم الاسلام صحابی تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت اسماءؓ کی بہن اُمّ بجید حواؓ بنت یزید بن سکن بھی ان کے ساتھ مشرف بہ ایمان ہو گئی تھیں۔ وہ ان چند صحابیات میں سے ہیں جو بیعت رضوان میں شریک ہوئیں۔

بیعت رسول کا واقعہ

مسندِ احمد بن حنبلؒ میں ہے کہ حضرت اسماءؓ کے ساتھ ان کی خالہ بھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں سونے کے کنگن اور انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ حضور ﷺ کی نظر ان پر پڑی تو پوچھا: "ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟" بولیں "نہیں"۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "کیا تم کو پسند ہے کہ آخرت کے دن خدا ان کے بدلے تمہیں آگ کے کنگن پہنائے"۔

حضرت اسماءؓ نے اپنی خالہ سے کہا: "خالہ ان کو اتار دو"۔

انہوں نے سارے زیور اتار کر پھینک دیئے۔

پھر حضرت اسماءؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! اگر ہم زیور نہ پہنیں تو شوہر کی نظروں سے گر جائیں گی"۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "تو پھر چاندی کے زیورات بنواؤ اور ان پر زعفران مل دو کہ سونے کی چمک پیدا ہو جائے"۔

اس کے بعد حضرت اسماءؓ نے دوسری خواتین کے ہمراہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرنی چاہی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ اپنا دست مبارک بڑھایئے۔

حضور ﷺ نے فرمایا، میں عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا البتہ تم ان باتوں کا اقرار کر لو تو بیعت ہو جائے گی۔

۱۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔
۲۔ چوری نہ کرو گی۔
۳۔ کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ گی۔
۴۔ زنا سے بچو گی۔
۵۔ کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ گی۔
۶۔ اچھی باتوں سے انکار نہ کرو گی۔

حضرت اسماءؓ اور ان کی ساتھی خواتین نے صدقِ دل سے ان باتوں کا اقرار کیا اور اپنے گھر تشریف لے گئیں۔

دلہنِ رسول ﷺ کو سجانے سنوارنے کا اعزاز

شوال ۱ ہجری میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی ہوئی تو حضرت اسماءؓ نے چند دوسری خواتین کے ہمراہ انہیں سنوارا اور پھر حجلے میں بٹھا کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی۔ حضورؐ تشریف لائے، کسی نے دودھ پیش کیا۔ حضور ﷺ نے تھوڑا سا نوش فرما کر باقی حضرت عائشہؓ کو دے دیا۔ انہوں نے شرم کے مارے سر جھکا لیا۔ حضرت اسماءؓ نے پیار سے ڈانٹا کہ رسول اللہ ﷺ جو دیتے ہیں لے لو۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے بھی کچھ دودھ پی لیا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ انصار کی عورتیں (جن میں حضرت اسماءؓ بھی تھیں) دلہن کو لینے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر آئیں۔ حضرت اُمّ رومانؓ نے حضرت عائشہؓ کا منہ دھلا کر بال سنوار دیئے۔ پھر ان کو اس کمرے میں لے گئیں جہاں انصار کی عورتیں دلہن کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اندر داخل ہوئیں تو انصاری خواتین نے یہ کہہ کر استقبال کیا:

علی الخیر والبرکة وعلی خیر طائر یعنی تمہارا آنا بخیر و بابرکت اور فال نیک ہو۔

خود حضرت اسماءؓ بنت یزید سے روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو میں بھی وہاں موجود تھی، حضور ﷺ نے پیالہ سے تھوڑا سا دودھ پی کر حضرت عائشہؓ کی طرف بڑھا دیا، وہ شرمانے لگیں۔ میں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز

عطا فرما رہے ہیں اسے واپس نہ کرو"۔

انہوں نے شرماتے شرماتے دودھ لے لیا اور ایک گھونٹ پی کر رکھ دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اپنی سہیلیوں کو دو۔ ہم نے عرض کی، یارسول اللہ! اس وقت ہم کو بھوک نہیں۔ آپؐ نے فرمایا، جھوٹ نہ بولو۔ آدمی کا ایک ایک جھوٹ لکھا جاتا ہے۔ (مسند احمد بن حنبلؒ)

اسماءؓ کے اقربا کا جہاد میں کردار

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت یزید اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سہیلی تھیں۔ حضرت اسماءؓ اور ان کے تمام اعزہ و اقارب اللہ اور اللہ کے رسول سے والہانہ محبت کرتے تھے اور دین حق کی خاطر وہ اپنی جان اور مال ہر شے قربان کرنے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہتے تھے...... ۲ ہجری میں غزوۂ بدر پیش آیا تو سارے بنوعبدالاشہل اس میں جانبازانہ شریک ہوئے۔ ان میں حضرت اسماءؓ کے کئی قریبی عزیز بھی تھے۔ غزوۂ اُحد میں بھی یہی کیفیت تھی۔ اس لڑائی میں حضرت اسماءؓ کے چچا حضرت زیاد بن سکن اور ابنِ عم حضرت عمارہؓ بن زیادؓ نے اس شان سے اپنی جانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کیں کہ دوسرے صحابہ کرامؓ ان پر رشک کیا کرتے تھے۔

چچازاد بھائی کی قابلِ رشک قربانی

میدانِ اُحد میں مشرکین نے شمع رسالت کو بجھانے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ یہ ناپاک مقصد پورا کرنے کے لیے وہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر بار بار نرغہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سخت نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی تو حضور ﷺ نے فرمایا: "کون ہے جوان دشمنوں کو دفع کرے اور راہِ حق میں اپنی جان فروخت کرے؟" معاً پانچ انصاری جانباز آگے بڑھے اور مردانہ وار لڑ کر اپنی جانیں رحمتِ عالم ﷺ پر قربان کر دیں۔ ان جانبازوں میں ایک حضرت زیادؓ بن سکن تھے۔ زیادؓ کے فرزند عمارہؓ بھی نہایت ثابت قدمی سے لڑ رہے تھے، ان کے جسم پر تیرہ زخم لگ چکے تھے۔ لیکن پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ آخر چودھویں زخم کے ساتھ طاقت جواب دے گئی اور گر پڑے۔ لوگوں نے سمجھا شہید ہو گئے ہیں۔ حضور ﷺ کو اطلاع دی گئی تو آپؐ نے فرمایا، عمارہؓ کی لاش کو

میرے پاس لاؤ۔

لوگ فوراً اُن کی طرف دوڑے، دیکھا کہ ابھی سانس چل رہی ہے۔ اٹھا کر حضور ﷺ کے روبرو رکھ دیا۔ بولنے کی سکت نہ تھی لیکن ان کی بے نور ہوتی ہوئی آنکھیں زبان حال سے کہہ رہی تھیں: "یارسول اللہ! یہ تو صرف ایک جان تھی اگر ہزار جانیں بھی ہوتیں تو آپ پر نثار کر دیتا۔

گر نثارِ قدمِ یارِ گرامی نہ کنم
گوہرِ جاں بچہ کارے دگرم

چنانچہ انہوں نے اپنے رخسار سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں سے لگا دیئے اور اسی حالت میں پیکِ اجل کو لبیک کہا، ان کی شہادت اس شعر کا مصداق تھی:

منم و ہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپردن
برخِ تو دیدہ باشم تو درونِ دیدہ باشی

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہی خاندان تھا جس میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا پلی بڑھیں اور سنِ کہولت کو پہنچیں۔

دجال کا ذکر سن کر رو پڑیں

حضرت اسماءؓ کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہا درجہ کی عقیدت اور محبت تھی۔ اکثر دربارِ رسالت میں حاضر ہوتی تھیں اور اکتسابِ فیض کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے سامنے حضور ﷺ نے دجال کا ذکر فرمایا۔ بڑی متاثر ہوئیں اور رونے لگیں۔ حضور ﷺ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد دوبارہ تشریف لائے تو حضرت اسماءؓ کی شدتِ گریہ سے بدستور ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: "اسماءؓ اتنا کیوں روتی ہو؟" عرض کیا یارسول اللہ ہم سے تو اتنی بھوک بھی برداشت نہیں ہوتی کہ لونڈی اطمینان سے آٹا گوندھ کر روٹی پکا لے، دجال کے عہد میں جو قحط پڑے گا ہم ایمان پر کیسے ثابت قدم رہیں گے۔

حضور ﷺ نے فرمایا: "اس وقت اللہ کے ذکر کی کثرت بھوک سے بچائے گی"۔

پھر انہیں دلاسا دیا کہ گریہ وزاری کی ضرورت نہیں ہے اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جاؤں گا۔ اگر دجال کا ظہور میرے بعد ہوا تو ہر مسلمان کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرے گا۔

کیفیتِ وحی کا ایک مشاہدہ

ایک مرتبہ حضرت اسماءؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کی مہار تھامے کھڑی تھیں کہ حضور ﷺ پر وحی نازل ہوئی۔ حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ اونٹنی اس وقت بوجھ تلے دبی جاتی تھی، میں ڈرنے لگی کہ کہیں اس کی ٹانگیں نہ ٹوٹ جائیں۔

ایک دفعہ کچھ دوسری خواتین کے ہمراہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھیں کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''شاید ایسا ہوتا ہو کہ مرد یا عورت باہمی تعلقات کی باتوں کو دوسرے آدمیوں تک پہنچاتے ہوں''

اور عورتیں تو خاموش رہیں، حضرت اسماءؓ نے عرض کیا:

''جی ہاں، یارسول اللہ! بعض مرد اور عورتیں ایسا کرتی ہیں''۔

آپؐ نے فرمایا:

''ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ اس قسم کے آدمی کی مثال شیطان کی سی ہے جو کسی شیطان عورت سے سب کے سامنے اختلاط میں مشغول ہو''۔

اسماءؓ نے لکڑی کی چوب سے 9 کافروں کو جہنم رسید کیا

حضرت عمر فاروق ؓ کے عہدِ خلافت میں یرموک کی ہولناک لڑائی پیش آئی تو شوقِ جہاد نے حضرت اسماءؓ کو گھر نہ بیٹھنے دیا۔ وہ اپنے اہل خاندان کے ہمراہ اس لڑائی میں شریک ہوئیں اور بڑی ثابت قدمی سے دادِ شجاعت دی۔ ایک موقع پر عیسائی مسلمانوں کو دباتے دباتے عورتوں کے خیموں تک آ پہنچے، حضرت اسماءؓ اور دوسری دختران اسلام خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر دشمنوں پر پل پڑیں اور ان کو پیچھے دھکیل دیا۔ اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ اس لڑائی میں حضرت اسماءؓ نے

تنہا اپنی لکڑی سے نو رومیوں کو جہنم واصل کیا۔

حضرت اسماءؓ کو مہمانوں کی خدمت کرنے میں بڑی راحت ملتی تھی۔ ایک مرتبہ مشہور تابعی شہر بن حوشبؒ ان کے گھر آئے، ان کے سامنے بڑی شفقت سے کھانا پیش کیا۔ انہوں نے کھانے سے عذر کیا۔ حضرت اسماءؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ سنا کر فرمایا: ''اب تو تمہیں کوئی عذر نہیں؟'' انہوں نے کہا: ''اماں اب ایسی غلطی نہ کروں گا''۔

وہ عقل اور دین، دونوں سے مالا مال تھیں

حضرت اسماءؓ نے جنگِ یرموک (۱۵ھ) کے کئی سال بعد وفات پائی۔ ان سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں۔ اولاد وغیرہ کی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے الاستیعاب میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

كَانَ مِنْ ذَوَاتِ الْعَقْلِ وَالدِّيْنِ — وہ عقل اور دین دونوں سے بہرہ ور تھیں

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

❁❁❁❁

''میرے بچو! تم اپنی خوشی سے اسلام لائے اور اپنی خوشی سے تم نے ہجرت کی۔ اس ذاتِ لایزال کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس طرح تم ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، اسی طرح تم ایک باپ کی اولاد ہو۔ میں نے نہ تمہارے باپ سے خیانت کی اور نہ تمہارے ماموں کو ذلیل ورسوا کیا۔ تمہارا نسب بے عیب ہے اور تمہارا حسب بے داغ۔ خوب سمجھ لو کہ جہادِ فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی کارِ ثواب نہیں۔ آخرت کی دائمی زندگی دنیا کی فانی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (آل عمران : ع ۲۰)

(اے مسلمانو! صبر سے کام لو اور ثابت قدم رہو اور آپس میں مل کر رہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ مراد کو پہنچو)

کل اللہ نے چاہا اور تم خیریت سے صبح کرو تو تجربہ کاری کے ساتھ اور خدا کی نصرت کی دعا مانگتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑنا اور جب تم دیکھو کہ لڑائی کا تنور خوب گرم ہو گیا اور اس کے شعلے بھڑکنے لگے تو تم خاص آتش دانِ جنگ میں گھس پڑنا اور راہِ حق میں دیوانہ وار تلوار چلانا۔ ہو سکے تو دشمن کے سپہ سالار پر ٹوٹ پڑنا۔ اگر کامیاب رہے تو بہتر اور اگر شہادت نصیب ہوئی تو یہ اس سے بھی بہتر کہ آخرت کی فضیلت کے مستحق ہو گے''۔

چاروں نونہالوں نے یک زبان ہو کر کہا:

''اے مادرِ محترم! انشاء اللہ ہم آپ کی توقعات پر پورا اتریں گے اور آپ ہمیں ثابت قدم پائیں گی''۔

حضرت خنساءؓ بنت عمرو

بوڑھی ماں کا ۴ نوجوان مجاہد بیٹوں سے تاریخی خطاب

سیدنا حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جنگ قادسیہ کا شمار عراقِ عرب کی سرزمین پر لڑی جانے والی نہایت خونریز اور فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے۔ اس لڑائی میں سلطنتِ ایران نے اپنے دو لاکھ آزمودہ کار جنگجو اور تین سو جنگی ہاتھی مسلمانوں کے مقابل لا کھڑے کیے۔ دوسری طرف مجاہدینِ اسلام کی کل تعداد صرف تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ ان میں سے بعض مجاہدین کے ساتھ ان کے اہل و عیال بھی جہاد میں حصہ لینے کے لیے قادسیہ آئے تھے۔ اس موقع پر ایک ضعیف العمر خاتون بھی جذبۂ جہاد سے سرشار اپنے چار نوجوان فرزندوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں موجود تھیں۔ شب کے ابتدائی حصے میں جب ہر مجاہد آنے والی صبح کے ہولناک منظر پر غور کر رہا تھا اس خاتون نے چاروں فرزندوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے یوں خطاب کیا:

''میرے بچو! تم اپنی خوشی سے اسلام لائے اور اپنی خوشی سے تم نے ہجرت کی۔ اس ذاتِ لایزال کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس طرح تم ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، اسی طرح تم ایک باپ کی اولاد ہو۔ میں نے نہ تمہارے باپ سے خیانت کی اور نہ تمہارے ماموں کو ذلیل و رسوا کیا۔ تمہارا نسب بے عیب ہے اور تمہارا حسب بے داغ۔ خوب سمجھ لو کہ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی کارِ ثواب نہیں۔ آخرت کی دائمی زندگی دنیا کی فانی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران : ع ۲۰)

(اے مسلمانو! صبر سے کام لو اور ثابت قدم رہو اور آپس میں مل کر رہو، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ مراد کو پہنچو)

کل اللہ نے چاہا اور تم خیریت سے صبح کرو تو تجربہ کاری کے ساتھ اور خدا کی نصرت کی دعا مانگتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑنا اور جب تم دیکھو کہ لڑائی کا تنور خوب گرم ہو گیا اور اس کے شعلے بھڑ کنے لگے تو تم خاص آتش دانِ جنگ میں گھس پڑنا اور راہِ حق میں دیوانہ وار تلوار چلانا۔ ہو سکے تو دشمن کے سپہ سالار پر ٹوٹ پڑنا۔ اگر کامیاب رہے تو بہتر اور اگر شہادت نصیب ہوئی تو یہ اس سے بھی بہتر کہ آخرت کی فضیلت کے مستحق ہو گے"۔

چاروں نونہالوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"اے مادرِ محترم! انشاء اللہ ہم آپ کی توقعات پر پورا اتریں گے اور آپ ہمیں ثابت قدم پائیں گی"۔

چاروں بیٹے ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہیں

صبح جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ان خاتون کے چاروں فرزند اپنے گھوڑوں کی باگیں اٹھائے، رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے ایک ساتھ میدانِ جنگ میں کود پڑے۔

بزرگ خاتون، جن کے چہرے پر عجیب قسم کا جلال تھا، اپنے فرزندوں کو میدانِ رزم میں بھیج کر بارگاہِ الٰہی میں یوں عرض پیرا ہوئیں:

"الٰہی میری متاعِ عزیز یہی کچھ تھی، اب تیرے سپرد ہے"۔

اپنی ماں کی تقریرین کر ان نوجوانوں کے دلوں میں رات ہی سے شوقِ شہادت کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اب جو لڑائی کا موقع ملا تو ایسی وارفتگی سے لڑے کہ شجاعت بھی آفرین پکار اٹھی۔

جس طرف جھک پڑتے تھے غنیم کے پرّے کے پرّے صاف ہو جاتے تھے۔ آخر دشمن کے سینکڑوں جنگجوؤں نے انہیں اپنے نرغہ میں لے لیا۔ اس حالت میں بھی یہ سرفروش مطلق ہراساں نہ ہوئے اور دشمن کے بیسیوں سپاہیوں کو خاک و خون میں لوٹا کر خود بھی رتبہ شہادت پر فائز ہو گئے۔

چار بیٹوں کے قتل پر ماں کا اظہارِ تشکر

جب ان خاتون نے اپنے بچوں کی شہادت کی خبر سنی تو نالہ و فریاد کرنے کے بجائے بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہو گئیں اور ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ جاری ہو گئے:

''اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اپنے فرزندوں کے قتل سے مشرف کیا۔ باری تعالیٰ سے اُمید ہے کہ وہ قیامت کے دن مجھے ان بچوں کے ساتھ اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے گا''۔

یہ ضعیف العمر خاتون جنہوں نے تسلیم و رضا اور صبر و تحمل کا ایسا مظاہرہ کیا کہ چشمِ فلک نے کبھی اس کی نظیر نہ دیکھی تھی، عرب کی عظیم مرثیہ گو حضرت خنساءؓ بنت عُمرو تھیں۔

سیدہ خنساءؓ کا خاندانی پس منظر

حضرت خنساءؓ (الخنساء) کا شمار عظیم المرتبت صحابیات میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق نجد کے قبیلہ بنو سُلیم سے تھا جو بنو قیس بن عیلان کی ایک شاخ تھا۔ یہ قبیلہ اپنی شرافتِ نفس، جُود و سخا اور شجاعت و ہمت کی بنا پر قبائلِ عرب میں امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلہ کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی:

''بلاشبہ ہر قوم کی ایک پناہ گاہ ہوتی ہے اور عرب کی پناہ گاہ قیس بن عیلان ہے''۔

حضرت خنساءؓ کا اصل نام تماضر تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

تماضر ''خنساءؓ'' کیسے بنیں؟

تماضر بنت عمرو (بن الحارث) بن الشرید بن رباح بن یقظہ بن عصیہ بن خفاف بن امراء القیس بن بہثہ بن سُلیم بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس بن عیلان بن مضر۔

تماضر چونکہ بہت چست، ہوشیار اور خوبرو تھیں اس لیے خنساءؓ کے لقب سے مشہور ہوئیں جس کے معنی ہرنی کے ہیں۔

عرب کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ

مؤرخین نے حضرت خنساءؓ کے سالِ ولادت کی تصریح نہیں کی۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجرتِ نبویؐ سے تقریباً پچاس برس پہلے پیدا ہوئیں۔ ان کا والد عمرو بنو سلیم کا رئیس تھا اور اپنی وجاہت اور ثروت کی بنا پر بڑے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ اس نے اپنی اولاد (خنساءؓ اور ان کے بھائیوں معاویہ و صخر) کی پرورش بڑے ناز و نعم سے کی۔ یہاں تک کہ وہ بڑے ہو کر اعلیٰ خصائل کے مالک ہوئے۔ مبدأ فیاض نے خنساءؓ کی فطرت میں ہی شعر و سخن کا ذوق ودیعت کیا تھا۔ چنانچہ وہ صغر سنی میں کبھی کبھی دو چار شعر موزوں کر لیا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ شعور کی پختگی کے ساتھ ان کی شعری صلاحیتیں بھی ترقی کرتی گئیں۔ یہاں تک کہ آگے چل کر وہ ایک شہرہ آفاق مرثیہ گو شاعرہ کے مرتبہ پر فائز ہوئیں۔ حضرت خنساءؓ کے عنفوانِ شباب کو پہنچنے سے پہلے ان کے شفیق باپ کا انتقال ہو گیا۔ خنساءؓ کے لیے یہ ایک جانکاہ صدمہ تھا لیکن ان کے دونوں بھائیوں معاویہ اور صخر نے ایسی محبت اور دلسوزی کے ساتھ ان کی سرپرستی کی کہ وہ باپ کا غم بھول گئیں۔ اب ان کی محبت اور عقیدت کا مرجع دونوں بھائی تھے وہ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر جیتی تھیں۔ اسی زمانے میں بنو ہوازن کے مشہور شہسوار، شاعر اور رئیس دُرَید بن الصمہ نے خنساء کو ان کے بھائی معاویہ کے ذریعے شادی کا پیغام دیا۔ خنساءؓ نے بعض وجوہ کی بنا پر یہ پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ دُرَید ایک معمر شخص تھا اور اس کی شکل و صورت بھی کچھ ایسی پسندیدہ نہیں تھی اس لیے خنساءؓ نے اسے دیکھ کر ناپسند کیا اور اس کے خلاف کچھ اشعار بھی کہے جن میں دُرَید اور اس کے قبیلے کا ذکر طنزیہ انداز میں کیا۔

اس کے بعد اپنے قبیلے کے ایک نوجوان عبدالعزیٰ (یا بروایت ابن قتیبہ، رواحہ بن عبدالعزیٰ) سے شادی کی۔ اس سے حضرت خنساءؓ کا ایک بیٹا ابو شجرہ عبداللہ پیدا ہوا۔ عبدالعزیٰ نے جلد ہی وفات پائی۔ اس کے بعد خنساءؓ نے بنو سُلیم ہی کے ایک دوسرے شخص مرداس بن ابی عامر

سے نکاح کر لیا۔ اس سے ان کے تین بیٹے عمرو، زید اور معاویہ (یا بقول ابن حزم ہبیرہ، جزعہ اور معاویہ) پیدا ہوئے اور ان کے بعد ایک بیٹی عمرہ پیدا ہوئی۔ مرداس ایک بہادر اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے ایک چشمے سے متصل دلدلی زمین کو قابلِ کاشت بنانے کی کوشش کی۔ وہاں کی مرطوب آب و ہوا نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بخار میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔

اس کے بعد خنساءؓ نے اپنی ساری زندگی بیوگی کی حالت میں کاٹ دی۔ ان کے بھائیوں معاویہ اور صخر نے بیوہ بہن کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور وہ دل جمعی کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہیں۔ اس زمانے میں وہ اپنا ذوقِ شعر و سخن بھی پورا کرتی رہتی تھیں۔ لیکن ان کا دائرۂ شہرت محدود ہی رہا۔ جس واقعے نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور ان کے اشعار میں غضب کی تاثیر پیدا کر دی وہ ان کے دونوں مربی بھائیوں کا یکے بعد دیگرے انتقال تھا۔ مؤرخین نے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ خنساءؓ کے بھائی معاویہ کا عکاظ کے میلے میں بنو مرہ کے ایک شخص ہاشم بن حرملہ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ہاشم سے بدلہ لینے کے لیے اپنے اٹھارہ ساتھیوں کے ہمراہ قبیلہ مُرّہ پر دھاوا بول دیا۔ لڑائی کے دوران میں وہ ہاشم کے بھائی درید کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اس کے بعد صخر نے اپنے بھائی (معاویہ) کے قتل کا انتقام لینے کی قسم کھائی۔ چنانچہ اس نے موقع پر دُرَید کو قتل کر دیا اور اس کے ایک سُلیمی ساتھی نے دُرید کے بھائی ہاشم بن حرملہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن اس پر بھی صخر کی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی اور وہ بنو مرہ پر برابر حملے کرتا رہا۔ اس کشمکش کے دوران میں بنو مرّہ کے حلیف بنو اسد کے ایک شخص فقعس نے صخر کو شدید زخمی کر دیا اور وہ کئی ماہ تک اپنے خیمے میں نیم جان پڑا رہا۔ حضرت خنساءؓ نے بڑی تندہی سے اپنے محبوب بھائی کی تیمارداری کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ صخر بڑا شجاع، عاقل اور خوب صورت جوان تھا۔ حضرت خنساءؓ کو اس کی موت پر شدید صدمہ پہنچا۔ ان کے دل و دماغ میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی جس نے نہایت دردناک اور فصیح و بلیغ مرثیوں کی شکل اختیار کر لی۔ انہوں نے صخر کے فراق میں ایسے دلسوز اور جانگداز مرثیے کہے کہ جو سنتا اشک بار ہوئے بغیر نہ رہ سکتا۔ ان مرثیوں نے انہیں سارے عرب میں مشہور کر دیا اور نہ صرف عام لوگ بلکہ ان کی ہم عصر عرب شعراء بھی ان کی قادر الکلامی اور استادی کا

لہولہان گئے تھے۔

مقتول بھائی کی یاد میں غمزدہ اشعار

انہوں نے صخر کی یاد میں جو مرثیے کہے ان کے چند اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

''اے میری آنکھو! خوب آنسو بہاؤ اور ہرگز نہ رکو کیا تم صخر جیسے سخی پر نہیں روؤ گی؟

کیا تم اس شخص پر نہ روؤ گی جو نہایت جری اور جوان رعنا تھا۔

کیا تم اس سردار پر نہیں روؤ گی جو سرو قد تھا اور جس کا پرتلہ بڑا لمبا تھا۔

جو کمسنی ہی میں اپنے قبیلہ کا سردار بن گیا۔

قوم نے اس کی طرف اپنے ہاتھ دراز کیے تو اس نے بھی اپنے ہاتھ دراز کر لیے۔

اور ان بلندیوں پر پہنچ گیا جو لوگوں کے ہاتھوں سے بھی بلند تھیں۔

اور اسی عزت وعظمت کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔

بزرگی اس کے گھر کا راستہ دکھاتی ہے۔

اگر شرافت اور عزت کا ذکر آئے تو دیکھو گے کہ

صخر نے عزت کی چادر اوڑھ لی ہے۔

صخر کی بڑے بڑے لوگ اقتدا کرتے ہیں گویا کہ وہ ایک پہاڑ ہے۔

جس کی چوٹی پر آگ روشن ہے۔

اس مرثیہ کے آخری شعر

وَاِنَّ صَخْرًا لَتَاتَمُّ الْهُدَاةُ بِهٖ
كَاَنَّهٗ عَلَمٌ فِیْ رَاْسِهٖ نَارٌ

کی تاثیر کا تو یہ عالم تھا کہ جو سنتا تھا دانتوں تلے انگلیاں داب لیتا تھا۔

دُرِ منثور میں ہے کہ حضرت خنساءؓ صخر کی قبر پر صبح وشام جا کر اس قسم کے دردناک اشعار پڑھا کرتیں اور زار وزار رویا کرتیں۔

سورج جب نکلتا ہے تو وہ مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے اور اسی طرح ہر غروب آفتاب کے

وقت بھی مجھے اس کی یاد آتی ہے۔

اگر میرے ارد گرد اپنے مرے ہوؤں پر رونے والوں کی کثرت نہ ہوتی تو میں اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتی۔

اے صخر! اگر تو نے اب میری آنکھوں کو رلایا ہے تو (کیا ہوا اس سے پہلے) ایک لمبے عرصے تک تم مجھے ہنساتے بھی تو رہے ہو۔

تم زندہ تھے تو تمہارے طفیل میں آفات وحوادث کو دفع کر لیتی تھی افسوس کہ اب کون اس بڑی مصیبت کو دور کرے گا۔

بعض مقتولوں پر رونا اچھا نہیں لگتا لیکن تجھ پر رونا بے حد قابلِ ستائش ہے۔

جب وہ شہرت کے بامِ عروج پر تھیں

زمانۂ جاہلیت میں اہل عرب ربیع الاول سے ذیقعدہ تک مختلف مقامات پر بڑی دھوم دھام سے میلے لگایا کرتے تھے۔ بازارِ عکاظ کا میلہ ان میں سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس میلے میں عرب قبائل کے تمام رؤسا اور ہر قسم کے ارباب ہنر و کمال شامل ہوتے۔ قبائل کے نئے سردار چنے جاتے اور باہمی تنازعات کے فیصلے کیے جاتے۔ غرض یہ میلہ نہایت اہم اور مرکزی حیثیت کا حامل تھا۔ عرب کے کونے کونے سے ہر چھوٹا بڑا شاعر اس میں شریک ہوتا اور لوگوں کو اپنا کلام سناتا۔ حضرت خنساءؓ بھی بازارِ عکاظ کے اس اجتماع میں ہر سال شریک ہوتیں۔ جب ان کی آمد آمد ہوتی تو لوگ اس طرف ٹوٹ پڑتے اور ان کے اونٹ کے گرد گھیرا ڈال کر مرثیے سنانے کے لئے اصرار کرتے۔ جب وہ اپنے کسی مرثیہ کے چند اشعار پڑھتیں تو سامعین فرطِ رنج والم سے دھاڑیں مار مار کر روتے اور یہ سامعین کون ہوتے تھے؟ نہایت سنگدل اور خوفناک بدوی جنگجو، جن کے لیے قتل و غارت محض ایک کھیل تھا۔ خنساءؓ کے اشعار سن کر ان کے دل پگھل جاتے اور سیلِ اشک ان کی آنکھوں سے رواں ہو جاتا۔ یہ سیلِ اشک ان میں جذبۂ انسانیت پیدا کرنے کا باعث بنتا۔

خنساءؓ کا فن نابغہ کی نظر میں

خنساءؓ کو اپنی زبان کے صرف ونحو پر کمال درجہ کا عبور تھا وہ اگرچہ تمام اصنافِ سخن میں ید

خوبی اور مہارت تامہ رکھتی تھیں لیکن مرثیہ گوئی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ بازار عکاظ میں ان کے خیمہ کے دروازے پر ایک جھنڈا نصب ہوتا تھا جس پر یہ الفاظ لکھے ہوتے تھے:

الخنساء .... ارثی العرب (یعنی عرب کی سب سے بڑی مرثیہ گو خنساء)

بازار عکاظ میں عرب کا عظیم ترین شاعر نابغہ ذبیانی بھی آیا کرتا تھا۔ اس کے لیے سرخ رنگ کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا جو سارے میلے میں منفرد ہوتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے دور کے شاعروں میں مُسَلّم الثبوت استاد مانا جاتا تھا اور بڑے بڑے نامی شعراء اسے اپنے اشعار سنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ جب خنساءؓ پہلی مرتبہ بازار عکاظ میں آئیں اور اپنے اشعار نابغہ کو سنائے تو وہ بے اختیار پکار اٹھا:

"واقعی تو عورتوں میں بڑی شاعرہ ہے اگر میں اس سے پہلے ابوبصیر (اَعشیٰ) کے اشعار نہ سن لیتا تو تجھ کو اس زمانے کے تمام شعراء پر فضیلت دیتا اور کہہ دیتا کہ تو جن وانس میں سب سے افضل ترین شاعرہ ہے"۔

خنساءؓ کو دیگر شعراءِ عرب کا خراجِ تحسین

رفتہ رفتہ خنساءؓ کی شاعرانہ عظمت کا چرچا تمام عرب میں پھیل گیا اور نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ بعد کے فحول شعرائے عرب نے بھی ان کی عظمت کا اعتراف کیا۔ حضرت خنساءؓ کے شعر کہنے کا اسلوب سادہ لیکن نہایت دلکش اور اثر انگیز ہے۔ فی الحقیقت فخریہ شعر کہنے اور مرثیہ میں تو مشکل ہی سے کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ علامہ ابن اثیرؒ کہتے ہیں کہ:

"تمام علمائے شعر وسخن اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی بھی عورت شعر گوئی میں خنساءؓ کے برابر نہیں ہوئی نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد"۔ (اسد الغابہ)

لیلائے اخیلیہ کو اپنے دور کی سب سے بڑی عرب شاعرہ مانا گیا ہے لیکن ابن قتیبہ کے نزدیک اس کو خنساءؓ پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ وہ اپنی کتاب طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں:

"لیلائے اخیلیہ عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے جس پر کسی کو تفوق حاصل نہیں سوائے خنساءؓ کے"۔

بنو اُمیہ کے دور کے مشہور شاعر جریر (متوفی ۱۱۰ھ) سے ایک مرتبہ لوگوں نے پوچھا، سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اگر خنساء نہ ہوتی تو میں ہی سب سے بڑا شاعر تھا۔

بشار بن برد نہ صرف خود ایک بہت بڑا شاعر تھا بلکہ کمال درجے کا سخن فہم بھی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب میں عورتوں کے اشعار دیکھتا ہوں تو ان میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور پاتا ہوں۔ ایک دفعہ لوگوں نے اس سے پوچھا، کیا خنساءؓ کے اشعار بھی خامی سے پاک نہیں؟ اس نے جواب دیا:

"وہ تو مردوں سے بھی بڑھ گئی ہے"۔

حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ عہدِ بنی اُمیہ کا مشہور شاعر اخطل جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت نابغہ ذبیانی کا ہم رتبہ شمار ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ عبدالملک بن مروان کے دربار میں گیا اور ایک مدحیہ قصیدہ پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ عبدالملک ایک صاحب علم اور سخن فہم شخص تھا اس نے جواب دیا: "اگر تم مجھے شیر اور سانپ سے تشبیہ دینا چاہتے ہو تو میں تمہارے شعر نہیں سنوں گا ہاں اگر تم خنساءؓ کے کلام جیسے اشعار پیش کرنا چاہتے ہو تو کرو"۔

خنساءؓ اسلام کے دامن میں

حضرت خنساءؓ کا آغازِ پیری تھا کہ فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ رسالت طلوع ہوا اور عرب کا گوشہ گوشہ اس کے نور سے جگمگانے لگا۔ لیکن وائے بدبختی کہ اہلِ مکہ میں سے اکثر نے اس نورِ ہدایت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور حق کے چراغ کو پھونکوں سے بجھانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ چراغ جسے خود اللہ تعالیٰ نے روشن کیا تھا ان سے کیا بجھنا تھا البتہ اپنے کرتوتوں کے باعث وہ عارضی طور پر اس کی برکات و انوار سے محروم ہو گئے۔ دوسری طرف تین سو میل دور اہلِ یثرب کی قسمت میں یہ سعادتِ عظمیٰ لکھی ہوئی تھی کہ انہوں نے اس متاعِ بے بہا کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کر دیئے اور اپنی جانوں اور مالوں کو مکہ کے دُرِّ یتیمؐ کے قدموں میں لا ڈالا۔ چنانچہ جب یثرب حضور ﷺ کے نزولِ اجلال کے بعد مدینۃ النبیؐ بن گیا تو اسلام کو ایک مرکز میسر آ گیا اور پیغامِ حق آہستہ آہستہ عرب کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلنے لگا۔ حضرت خنساءؓ کے کانوں میں بھی اس پیغام کی بھنک پڑی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فطرتِ سعید سے نوازا تھا۔ یہ پیغام سنتے ہی دل و دماغ کی

دنیا بدل گئی۔ اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کو ساتھ لیا، منزلوں پر منزلیں مارتی مدینہ منورہ پہنچیں اور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اسلام کی دولتِ لازوال سے مالا مال ہو گئیں۔

علامہ ابنِ اثیرؒ اور حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے کہ اس موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک ان کا فصیح و بلیغ کلام سنتے رہے۔ وہ سناتی جاتی تھیں اور حضور ﷺ فرماتے جاتے تھے: "شاباش اے خنساءؓ"۔

قبولِ اسلام کے بعد وہ اپنے قبیلہ میں واپس تشریف لے گئیں اور لوگوں کو پیغام رسالت پہنچا کر اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی۔ زبان میں بڑی تاثیر تھی چنانچہ بے شمار لوگوں نے ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً مدینہ منورہ آئیں اور رحمتِ عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضانِ نبویؐ سے مقدور بھر بہرہ یاب ہوتیں۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب

اسلام لانے کے بعد بھی حضرت خنساءؓ کے دل سے اپنے محبوب بھائیوں بالخصوص صخر کی یاد محو نہ ہو سکی۔ وہ ایامِ جاہلیت کے دستور کے مطابق صخر کے سوگ میں ہمیشہ اپنے سر پر بالوں کا ایک گچھا (یا سربند) باندھے رہتی تھیں۔ علامہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے دیکھا کہ حضرت خنساءؓ کعبہ کا طواف کر رہی ہیں اور سر پر سوگ کی علامت کے طور پر سربند باندھ رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں بلا کر فرمایا کہ اسلام اس قسم کے سوگ کی اجازت نہیں دیتا۔ انہوں نے عرض کیا:

"امیر المومنین! کسی عورت پر غم والم کا ایسا پہاڑ نہ ٹوٹا ہو گا میں اسے کیسے برداشت کروں؟"

حضرت عمرؓ نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے فرمایا:

"اس دنیا میں لوگوں کو اس سے بھی بڑے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ذرا ان کے دلوں میں جھانک کر تو دیکھو۔ جس چیز کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے اس کو اختیار کرنا معصیت ہے"۔

اس کے بعد حضرت خنساءؓ نے سوگ کی علامت ترک کر دی لیکن صخر کو بھلانا ان کے بس کی بات نہ تھی اس کی یاد میں ان کا رونا دھونا برابر جاری رہا لیکن اب اس نے دوسری صورت اختیار کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد وہ اس قسم کے شعر پڑھا کرتی تھیں:

کنت ابکی لہٗ من الثار

وانا الیوم ابکی لہٗ من النار

(یعنی پہلے تو میں صخر کو بدلہ لینے کی خاطر رویا کرتی تھی اور اب اس لیے روتی ہوں کہ وہ (قتل ہو گیا اور اسلام نہ لا سکا) اور اب جہنم کی آگ میں جلتا ہو گا)

حافظ ابنِ حجرؒ نے اس سلسلہ میں یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ حضرت خنساءؓ کبھی کبھی اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتیں، ان کے سر پر ہمیشہ بالوں کا ایک گچھا بندھا ہوتا جو عرب میں انتہائے غم کا مظہر ہوتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اس طرح کا سر بند باندھ کر سوگ منانا اسلام میں منع ہے۔ حضرت خنساءؓ نے جواب دیا:

اُمّ المومنین یہ سر بند باندھنے کی ایک خاص وجہ ہے۔

حضرت عائشہؓ نے پوچھا: "وہ کیا؟"

حضرت خنساءؓ نے کہا:

"اُم المومنین! میرا خاوند انتہائی فضول خرچ اور قمار باز تھا۔ اس نے اپنا تمام زر و مال جوئے میں ہار دیا اور ہم دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ جب میرے بھائی صخر کو میری حالت کا پتہ چلا تو اس نے اپنے تمام مال کا بہترین نصف مجھے دے دیا۔ جب میرے شوہر نے اسے بھی ضائع کر دیا تو میرے بھائی نے اپنے بقایا کا بہترین نصف پھر مجھے دے دیا۔ صخر کی بیوی اس پر معترض ہوئی کہ تم اپنے مال کا بہترین حصہ اپنی بہن کو دیتے ہو اور اس کا شوہر اسے قمار بازی میں تلف کر دیتا ہے، یہ سلسلہ آخر کب تک چلے گا۔

میرے بھائی نے جواب دیا، خدا کی قسم میں اپنی بہن کو اپنے مال کا بدترین حصہ نہیں دوں گا۔ وہ پاک دامن ہے اور میرے لیے یہ کافی ہے کہ میں اس کے

ننگ و عار کا لحاظ رکھوں۔ اگر میں مر جاؤں گا تو وہ اپنی اوڑھنی میرے غم میں چاک کر ڈالے گی اور میرے سوگ میں اپنے سر پر بالوں کا سر بند باندھے گی"

چنانچہ میں یہ سر بند اپنے شجاع اور سخی بھائی کی یاد میں باندھتی ہوں۔

بہر صورت حضرت عمر فاروق ﷺ یا حضرت عائشہؓ کی تنبیہ کے بعد انہوں نے یہ سر بند باندھنا چھوڑ دیا اور رضائے الٰہی پر شاکر ہو گئیں۔

حضرت خنساءؓ کی زندگی کا سب سے تابناک واقعہ وہ ہے جس میں وہ اپنے چاروں بیٹوں کو ساتھ لے کر جنگ قادسیہ میں شریک ہوئیں۔ اس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یہ چاروں بچے ان کا عصائے پیری تھے (بالخصوص بعض اہل سیر نے اس بیان کے پیش نظر کہ شدت غم اور کثرتِ الم سے روتے روتے ان کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں) لیکن جب ان چاروں کی شہادت کی خبر سنی تو جزع فزع کے بجائے ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے "الحمد للہ الذی شرفنی بقتلهم" ......اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ان کے (راہِ خدا میں) قتل ہونے کا شرف بخشا۔ یہ الفاظ ان کے ایمانِ محکم اور صبر و رضا پر دال ہیں۔

چند مفید معلومات

حضرت خنساءؓ کے یہ بچے جنگِ قادسیہ سے پہلے کئی دوسری لڑائیوں میں بھی دادِ شجاعت دے چکے تھے اور حکومت کی طرف سے ہر ایک کے نام دو سو درہم سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت عمر ﷺ نے یہ وظیفہ حضرت خنساءؓ کے نام منتقل کر دیا۔

اسلام کی اس جلیل القدر خاتون نے ایک روایت کے مطابق جنگِ قادسیہ کے ساتھ آٹھ سال بعد ۲۴ھ میں وفات پائی اور ایک دوسری روایت کے مطابق انہوں نے امیر معاویہ ﷺ کے عہدِ حکومت میں کسی بادیہ میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ واللہ اعلم بالصواب

مولانا سعید انصاری مرحوم نے سیر الصحابیات میں لکھا ہے کہ حضرت خنساءؓ کا ضخیم دیوان مع شرح ۱۸۸۸ء میں بیروت سے چھپا۔ اس میں حضرت خنساءؓ کے علاوہ ساٹھ دوسری خواتین کے کہے ہوئے مرثیے بھی شامل ہیں۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور دوبارہ طبع کیا گیا۔

مولانا محمد نعیم ندوی صدیقی (اعظم گڑھ) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ حضرت خنساءؓ کے دیوان کی شرح ایک عیسائی "الاب لویس الیسوعی" نے انیس الجلساء کے نام سے لکھی تھی۔ یہ شرح مطبع کاثولیکیہ بیروت سے ۱۸۹۶ء میں شائع ہوئی۔ اسے دیوانِ خنساءؓ کے ۶ قدیم قلمی نسخوں سے پوری صحت کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے شروع میں ایک مبسوط اور وقیع مقدمہ بھی ہے جو بجائے خود ایک خاصے کی چیز ہے۔ (ماہنامہ فاران کراچی۔ جولائی ۱۹۶۰ء)

اگرچہ حضرت خنساءؓ سے کوئی حدیث مروی نہیں ہے لیکن ان کا شمار جلیل القدر صحابیات میں ہوتا ہے۔ آخر جن کے حُسنِ کلام کی خود سید المرسلین، رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف و تحسین فرمائی ہو ان کی جلالتِ قدر اور عُلوِ مرتبت میں شک بھی کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر حضرت خنساءؓ نے راہِ حق میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کی شہادت پر جس بے مثال صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا اس نے بلاشبہ ان کے نام کو جریدۂ عالم پر دوام کا مستحق بنا دیا۔ ملتِ اسلامیہ اگر تا اَبد ان پر ناز کرتی رہے تو وہ بجا طور پر اس کی مستحق ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

❁❁❁❁

جس وقت گھمسان کا رَن پڑ رہا تھا، حضرت ابوطلحہ ؓ نہایت پامردی کے ساتھ حضور ﷺ کے دائیں بائیں لڑ رہے تھے اور حضرت اُمّ سلیمؓ ہاتھ میں خنجر لیے شمعِ نبوت پر قربان ہونے کے لیے کھڑی تھیں۔ لڑائی کا زور کم ہوا، تو حضرت ابوطلحہؓ نے حضور ﷺ کو بتایا کہ اُمّ سلیمؓ خنجر ہاتھ میں لیے کھڑی ہیں۔

حضور ﷺ نے اُمّ سلیمؓ سے پوچھا: ''خنجر کیا کرو گی؟''

انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کوئی مشرک قریب آیا، تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گی''۔

حضور ﷺ یہ سن کر متبسم ہوئے۔

اس کے بعد حضرت اُمّ سلیمؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! مکہ کے جو لوگ آج میدانِ جنگ سے بھاگے ہیں انہیں قتل کر دیں''۔

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے خود ان کا انتظام کر دیا ہے''۔

صحیح مسلم میں ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ سلیمؓ اور انصار کی چند عورتوں کو غزوات میں ساتھ رکھتے تھے جو لوگوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں''۔

......☆......

حضرت اُمّ سُلَیم رضی اللہ عنہا

یہ خادم رسول سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں

اللہ اللہ، قدرت کی کرشمہ سازیوں کی شان بھی عجیب ہے۔ ایک طرف قریش مکہ کی حرماں نصیبی دیکھیے کہ رحمت حق ان کے گھر میں نازل ہوئی لیکن انہوں نے اُسے خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا، دوسری طرف تین سو میل دور شہر یثرب کے باشندوں کی خوش بختی دیکھئے کہ مہیب خطرات کے علی الرغم وہ اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھے، والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ رحمت مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامنِ اقدس تھام لیا اور آپؐ کے سامنے دیدہ ودل فرشِ راہ کر دیئے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

بعثت کے تیرہویں سال سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم نے ارضِ مکہ کو الوداع کہہ کر یثرب میں نزولِ اجلال فرمایا، تو دو ہزار سالہ اس قدیم شہر پر بہارِ تازہ آ گئی۔ وہ یثرب سے "مدینۃ النبیؐ" بن گیا۔ اور اس کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ انوارِ رسالت سے جگمگانے لگا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک باوقار خاتون دس سال کے ایک کمسن بچے کے ہمراہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ بڑے ادب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا اور پھر یوں عرض پیرا ہوئیں:

"یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، یہ میرا فرزند اَنس ہے، میری دلی تمنا ہے کہ یہ آپ کی خدمت کیا کرے۔ اس کو اپنے خادموں میں شامل فرمالیں اور اس کے لیے دعا کریں"۔

حضور ﷺ نے خاتون کے جذبۂ اخلاص کی تحسین فرمائی، بچے کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور پھر ان کے لیے دعائے خیر و برکت مانگی۔ یہ خاتون جنہوں نے اپنے محبوب لختِ جگر کو فخر موجودات ﷺ کی خدمتِ اقدس میں دینے کا عظیم شرف حاصل کیا اور جن کے جذبۂ اخلاص نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسرور کیا، حضرت اُمّ سُلیمؓ انصاریہ تھیں۔

ابتدائی تعارف اور سلسلۂ نسب

حضرت اُمّ سلیمؓ کا شمار نہایت عظیم المرتبت صحابیات میں ہوتا ہے۔ ان کا اصل نام رَملہ یا سَہلہ اور بعض کے نزدیک رمیثہ تھا۔ غمیصا اور رمیصا لقب اور اُمّ سلیمؓ کنیت تھی۔ بعض اہل سیر نے ان کی ایک اور کنیت، اُمّ انس بھی لکھی ہے، لیکن اس کو زیادہ شہرت حاصل نہیں ہوئی۔

حضرت اُمّ سلیمؓ قبیلہ خزرج کی نہایت معزز شاخ عدی بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔

اُم سلیمؓ بنت ملحان بن خالد بن جرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار۔ ماں کا نام ملیکہ (بنت مالک بن عدی) تھا۔ وہ بھی بنو نجار سے تھیں۔

یہ رسولؐ کی خالہ بھی تھیں

اکثر سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت اُم سلیمؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ مشہور تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت اُمّ سلیمؓ کو اس لیے حضور ﷺ کی خالہ کہا جاتا تھا کہ آپ کی دادی سلمٰی (حضرت عبدالمطلب کی والدہ) کا تعلق بھی بنو نجار سے تھا اور حضرت اُم سلیمؓ، سلمٰی کے بھائی کی پوتی تھیں۔ اسی نسبت سے وہ اور ان کی بہن اُمّ حرامؓ حضور ﷺ کی خالہ مشہور ہو گئی تھیں۔ اگرچہ یہ رشتہ دور کا تھا، لیکن سرورِ عالم ﷺ کے نزدیک اس کی بڑی قدر و قیمت تھی اور آپؐ وقتاً فوقتاً حضرت اُمّ سلیمؓ کے گھر کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے مشرف فرمایا کرتے تھے۔

ایک اور اعزاز

حضرت اُمّ سلیمؓ کو اللہ تعالیٰ نے نہایت صالح فطرت سے نوازا تھا۔ بیعتِ عقبۂ اولیٰ

میں جب چند سعید الفطرت یثربی حضور ﷺ کی بیعت سے سعادت اندوز ہو کر مدینہ واپس گئے اور وہاں جا کر اسلام کا چرچا کیا، تو حضرت اُمّ سلیمؓ نے دینِ حق قبول کرنے میں ایک لمحے کا توقف بھی نہ کیا۔ چنانچہ ان کا شمار انصار کے سابقون الاولون میں ہوتا ہے۔

خاوند کی بدنصیبی

حضرت اُمّ سلیمؓ کی پہلی شادی اپنے ابنِ عم ملک بن نضر (بن ضمضم بن زید) سے ہوئی۔ حضرت انسؓ بن مالک جن کا شمار اساطینِ اُمت میں ہوتا ہے، انہی سے پیدا ہوئے۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے جب اسلام قبول کیا، حضرت انسؓ کا دورِ طفلی تھا۔ ماں نے بیٹے کو بھی اپنے رنگ میں رنگنا چاہا، وہ انہیں کلمہ پڑھاتی تھیں اور شعائرِ اسلامی سکھاتی تھیں۔ ان کے خاوند مالک بن نضر بدقسمتی سے نہ صرف اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے بلکہ حضرت اُمّ سلیمؓ کے قبولِ اسلام پر بھی بہت خفا ہوئے اور انہیں اپنے فرزند انسؓ کو کلمہ پڑھانے سے منع کیا۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا نہ تھا جو کسی ترغیب یا تخویف سے اُتر جاتا۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نہایت سختی سے اسلام پر قائم رہیں اور ننھے انسؓ کو بھی اسی رنگ میں رنگتی رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میاں بیوی میں سخت کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مالک بن نضر ناراض ہو کر شام چلے گئے اور وہیں فوت ہو گئے (ایک روایت کے مطابق کسی دشمن نے انہیں قتل کر ڈالا) یہ بیعتِ عقبہ کبیرہ (۱۳ نبوت) سے پہلے کا واقعہ ہے۔

دوسری شادی کا واقعہ

حضرت اُمّ سلیمؓ اب بیوہ تھیں اور ان کا لاڈلا یتیم۔ کچھ مدت بعد ہر طرف سے نکاح کے پیغام آنے لگے، لیکن انہوں نے ہر ایک کے جواب میں یہی کہا کہ جب تک میرا بچہ مجلسوں میں اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے قابل نہ ہو جائے، میں کسی سے نکاح نہیں کر سکتی۔

جب حضرت انسؓ نے ذرا ہوش سنبھالا، تو اُن کے قبیلے کے ایک شخص ابوطلحہ سہل نے حضرت ام سلیمؓ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔

ابوطلحہ ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے اور لکڑی کے ایک بت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے پہلے شوہر سے اس کے شرک کی وجہ سے علیحدگی گوارا کی تھی، اب انہیں یہ کیسے

گوارا ہو سکتا تھا کہ ایک دوسرے مشرک سے نکاح کر لیں، صاف انکار کر دیا اور کہا:

''میں تو خدائے واحد اور اس کے سچے رسولؐ پر ایمان لائی ہوں۔ افسوس ہے تم پر کہ جس خدا کو پوجتے ہو وہ ایک درخت ہے (یعنی لکڑی کا بت ہے) جو زمین سے اُگا ہے اور اس کو فلاں حبشی نے گھڑ کر تیار کیا ہے۔ میں خدائے واحد کی پرستار اور تم خود ساختہ بتوں کے پجاری، جو کسی کو نفع یا ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ بھلا میرا تمہارا میل کیسے ہو سکتا ہے؟''

یہ باتیں کچھ ایسے دل نشین انداز میں کہی گئیں کہ ابوطلحہ کے دل میں اتر گئیں، کچھ دن غور کرتے رہے اور پھر حضرت اُم سلیمؓ کے پاس آ کر کہا:

''مجھ پر حق واضح ہو گیا ہے اور اب میں تمہارا دین قبول کرنے کے لیے تیار ہوں''۔

عجیب و غریب مہر، عجیب و غریب نکاح

حضرت ابوطلحہؓ کی مالی حیثیت اس وقت بہت معمولی تھی، لیکن اُم سلیمؓ کو ان کے اسلام قبول کر لینے سے اتنی خوشی ہوئی کہ بے ساختہ کہا:

"فانی اتزوّجک ولا اخذ منک صداقاً غیرہٗ"

''پھر میں تم سے نکاح کرتی ہوں اور سوائے اسلام کے کوئی مہر نہیں لیتی''۔

اُس کے بعد اپنے بیٹے انسؓ سے فرمایا: ''اب تم ان کے ساتھ میرا نکاح کر دو''۔

حضرت انسؓ نے اپنی والدہ کا نکاح حضرت ابوطلحہؓ سے پڑھا دیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری والدہ کا نکاح حضرت ابوطلحہؓ سے عجیب و غریب مہر پر ہوا۔ یہ روایت ابنِ سعد کاتب الواقدی کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی اصابہ میں اسے اسی طرح نقل کیا ہے۔ لیکن بہت سی دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہؓ کے قبولِ اسلام کے وقت حضرت انسؓ کی عمر نو برس کے لگ بھگ تھی۔ ایک نابالغ بچے کا نکاح پڑھانا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے نکاح کسی دوسرے صاحب نے پڑھایا ہو اور حضرت انس ؓ مجلسِ نکاح میں موجود ہوں (واللہ اعلم)۔

حضرت ثابتؒ کہا کرتے تھے کہ میں نے کسی عورت کا مہر اُم سلیمؓ سے افضل نہیں سنا۔

ابو طلحہ ؓ کی خوش نصیبی

قبولِ اسلام کے بعد ابو طلحہ ؓ اپنے جوشِ ایمان، حُبِّ رسول ؐ اور جذبۂ ایثار کی بدولت بڑے جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوئے۔ نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہونے کے چند ماہ بعد حضرت ابو طلحہ ؓ کو انصار کے ان بہتر مردانِ حق میں شامل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی جو ۱۳ نبوت میں مکہ جا کر رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور آپ کو اس عہد کے ساتھ مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی کہ وہ اپنی جانوں، مالوں اور اولادوں کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت کریں گے۔ یہ بیعت تاریخ میں بیعت لیلۃ العقبہ، بیعت عقبہ ثانیہ، اور بیعت عقبہ کبیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو حضرت اُمّ سلیم ؓ، ان کے شوہر اور فرزند کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حضور ﷺ کا ورودِ مدینہ ان کے لیے یومِ عید تھا۔ ہجرت کے ابتدائی ایام میں ہی حضرت اُمّ سلیم ؓ نے اپنے لختِ جگر حضرت انس ؓ کو سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دینے کا شرف حاصل کیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اُمّ سلیم ؓ کے ایماء پر حضرت ابو طلحہ ؓ، حضرت انس ؓ کو ساتھ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ انس ؓ کو اپنی غلامی میں لیجئے، حضور ﷺ نے اُن کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔

اُمّ سلیم ؓ کے مکان کا اعزاز

ہجرت کے چند ماہ بعد رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارہ (عقدِ مؤاخاۃ) قائم کرایا، تو حضرت اُمّ سلیم ؓ کے مکان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہاں سید البشر ﷺ اور تمام مہاجرین وانصار اس مقصدِ عظیم کے لیے جمع ہوئے۔

اُمّ سلیم ؓ کا مجاہدانہ کردار

۳ھ میں حضرت اُمّ سلیم ؓ اپنے شوہر حضرت ابو طلحہ ؓ کے ہمراہ بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ جنگِ اُحد میں شریک ہوئیں۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا، تو

حضرت ابوطلحہؓ ان چند صحابہ کرامؓ میں سے تھے جو اخیر تک رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں سینہ سپر رہے۔ اس موقع پر حضرت اُمّ سلیمؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ہمراہ میدانِ جنگ میں مشک بھر بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں۔

اواخر ۶ھ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت اُمّ سلیمؓ چند دوسری صحابیات کے ساتھ لشکرِ اسلام کے پیچھے روانہ ہوئیں۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا، تو آپؐ نے ناراضی کے لہجے میں پوچھا کہ تم کس کے ساتھ اور کس کی اجازت سے آئی ہو۔ انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، ہم اون کاتتے ہیں اور اس سے خدا کی راہ میں اعانت کرتے ہیں، ہمارے ساتھ زخمیوں کے علاج کا سامان ہے۔ ہم لوگوں کو تیر اٹھا اٹھا کر دیتے ہیں اور ستو گھول گھول کر پلاتے ہیں''۔ حضور ﷺ نے ان کا جواب سن کر انہیں میدانِ جنگ میں موجود رہنے کی اجازت دے دی۔

اُمّ سلیمؓ کا ایک اور اعزاز

جب خیبر فتح ہو گیا اور حضرت صفیہؓ بنتِ حُیی نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے پر رضامندی کا اظہار کیا، تو حضور ﷺ نے انہیں حضرت اُمّ سلیمؓ کے سپرد کیا کہ نہلا دھلا کر انہیں دلہن بنائیں۔ کیونکہ جنگ کی صعوبتوں نے حضرت صفیہؓ کو بہت خستہ حال کر دیا تھا۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے بڑے ذوق و شوق سے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی۔

غزوۂ حنین میں اُمّ سلیمؓ رسول اللہ ﷺ کی محافظہ کے طور پر

۸ھ میں فتح مکہ کے چند دن بعد حُنین کی خونیں لڑائی پیش آئی۔ حضرت اُمّ سلیمؓ اپنے شوہر حضرت ابوطلحہؓ کے ساتھ اس معرکے میں والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوئیں۔ لڑائی کی ابتدا میں بنوہوازن کے ماہر قدر اندازوں نے مسلمانوں پر اپنی کمین گاہوں سے ایسی شدت سے تیر برسائے کہ ان کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ اُس وقت رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم گنتی کے چند جاں نثاروں کے ہمراہ میدانِ جنگ میں کوہِ استقلال بن کر کھڑے تھے اور آپ کی زبان پر یہ رجز جاری تھا۔

اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ

(میں نبی ہوں اس میں مطلق جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں)

جس جس مسلمان کے کان میں یہ آواز پڑی وہ پلٹ پڑا اور پھر جب حضور ﷺ کا اشارہ پا کر حضرت عباس ؓ نے بآوازِ بلند مسلمانوں کو یہ کہہ کر پکارا:

''اے جماعتِ انصار! اے اصحابِ شجرہ! تو سب نئے جوش اور ولولے کے ساتھ حضور ﷺ کے گرد جمع ہو گئے اور کفار پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ خاکِ نامرادی چاٹنے پر مجبور ہو گئے۔ جس وقت گھمسان کا رَن پڑ رہا تھا، حضرت ابوطلحہ ؓ نہایت پامردی کے ساتھ حضور ﷺ کے دائیں بائیں لڑ رہے تھے اور حضرت اُمّ سلیمؓ ہاتھ میں خنجر لیے شمعِ نبوت پر قربان ہونے کے لیے کھڑی تھیں۔ لڑائی کا زور کم ہوا، تو حضرت ابوطلحہؓ نے حضور ﷺ کو بتایا کہ اُمّ سلیمؓ خنجر ہاتھ میں لیے کھڑی ہیں۔

حضور ﷺ نے اُمّ سلیمؓ سے پوچھا: ''خنجر کیا کرو گی؟''

انہوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کوئی مشرک قریب آیا تو اس کا پیٹ چاک کر دوں گی''۔

حضور ﷺ یہ سن کر متبسم ہوئے۔

اس کے بعد حضرت اُمّ سلیمؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! مکہ کے جو لوگ آج میدانِ جنگ سے بھاگے ہیں انہیں قتل کر دیں''۔

رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے خود ان کا انتظام کر دیا ہے''۔

صحیح مسلم میں ہے کہ:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ سلیمؓ اور انصار کی چند عورتوں کو غزوات میں ساتھ رکھتے تھے جو لوگوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں''۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُحد، خیبر اور حُنین کے علاوہ حضرت اُمّ سلیمؓ نے کئی دوسرے غزوات میں بھی حصہ لیا ہو گا۔

حضور ﷺ نے فرمایا، مجھے اُمّ سلیمؓ پر رحم آتا ہے

حضرت اُمّ سلیمؓ کو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہا درجے کی محبت اور عقیدت تھی۔

حضور ﷺ بھی اُن کی بے حد قدر و منزلت فرماتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق ازواجِ مطہراتؓ کے علاوہ عورتوں میں صرف حضرت اُمّ سلیمؓ اور ان کی بہن اُمّ حرامؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اُن کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور دوپہر کو وہاں آرام فرماتے تھے۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اُمّ سلیمؓ پر رحم آتا ہے کہ اس کے بھائی حرامؓ بن ملحان نے میری حمایت میں شہادت پائی ہے۔ (حضرت حرامؓ بن ملحان سریۂ بیرِ معونہ میں شہید ہوئے تھے)

اُمّ سلیمؓ کی حضور ﷺ سے عقیدت

حضور ﷺ سے حضرت اُمّ سلیمؓ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ جب اُن کے گھر میں استراحت فرماتے، وہ آپؐ کا پسینہ مبارک اور گرے ہوئے موئے مبارک ایک شیشی میں تبرک کے طور پر جمع کر لیتی تھیں۔ اگر کبھی حضور ﷺ کو اُمّ سلیمؓ کے گھر نماز کا وقت آ جاتا، تو آپؐ وہیں چٹائی پر نماز ادا کر لیتے، ایک بار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمّ سلیمؓ کے مشکیزے سے اپنا دہنِ مبارک لگا کر پانی پیا، وہ اٹھیں اور مشکیزے کا منہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہونٹ اس سے مس ہوئے تھے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج سے فارغ ہونے کے بعد منیٰ میں اپنے موئے مبارک ترشوائے، تو حضرت اُمّ سلیمؓ نے اپنے شوہر ابوطلحہؓ سے کہا کہ حجام سے ان بالوں کو مانگ لو، انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے موئے مبارک ایک شیشی میں خیر و برکت کے لیے اپنے پاس محفوظ کر لیے۔

ابنِ سعد نے اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ سلیمؓ پر کس قدر شفقت فرماتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ حضور ﷺ حج کے لیے مدینہ منورہ سے چلنے لگے، تو اُمّ سلیمؓ سے فرمایا: "تم حج کے لیے نہ جاؤ گی؟" انہوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! میرے شوہر کے پاس صرف دو سواریاں تھیں اور ان دونوں پر وہ اپنے بیٹے کے ساتھ حج کو چلے گئے، میرے پاس اب کوئی سواری نہیں"۔

حضور ﷺ نے انہیں ازواجِ مطہراتؓ کے ساتھ سوار کرا دیا اور اپنے ساتھ حج کو لے

چلے۔ اثنائے راہ میں آپ کے غلام انجشہ نے اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے حدی خوانی شروع کر دی جس سے اونٹ دوڑنے لگے۔ حضور ﷺ نے دیکھا، تو فرمایا: ''انجشہ! آہستہ آہستہ، اونٹوں پر شیشے ہیں شیشے''۔

یا ابا عُمیر! ما فعل النغیر؟

حضرت ابوطلحہؓ کے صُلب سے حضرت اُمِ سلیمؓ کا ایک فرزند تھا جس کا نام ابوعمیر تھا، وہ بڑا پیارا بچہ تھا۔ حضور ﷺ اُمِ سلیمؓ کے گھر تشریف لاتے، تو اس سے پیار محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک دن آپ تشریف لائے تو ننھے ابوعمیر کا چہرہ اترا ہوا پایا۔ آپؐ نے اُمِ سلیمؓ سے پوچھا: ''کیا بات ہے آج ابوعمیر کچھ سست ہے؟''۔ انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ابوعمیر کی چڑیا (نُغَیر) جس کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا، آج مرگئی ہے اسی لیے وہ غمگین ہے''۔

حضور ﷺ نے ابوعمیر کو اپنے پاس بلایا اور دستِ شفقت اس کے سر پر رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا:

يَا اَبَا عُمَيْرَ ، مَا فَعَلَ النُّغَيْرَ ''اے ابوعمیر! تیری نغیر نے کیا کیا؟''

ابوعمیرؓ جواب میں ہنس دیا، پھر کھیل کود میں مشغول ہو گیا۔ اس وقت سے حضور ﷺ کا یہ جملہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

کچھ عرصہ بعد ابوعمیر نے کمسنی ہی میں وفات پائی، ابوطلحہؓ اس وقت گھر سے باہر تھے۔ حضرت اُمِ سلیمؓ نے اپنے لاڈلے بچے کی رحلت پر کمال صبر و استقلال سے کام لیا۔ خاموشی سے اس کی میت کو غسل دے کر کفنایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو منع کر دیا کہ ابوطلحہؓ کے آتے ہی ابوعمیرؓ کی موت کی المناک خبر نہ دیں۔ رات کو حضرت ابوطلحہ ؓ گھر آئے۔ اُمِ سلیمؓ نے انہیں کھانا کھلایا۔ جب وہ اطمینان سے بستر پر لیٹے تو اُن سے مخاطب ہو کر کہا:

''اگر تم کو کوئی چیز مستعار دی جائے اور پھر واپس لے لی جائے تو کیا اس کا واپس لیا جانا تمہیں ناگوار گزرے گا؟''

حضرت ابوطلحہ ؓ نے جواب دیا: ''ہرگز نہیں''۔

بولیں: ''تمہارا لڑکا بھی اللہ کی امانت تھی جو اُس نے واپس لے لی۔ تمہیں اب اس کی طرف سے صبر کرنا چاہئے۔

ابوطلحہ ؓ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا اور ان سے کہا: ''تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟''

بولیں: ''تا کہ تم اطمینان سے کھانا وغیرہ کھالو''۔

صبح اٹھ کر ابوطلحہؓ رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ حضورؐ نے اُمّ سلیمؓ کے شیوۂ صبر و رضا پر ان کی تحسین فرمائی اور دعا کی: ''اللہ تعالیٰ تمہیں اور اُمّ سلیمؓ کو ابوعمیر کا نعم البدل عطا فرمائے''۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابوطلحہؓ اور اُمّ سلیمؓ کو ایک اور فرزند عطا کیا جس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ ان کی تربیت حضور ﷺ ہی کے زیر سایہ ہوئی اور انہیں سے حضرت ابوطلحہؓ کی نسل چلی۔

اُمّ سلیمؓ کی درخواست پر انس ؓ کے لئے حضور ﷺ کی دعا

ایک مرتبہ رحمتِ عالم ﷺ حضرت اُمّ سلیمؓ کے گھر تشریف لائے۔ انہوں نے حضور کی خدمت میں کھجوریں اور مکھن پیش کیا، آپؐ نے فرمایا: ''میں روزے سے ہوں''۔ کچھ دیر بعد حضور نے نماز نفل پڑھی اور اُمّ سلیمؓ کے گھرانے کے لئے دعا مانگی۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! مجھے اپنے فرزند انسؓ سے جو حضور ﷺ کا خدمت گار ہے، بہت محبت ہے۔ اس کے لیے خاص طور پر دعا کیجئے''۔

رحمتِ نبویؐ جوش پر تھی۔ آپؐ نے دستِ دعا اٹھائے اور حضرت انس ؓ کے حق میں یوں دعا مانگی: ''اے اللہ اس کو مال دے اور اس کی عمر میں برکت عطا فرما''۔

اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ حضرت انس ؓ تمام انصار میں سب سے زیادہ متمول ہو گئے، طویل عمر پائی اور کثیر الاولاد ہوئے۔

اُمّ سلیمؓ حضور ﷺ کی دعوت کرتی ہیں

ایک مرتبہ حضرت ابوطلحہ ؓ گھر تشریف لائے اور حضرت اُمّ سلیمؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھوکے ہیں، کچھ کھانا بھیج دو۔ انہوں نے چند روٹیاں اپنے فرزند انس ؓ کو دیں اور

کہا اسی وقت جا کر حضور ﷺ کو کھانا کھلاؤ۔ جب حضرت انس ؓ مسجد میں پہنچے، تو وہاں حضورؐ کے گرد بہت سے صحابہ کا مجمع تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت انس ؓ سے پوچھا ابوطلحہؓ نے تمہیں بھیجا ہے؟۔ عرض کی "بے شک یا رسول اللہ"۔ پھر پوچھا "کھانے کے لیے؟" انہوں نے کہا۔ "جی ہاں"۔

حضور ﷺ سب صحابہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت اُمّ سلیمؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوطلحہؓ کو فکر ہوئی کہ اتنے آدمیوں کے لیے کھانا کافی نہ ہوگا۔ حضرت اُمّ سلیمؓ سے کہا: "اب کیا تدبیر کی جائے کہ یہ سارے اصحاب کھانا کھا سکیں"۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا: "یہ بات اللہ اور اللہ کا رسولؐ بہتر سمجھتے ہیں"۔ پھر جو تھوڑا بہت کھانا موجود تھا انہوں نے رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے سامنے رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت دی کہ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ۵ھ میں رسولِ کریمؐ نے حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کیا، تو حضرت اُمّ سلیمؓ نے ایک بڑے برتن میں مالیدہ بنا کر حضرت انس ؓ کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ حضورؐ کی خدمت میں عرض کرنا کہ اس حقیر ہدیے کو قبول فرمائیں۔

ہے عجب چراغ کی روشنی!

ایک مرتبہ ایک شخص بحالِ پریشان سرورِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے طعام کا سوال کیا۔ حضور ﷺ نے ازواجِ مطہراتؓ سے پوچھ بھیجا کہ گھر میں کھانے کو کچھ ہے؟ سب طرف سے جواب آیا کہ آج فاقہ ہے۔ اب حضور ﷺ نے صحابہ کی طرف دیکھا اور فرمایا: "کوئی ہے جو اس اللہ کے بندے کو اپنا مہمان بنائے؟" حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت ابوطلحہؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی: "یا رسول اللہ! اس کو میں اپنا مہمان بناؤں گا"۔ یہ کہہ کر فوراً گھر آئے اور حضرت اُمّ سلیمؓ سے پوچھا: "کھانے کے لیے کچھ ہے؟" انہوں نے کہا: "بچوں کے لیے تھوڑا سا کھانا پکا ہے۔ اس کے سوا خدا کی قسم، گھر میں کھانے کی کوئی چیز نہیں"۔ حضرت ابوطلحہؓ نے کہا: "کوئی مضائقہ نہیں، بچوں کو بہلا کر سُلا دو...... وہ سو جائیں، تو ہم ان کا کھانا مہمان کے آگے رکھ دیں گے۔ تم چراغ درست کرنے کے بہانے سے اٹھ کر اُسے بجھا دینا۔ اندھیرے میں مہمان کھانا کھا لے گا اور

ہم بھی یونہی منہ چلاتے رہیں گے"۔ غرض اس طرح مہمان کو کھانا کھلا کر دونوں میاں بیوی اور بچوں نے رات فاقے سے گزار دی۔ صبح کو حضرت ابوطلحہؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو زبانِ رسالت پر یہ آیت جاری تھی:

"وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ "

(وہ لوگ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ ان پر تنگی ہی ہو)

آپؐ نے ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "رات کو مہمان کے ساتھ تم لوگوں کا طریقہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا"۔

ایک دفعہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو کسی خاص کام کے لیے کہیں بھیجا اور خود ایک دیوار کے سایے میں انتظار فرماتے رہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ واپس آئے، تو حضورؐ اپنے کاشانۂ اقدس کی طرف تشریف لے گئے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کو گھر بھیج دیا۔ چونکہ کام میں مصروفیت کی وجہ سے انہیں بہت دیر ہو گئی تھی، اُمّ سلیمؓ نے پوچھا، آج اتنی دیر کیوں لگائی؟۔ انہوں نے کہا: "حضورؐ کے ایک کام کے لیے گیا تھا"۔ انہوں نے پوچھا: "کیا کام تھا؟" انہوں نے جواب دیا کہ ایک پوشیدہ بات تھی۔ حضرت اُمّ سلیمؓ نے ان کو تاکید کی کہ اس کو کسی سے نہ کہنا۔ چنانچہ انہوں نے اس کو کسی پر ظاہر نہ کیا۔

کُپی ہے گھی سے ابھی تک لبالب بھری ہوئی

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میری ماں (اُمّ سلیمؓ) کے پاس ایک بکری تھی، انہوں نے اس کے گھی کو ایک کُپی میں جمع کیا۔ جب وہ کُپی بھر گئی تو اس کو انہوں نے اپنی پرورش کردہ لڑکی کے ہاتھ یہ کہہ کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ آپ اس سے سالن بنا لیا کریں۔ وہ لڑکی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپؐ نے اہلِ خانہ سے فرمایا، اس کُپی کو خالی کر کے اس کو دے دو۔ چنانچہ وہ کُپی خالی کی گئی اور اس لڑکی کو دے دی گئی۔ وہ واپس آئی تو حضرت اُمّ سلیمؓ گھر میں نہیں تھیں۔ لڑکی نے وہ کُپی کھونٹی پر لٹکا دی۔ جب اُمّ سلیمؓ گھر آئیں تو کُپی کو بھرا ہوا دیکھا، اس میں سے گھی ٹپک رہا تھا۔ انہوں نے لڑکی سے کہا: "بیٹی کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ اسے حضورؐ کے پاس لے جا"۔ اس نے کہا، میں لے گئی تھی اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو خود جا کر حضور ﷺ سے پوچھ

پس۔ حضرت اُمِ سلیمؓ لڑکی کو ساتھ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی: "یا رسول اللہ! میں نے اس کے ہاتھ آپ کے پاس ایک کپی بھیجی تھی جس میں گھی تھا"۔

حضورؐ نے فرمایا: "یہ آئی تھی اور دے گئی تھی"۔

حضرت اُمِ سلیمؓ نے عرض کیا: "قسم اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ پیدا کیا وہ کپی بھری ہوئی ہے اور اس میں سے گھی ٹپک رہا ہے"۔

حضورؐ نے فرمایا: "اے اُمِ سلیمؓ تجھے اس بات پر تعجب کیوں ہے کہ اللہ نے تجھ کو رزق دیا جیسا کہ تو نے اس کے نبی کو کھانے کو دیا ہے کھا اور کھلا"۔

حضرت اُمِ سلیمؓ کہتی ہیں کہ میں گھر آئی اور اس گھی کو اپنے اعزہ و اقارب میں تقسیم کیا پھر بھی اتنا بچ رہا کہ ہم ایک دو ماہ تک اس سے سالن کا کام لیتے رہے۔

حضرت اُمِ سلیمؓ کے سالِ وفات کے بارے میں اربابِ سیَر نے تصریح نہیں کی۔ قیاس یہ ہے کہ انہوں نے صدیق اکبرؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ انہوں نے اپنے پیچھے دو فرزند چھوڑے، حضرت انسؓ جو پہلے خاوند مالک سے تھے اور حضرت عبداللہؓ جو ابوطلحہؓ سے تھے۔

حضرت ام سلیمؓ سے حضرت انسؓ، عبداللہ بن عباسؓ، زیدؓ بن ثابت اور عمروؓ بن عاصم نے چند احادیث بھی روایت کی ہیں۔ لوگ اکثر ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے اور اپنے شکوک رفع کرتے تھے۔ علامہ ابن اثیرؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے: "کانت من عقلاء النّساء" (وہ عاقل خواتین میں سے تھیں)۔

حضرت انسؓ فرمایا کرتے تھے، اللہ میری ماں کو جزائے خیر دے، انہوں نے بڑی خوبی سے میری پرورش اور تربیت کی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ (تمثیلی پیرایہ میں) فرمایا: "میں جنت میں گیا تو مجھے کچھ آہٹ معلوم ہوئی، میں نے پوچھا کون ہے! تو لوگوں نے کہا، انس کی والدہ غمیصا بنتِ ملحان ہیں"۔

گویا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُمِ سلیمؓ کو خود جنت کی بشارت دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ایک عظیم صحابیہؓ

همشیرہ نوید حسن شہید

چاندنی رات کا پچھلا پہر تھا۔ مدینے کی گلیوں میں ہر طرف نور برس رہا تھا۔ فضائے بسیط میں فرشتوں کے پروں کی آواز دم بدم تیز ہوتی جا رہی تھی۔ عالم بالا کا یہ کارواں شاید مدینے کی زمین کا تقدس چومنے آ رہا تھا۔ اچانک اسی خاموش سناٹے میں ایک آواز گونجی۔ فضاؤں کا سکون ٹوٹ گیا۔ میخانۂ عشق کا دروازہ کھلا۔ کوثر کی شراب چھلکی۔

یہ غلامانِ اسلام کے آقا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز تھی جس نے ہر گھر میں ہنگامۂ شوق برپا کر دیا۔ سرورِ کونین ﷺ کا منادی ایک شکستہ گھر کے سامنے آواز دے رہا تھا۔

"گلشن اسلام کی شادابی کے لئے خون کی ضرورت ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مجاہدین کا لشکر ایک عظیم مہم پر روانہ ہو رہا ہے، مدینے کی ارجمند مائیں اپنے شہزادوں کا نذرانہ لے کر فوراً بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو جائیں۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی طرح یہ ٹوٹا ہوا گھر ایک بیوہ عورت کا تھا۔ چھ سال کے یتیم بچے کو گود میں لئے ہوئے وہ سو رہی تھی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز سن کر چونک پڑی۔ دروازے پر کھڑی ہو کر پھر غور سے سنا۔ سنتے ہی دل کی چوٹ ابھر آئی، آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل ہو گئیں، چھ سال کا یتیم بچہ سویا ہوا تھا، فرطِ محبت میں بچے کو سینے سے چمٹا لیا، سسکیوں کی آواز سن کر بچے نے آنکھیں کھول دیں اور ماں کو روتا ہوا دیکھ کر بے تاب ہو گیا۔

گلے میں بانہیں ڈال کر معصوم اداؤں سے دریافت کیا:

''ماں کیوں رو رہی ہو کہاں تکلیف ہے تمہیں؟''

آہ ایک ناسمجھ بچے کو کیا معلوم کہ حسرتوں کی چوٹ کتنی دردناک ہوتی ہے۔ پھر ایک بیوہ عورت کا دل تو اتنا نازک ہوتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے۔ بچے کے اس سوال پر ماں کا دل اور بھر آیا اور گرم گرم آنسوؤں سے آنچل کا کونہ بھیگ گیا۔

بچہ بھی ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگا۔ ماں نے بچے کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ''میرے لعل! مت رو، یتیموں کا رونا عرش کو ہلا دیتا ہے، بدر کی وادی میں ابدی نیند سونے والے شہید باپ کی روح کو مت تڑپا، چپ ہو جا، مت رو میرے لعل''۔

مگر بچہ بضد تھا کہ ماں کیوں رو رہی ہے؟ بالآخر بچے کے لئے ماں کی آنکھوں کا ابلتا ہوا چشمہ سوکھ گیا۔ ماں نے بچے کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

بیٹا ابھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ یہ اعلان کرتے ہوئے گزرے ہیں کہ ''اسلام کا پرچم دشمنوں کی زد میں ہے۔ آج نماز فجر کے بعد مجاہدین کا ایک لشکر میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ آقائے کونین ﷺ نے اپنے صاوفادار جانبازوں کو آواز دی ہے۔ رحمتوں کے تاجدار آج ایک ایک قطرۂ خون پر جنتوں کی بہاریں لوٹا دیں گے، ایک لمحے میں آج قسمتوں کی ساری شکن مٹ جائے گی''۔

کتنی خوش نصیب ہوں گی وہ مادرانِ ملت جو سپیدۂ سحر کی روشنی میں اپنے صاجزادوں کا نذرانہ لیے ہوئے سرکارِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوں گی، آہ! کتنی قابل رشک ہو گی ان کی یہ التجا۔

''یارسول اللہ! ہمارے ارمانوں کی یہ حقیر قربانی قبول فرمائیں سرکار عمر بھر کی محنت وصول ہو جائے''۔

یہ کہتے ہی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، آواز بھرا گئی، بچہ ماں کو روتا دیکھ کر مچل گیا۔ ماں نے کہا ''بیٹا ضد نہ کرو، دل کی چوٹ تم ابھی نہیں سمجھ سکتے۔ میں اپنے نصیب کو روتی ہوں۔ کاش! آج میری گود میں کوئی نوجوان بیٹا ہوتا تو میں اپنا نذرانہ شوق لیے رحمتِ عالم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتی۔ افسوس کہ آج آخرت کے سب سے بڑے اعزاز سے محروم ہو گئی''۔ یہ کہتے کہتے پھر دل کا

درد جاگ اٹھا اور آنکھوں کے چشمے سے آنسو ابلنے لگے، بچے نے ماں کو چپ کراتے ہوئے کہا:
''اماں! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ تمہاری گود خالی تو نہیں۔ رحمتِ عالم ﷺ کے پاس سب اپنے نوجوان بیٹوں کو لے کر جائیں گے تم مجھے ہی لے جاؤ''۔

ماں نے چمکارتے ہوئے کہا: ''بیٹا میدان کارزار میں بچوں کو نہیں لے کر جاتے، وہاں تو شمشیر کی نوک سے دشمن کی صفیں الٹنے کے لئے جوانوں کے کس بل کی ضرورت پڑتی ہے، میرے لعل! وہ قتل و خون کی سرزمین ہے تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟'' بچے نے ضد کرتے ہوئے کہا: ''یہ ٹھیک ہے کہ اپنی کمسنی کے باعث ہم میدان کارزار میں جانے کے قابل نہیں ہیں لیکن بارگاہِ رسالت میں حاضری کے لئے تو عمر کی قید نہیں ہے۔ ہماری قربانی سرکار ﷺ نے قبول فرمالی تو زہے نصیب، اور اگر بچہ سمجھ کر واپس کر دیا تو کم از کم یہ غم تو نہ ہوگا کہ اسلام کے لئے جان کی نذر پیش کرنے سے ہم محروم ہو گئے''۔

ماں نے فرطِ محبت میں بچے کا منہ چوم لیا اور حیرت سے تکنے لگی، اس کمسنی میں داناؤں جیسا شعور صرف اس رحمت خاص کا صدقہ ہے جو یتیموں کا نگہبان ہے۔

سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ نماز فجر کے بعد مسجد نبوی میں مجاہدین کی قطاریں کھڑی ہو گئیں۔ جو لوگ محاذ جنگ پر جانے کے قابل تھے انہیں منتخب کر لیا گیا۔ باقی واپس کر دیئے گئے۔ انتخاب کے کام سے فارغ ہو کر سرکار ﷺ واپس تشریف لا ہی رہے تھے کہ ایک پردہ نشین عورت پر نظر پڑی جو چھ سال کا بچہ لیے ایک طرف کھڑی تھی۔ سرکار ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''اس خاتون سے جا کر دریافت کرو وہ کیا فریاد لے کر آئی ہے؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے قریب جا کر نہایت ادب سے پوچھا ''دربار رسالت میں آپ کیا فریاد لے کر حاضر ہوئی ہیں؟''

خاتون نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''آج رات کے پچھلے پہر آپ اعلان کرتے ہوئے میرے گھر کے سامنے سے گزرے۔ اعلان سن کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ میرے گھر میں کوئی جوان نہیں تھا جس کے خون کی خدا کی بارگاہ میں نذر پیش کرتی، چھ سال کا یہ یتیم بچہ ہے جس کا باپ گذشتہ سال جنگ بدر میں جام شہادت سے سیراب ہوا، یہی میری کل متاع زندگی ہے جسے سرکار ﷺ کے قدموں پر نثار کرنے لائی ہوں''۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بچے کو گود میں اٹھایا اور سرکار ﷺ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ سرکار ﷺ نے بچے کو آغوشِ رحمت میں جگہ دی۔ سر پر ہاتھ پھیرا، پیار کیا اور نہایت شفقت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

"میری رحمتوں کے محبوب صاحبزادے تم ابھی کم سن ہو محاذ جنگ پر جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے ابھی تم اپنی ماں کی آغوش میں پلو، بڑھو اور گلشن اسلام کی بہار بنو۔ جب تمہارے بازو میں کس بل پیدا ہو جائے گا تو میدانِ جنگ خود تمہیں آواز دے گا"۔

بچے نے اپنی تتلائی ہوئی زبان سے کہا: "یارسول اللہ! میں نے اپنی امی جان کو دیکھا ہے کہ جب وہ چولہا جلاتی ہیں تو پہلے چھوٹے چھوٹے تنکوں کو سلگاتی ہیں جب آگ دہکنے لگتی ہے تو پھر موٹی موٹی لکڑیاں ڈالتی ہیں۔ یارسول اللہ، میں جنگ کرنے کے قابل تو نہیں ہوں لیکن کیا میدانِ کارزار گرم کرنے کے لئے مجھ سے تنکوں کا کام بھی نہیں لیا جاسکتا؟ اگر آپ مجھے ہمراہ نہ لے کر گئے تو میری امی روتے روتے ہلکان ہو جائے گی"۔

جن معصوم اداؤں کے ساتھ بچے نے اپنی زبان میں دل کے حوصلے کا اظہار کیا سارے مجمع پر رقت طاری ہوگئی۔ سرکار ﷺ بھی فرط اثر سے آبدیدہ ہوگئے اور حضرت بلال سے فرمایا: "جا کر بچے کی ماں سے کہہ دو کہ اس کی ننھی جان کی قربانی قبول کر لی گئی ہے قیامت کے دن وہ غازیانِ اسلام کی صفوں میں اٹھائی جائے گی۔ آج سے خدا کی مقدس امانت سمجھ کر وہ بچے کی پرورش کرے اور خدا کے یہاں اس کے بال بال کا اجر محفوظ ہے"۔

میری ماؤں اور بہنو!

یہ ایک ماں کی اسلام سے محبت اور نبی کریم سے عقیدت کا واقعہ ہے اس زمانے کی مائیں ترستی تھیں کہ ہمارے بیٹے بھی اسلام کی سربلندی کے لئے اللہ کی راہ میں جان دیں تا کہ آخرت میں ہم ایک شہید کی ماں کے نام سے پکاری جائیں لیکن آج کی ماؤں اور بہنوں کی محبت اسلام سے صرف نام کی ہے۔ آج اگر کوئی بیٹا ماں سے جہاد پر جانے کی اجازت مانگتا ہے تو ماں کا حکم ہوتا ہے میرے سامنے لیٹ کر مر جاؤ لیکن میں تمہیں جہاد پر نہ جانے دوں گی اور اگر کوئی بغیر بتائے ٹریننگ پر چلا جاتا ہے تو اسے دھوکے سے واپس بلا کر شادی کے بندھن میں باندھ دیا جاتا ہے تا کہ وہ جہاد پر

نہ جا سکے۔اس واقعے میں ایک بچے کا جذبہ جہاد بیان کیا گیا ہے جبکہ آج کل کے بچے اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ بچے ہوں یا نوجوان ،ٹیلیویژن کے سامنے بیٹھ کر انڈین فلمیں دیکھنے میں مصروف ہوتے ہیں، پہلے بچے گھڑ سواری، تیر اندازی، نشانہ بازی کے گر سیکھتے تھے۔لیکن آج کے بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو والدین ان کے لئے گیند اور بلا خرید کر رکھتے ہیں کہ ہمارا بچہ بڑا ہو کر کرکٹر بنے گا۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا مسلمان ذلت و پستی کا شکار ہے، اگر ہمارے نوجوان بھائی اسی طرح غفلت کی نیند سوتے رہے تو بنیا کشمیری بہنوں کی عصمت لوٹتا رہے گا، ماؤں کی گودیں اجڑتی رہیں گی، بچے درندگی کا شکار ہوتے رہیں گے؟؟

اے مسلمان ماؤں بہنو!

خدارا اپنے بیٹوں اور بھائیوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرو تاکہ وہ کشمیری بہنوں کی عزت لوٹنے والوں کی آنکھیں پھوڑ سکیں تاکہ وہ ماؤں کی گودیں اجاڑنے والوں کے ہاتھ کاٹ سکیں تاکہ وہ بچوں کو زندہ جلانے والوں کے ٹکڑے کر سکیں۔

اللہ آج بھی ہماری ماؤں اور بہنوں میں وہ حوصلہ قربانی اور جذبۂ جہاد پیدا فرمائے جو غزوۂ بدر اور اُحد میں شہید ہونے والے مجاہدین کے والدین میں موجود تھا۔

تاکہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اسلام کے لئے پیکر وفا ثابت ہوں۔ آمین

حضرت اُمّ حکیمؓ شوہر کی شہادت کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت نہایت جوش سے اُٹھیں، اپنے کپڑوں کو باندھا اور خیمہ کی چوب اکھاڑ کر لڑائی میں شریک ہوگئیں۔ زخمی شیرنی کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کرتی تھیں اور اپنی چوب سے رومیوں کو مار گراتی تھیں۔ اس معرکہ میں ان کے ہاتھ سے سات رومی جہنم واصل ہوئے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُمّ حکیمؓ یرموک کی ہولناک جنگ میں بھی شریک ہوئیں اور دوسری خواتین کے ساتھ مل کر رومیوں کے خلاف بڑی دلیری سے جنگ کی۔

حضرت اُمِّ حکیمؓ بنتِ حارث

تاریخی تعارف

رمضان المبارک ۸ھ میں اللہ تعالیٰ نے قریش مکہ کو مغلوب کر دیا اور اہلِ حق مکہ معظمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے لیکن ان کا یہ داخلہ دنیا کے دوسرے فاتحین کی طرح نہیں تھا۔ چند انتہائی شریر النفس مشرکین کو چھوڑ کر جو مبرح الدم قرار دیئے گئے تھے یا ان چند مشرکین کے سوا جنہوں نے حضرت خالدؓ بن ولید کے دستے کی مزاحمت کی تھی، مکہ کے کسی اور مشرک کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ دس ہزار نفوسِ قدسی نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں مکہ معظمہ میں اس طرح قدم رکھا جیسے نسیمِ سحری گلشن میں داخل ہوتی ہے۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابرِ عفو و کرم اہلِ مکہ پر جھوم جھوم کر برسا، یہ وہی اہلِ مکہ تھے جو اہلِ حق کے خون کے پیاسے تھے اور جنہوں نے ان کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ نبیٔ رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف کر دیا...... کسی سے کوئی مؤاخذہ نہ فرمایا لیکن مکہ میں کچھ ایسے آدمی بھی تھے جن کے ضمیر کا کانٹا ان کو کسی پہلو قرار نہیں لینے دیتا تھا۔ اپنے ماضی کے پیشِ نظر ان کو قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر قابو پا کر ان کو زندہ چھوڑیں گے۔ انہوں نے مکہ سے بھاگ جانے ہی میں مصلحت سمجھی۔

اسی زمانے کا ذکر ہے کہ حضور ﷺ کے ورودِ مکہ کے بعد ایک دن مکہ کی ایک خاتون بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئیں اور بڑے ذوق و شوق سے قبولِ اسلام کی سعادتِ عظمیٰ حاصل کی پھر انہوں نے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی:

"یا رسول اللہ! میرا شوہر اپنی جان کے خوف سے یمن کی طرف بھاگ گیا ہے، اگر اس کو امان دے دیں تو میں اس کو واپس لے آؤں"۔

حضور ﷺ کا دریائے رحمت جوش پر تھا۔ آپؐ نے بلا تامل فرمایا: "جاؤ میں نے اس کو امان دی"۔

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر خاتون کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا کیونکہ ان کے شوہر ایک ایسے شخص تھے جن کی اسلام دشمنی مسلّم تھی اور جنہوں نے اہلِ حق کو ستانے میں کوئی موقعہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا تھا۔ اب ان کے لیے مکہ میں ایک دن گزارنا بھی مشکل تھا۔ اسی وقت اپنے رومی غلام کے ہمراہ خاوند کی تلاش میں روانہ ہوگئیں۔ یہ خاتون جن کا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر پاسِ خاطر تھا کہ آپؐ نے ان کے شوہر کے گھناؤنے ماضی کے باوجود کسی ردّ و قدح کے بغیر ان کی درخواست کو شرفِ پذیرائی بخشا، عکرمہ بن ابو جہل کی اہلیہ حضرت اُمّ حکیمؓ بنتِ حارث مخزومیہ تھیں۔

سلسلۂ نسب و بنیادی معلومات

حضرت اُمّ حکیمؓ کا شمار سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور صحابیات میں ہوتا ہے۔ اہلِ سِیَر نے ان کا ذکر ان کی کنیت ہی سے کیا ہے اور اصل نام نہیں لکھا۔ ان کا تعلق قریش کی مشہور شاخ بنو مخزوم سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

اُم حکیمؓ بنتِ حارث بن ہشام بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم بن یقظہ بن مرہ بن کعب بن لوئی۔

والدہ کا نام فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ تھا جو حضرت خالدؓ بن ولید (سیف اللہ) کی ہمشیرہ تھیں۔

حضرت اُمّ حکیمؓ نے جس گھرانے میں آنکھیں کھولیں وہ کفر و شرک کا گہوارہ تھا۔ ان کے والد ابو عبدالرحمٰن حارث بن ہشام، ابو جہل (عمرو بن ہشام) کے حقیقی بھائی تھے اور دونوں بھائی اسلام کے سخت دشمن تھے۔ یہی حال والدہ اور ماموں خالد بن ولید کا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس ماحول میں ان کا اسلام کے نورِ سعادت سے بہرہ یاب ہونا محال تھا۔ شادی بھی ہوئی تو اپنے چچا ابو جہل کے فرزند عکرمہ سے جو اسلام دشمنی میں اپنے باپ کے دست راست تھے۔

عکرمہ باپ کے نقشِ قدم پر

۲ھ میں ابو جہل غزوۂ بدر میں ذلت کے ساتھ مارا گیا تو عکرمہ نے اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور فتح مکہ تک ہر میدان میں اہلِ حق کو ستانے میں بڑھ بڑھ کر قدم مارتے رہے۔ غزوۂ اُحد میں وہ اپنی اہلیہ (اُمّ حکیم) کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ غزوۂ احزاب میں بنو کنانہ کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کی۔ ۸ھ میں مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنوخزاعہ کے قتل و غارت میں حصہ لیا اور صلح نامۂ حدیبیہ کو عملاً توڑ ڈالا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر بھی انہوں نے چند مشرکین کو ساتھ لے کر اس فوجی دستے کی مزاحمت کی جو حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید کی سرکردگی میں شہر میں داخل ہو رہا تھا۔

یہ وہی خالد رضی اللہ عنہ بن ولید تھے جو اہلِ حق کے خلاف کئی لڑائیوں میں عکرمہ کے شانہ بشانہ لڑ چکے تھے۔ وہ حضرت اُمّ حکیمؓ کے حقیقی ماموں تھے اور رشتہ میں عکرمہ کے بھی چچا ہوتے تھے (عکرمہ کا والد ابو جہل اور خالدؓ بن ولید آپس میں چچا زاد بھائی تھے) فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے حضرت خالدؓ بن ولید مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے لیکن ان کا یہ اقدام بھی عکرمہ کو راہِ راست پر نہ لا سکا۔ اسلام کے خلاف عکرمہ کی یہی سرگرمیاں تھیں کہ انہیں فتح مکہ کے بعد سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے یمن کی طرف بھاگ نکلے۔ ادھر حضرت اُمّ حکیمؓ، ان کے والد حارثؓ بن ہشام اور والدہ فاطمہؓ بنتِ ولید تینوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور صدقِ دل سے اسلام قبول کر لیا۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ شجرِ اسلام کی چھاؤں میں

حضرت اُمّ حکیم کو شوہر سے بے حد محبت تھی انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ عکرمہؓ بدستور کفر و شرک کی دلدل میں پھنسے رہیں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی دردمندی کے ساتھ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے استدعا کی کہ ان کے شوہر کو امان دی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور وہ عکرمہؓ کی تلاش میں ساحل بحر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ادھر حضرت عکرمہ مکہ سے بھاگ کر بحیرۂ قلزم کے ساحل پر پہنچے تو یمن جانے والی ایک کشتی تیار کھڑی تھی اس پر بیٹھ گئے۔ کچھ دور جا کر یہ کشتی بادِ مخالف کی لپیٹ میں آ گئی۔ عکرمہؓ نے لات وعزّیٰ کو پکارنا شروع کر دیا۔ ملاّحوں نے کہا، یہ اللہ کو پکارنے کا وقت ہے۔ لات وعزّیٰ کشتی کو بھنور سے نہیں نکال سکتے۔ یہ بات عکرمہؓ کے دل پر اثر کر گئی۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''اِصابہ'' میں لکھا ہے کہ اس موقع پر عکرمہؓ نے یہ دعا کی:

''اے اللہ میں عہد کرتا ہوں کہ اگر اس طوفان نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں خود کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کر دوں گا۔ وہ بڑے رحیم وکریم ہیں (امید ہے) مجھ سے مواخذہ نہ فرمائیں گے''۔

خدا کی قدرت، کشتی صحیح سلامت اسی جگہ کنارے آ لگی جہاں سے چلی تھی، اسی اثنا میں حضرت اُمّ حکیمؓ بھی شوہر کی تلاش میں ساحل پر آ پہنچی تھیں۔ انہوں نے حضرت عکرمہ کو بتایا کہ میں ایک ایسے انسان کے پاس سے آ رہی ہوں جو سب سے زیادہ نیک اور سب سے زیادہ رحیم وشفیق اور صلۂ رحم کرنے والے ہیں۔ میں نے ان سے تمہارے لیے امان حاصل کر لی ہے اب میرے ساتھ ان کی خدمت میں چلو۔ عکرمہ ﷛ فوراً مان گئے اور حضرت اُمّ حکیمؓ کے ساتھ بارگاہِ رسالتؐ میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور "مرحبا با الراکب المھاجر" (خوش آمدید اے پردیسی سوار) فرما کر اُن کا پُرتپاک استقبال کیا۔ حضرت عکرمہؓ نے بیوی (اُمّ حکیمؓ) کی طرف اشارہ کر کے عرض کی:

''اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے میری جان بخشی کر دی ہے''۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اُس نے سچ کہا ہے تم محفوظ و مامون ہو''۔

عکرمہؓ اس شانِ کرم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت صدقِ دل سے اسلام قبول کر لیا اور عہد کیا کہ آئندہ میری دولت اور جان جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف رہے گی۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ جس شدت سے انہوں نے اسلام کی مخالفت کی تھی، اب اس سے زیادہ جوش کے ساتھ انہوں نے اسلام کی خدمت کی۔ ۱۱ ہجری میں حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ﷛ کے عہدِ خلافت میں فتنۂ ارتداد نے سر اُبھارا تو انہوں نے اس

سے استیصال کے لیے سردھڑ کی بازی لگادی۔

نئے نویلے دولہا کی شہادت

جب اس فتنہ کا قلع قمع ہو گیا اور مسلمانوں نے شام پر چڑھائی کی تو حضرت عکرمہؓ حضرت اُمّ حکیمؓ کو ساتھ لے کر شام کی مہم پر جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ کئی معرکوں میں نہایت جانبازی سے رومیوں کے خلاف جہاد کیا اور بالآخر اجنادین کی لڑائی میں نہایت پامردی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس طرح حضرت اُمّ حکیمؓ عالمِ غربت میں بیوہ ہو گئیں۔

حضرت اُمّ حکیمؓ کے ایامِ عدّت گزر گئے تو ان کو نکاح کے پیغام ملنے شروع ہو گئے۔ ان میں حضرت خالدؓ بن سعید بن عاص کا پیغام بھی تھا۔ اُمّ حکیمؓ نے اور سب پیغام تو رَد کر دیئے البتہ حضرت خالدؓ بن سعید سے نکاح پر رضامندی ظاہر کی۔ حضرت خالدؓ بن سعید بڑے جلیل القدر صحابی تھے وہ سابقون الاوّلون میں سے تھے۔ دو ہجرتوں (ہجرتِ حبشہ اور ہجرتِ مدینہ) سے مشرف ہو چکے تھے اور فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک میں بھی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی کی سعادت حاصل کر چکے تھے اسی لیے حضرت اُمّ حکیمؓ نے انہیں دوسروں پر ترجیح دی۔ چنانچہ چار سو دینار مہر پر ان کا نکاح حضرت خالدؓ بن سعید کے ساتھ مرج الصفہ کے مقام پر ہو گیا۔ یہ جگہ دمشق کے قریب واقع ہے۔ اس وقت اسلامی لشکر دمشق کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔

نکاح کے بعد حضرت خالدؓ بن سعید نے رسمِ عروسی ادا کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضرت اُمّ حکیمؓ نے کہا: ”دشمن سر پر کھڑا ہے اور اس سے ہر وقت لڑائی کا خطرہ ہے اس لیے چند دن توقف کر کے اطمینان سے یہ رسم ادا ہو جائے تو بہتر ہوگا“۔ حضرت خالدؓ بن سعید نے کہا، مجھے اس معرکے میں اپنی شہادت کا یقین ہے۔ اُمّ حکیمؓ خاموش ہو گئیں۔ ایک پُل کے پاس جواَب ”قنطرہ اُمّ حکیم“ کہلاتا ہے رسمِ عروسی ادا ہوئی۔ صبح کو دعوتِ ولیمہ ہوئی۔ ابھی لوگ کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ رومیوں نے حملہ کر دیا۔ ایک قوی ہیکل آدمی سب سے آگے تھا اور مسلمانوں کو للکار رہا تھا۔ حضرت خالدؓ بن سعید تیر کی طرح جھپٹ کر اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور نہایت بہادری سے لڑ کر اس کے ہاتھوں جامِ شہادت پیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی۔

دلہن بپھری شیرنی کی طرح میدانِ جنگ میں

حضرت اُمّ حکیمؓ شوہر کی شہادت کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اسی وقت نہایت جوش سے اُٹھیں ،اپنے کپڑوں کو باندھا اور خیمہ کی چوب اکھاڑ کر لڑائی میں شریک ہوگئیں۔ زخمی شیرنی کی طرح بڑھ بڑھ کر حملے کرتی تھیں اور اپنی چوب سے رومیوں کو مار گراتی تھیں۔ اس معرکہ میں ان کے ہاتھ سے سات رومی جہنم واصل ہوئے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُمّ حکیمؓ یرموک کی ہولناک جنگ میں بھی شریک ہوئیں اور دوسری خواتین کے ساتھ مل کر رومیوں کے خلاف بڑی دلیری سے جنگ کی۔ حضرت اُمّ حکیمؓ کے مزید حالات کتب سیر میں نہیں ملتے۔ نہ کسی نے وفات کا زمانہ بتایا ہے اور نہ اولاد کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

✿✿✿✿

لڑائی میں دشمن کے زبردست دباؤ کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم کئی بار پیچھے ہٹے لیکن عورتوں نے ان کو غیرت دلائی اور خود خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر یا پتھر ہاتھوں میں لے کر رومیوں پر حملہ آور ہو گئیں۔ حضرت ہندؓ رجز پڑھ پڑھ کر مسلمانوں میں جوش پیدا کرتی تھیں۔ اگر کوئی مسلمان لڑائی سے منہ موڑ کر پیٹھ پھیرتا تو اس کے گھوڑے کے منہ پر خیمے کی چوب مار کر غیرت دلاتیں کہ جنت چھوڑ کر جہنم خریدتے ہو اور اپنی عورتوں کو رومیوں کے حوالے کرتے ہو۔ یہ ہندؓ اور دوسری خواتین کی غیرت واستقامت ہی تھی کہ پیچھے ہٹے ہوئے مسلمان پلٹ کر اس زور سے رومیوں پر حملہ کرتے کہ ان کے پرّے کے پرّے کاٹ کر رکھ دیتے۔

ایک موقع پر پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں میں حضرت ابوسفیانؓ بھی تھے۔ ہندؓ نے انہیں دیکھ لیا، اپنے خیمے کی چوب لے کر ان کی طرف لپکیں اور کہا:

"خدا کی قسم تم دینِ حق کی مخالفت کرنے اور خدا کے سچے رسول کو جھٹلانے میں بہت سخت تھے۔ آج موقع ہے رزمگاہ میں دینِ حق کی سربلندی اور رسولِ خدا کی خوشنودی کے لیے اپنی جان قربان کر دو اور خدا کے سامنے سرخرو ہو جاؤ"۔

......☆...

حضرت ہندؓ بنتِ عتبہ

ہندؓ کا کردار حضرت حمزہؓ کی شہادت کے تناظر میں

ہندؓ یا ہندہ نام تھا، اور قریش کے خاندان بنو عبد شمس سے تھیں۔ نسب نامہ یہ ہے۔
ہند بنتِ عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔

عتبہ بن ربیعہ قریش کا معزز ترین سردار تھا۔ ماں کا نام صفیہ بنتِ اُمیہ تھا۔ پہلے فاکہ بن مغیرہ مخزومی سے نکاح ہوا۔ ان سے نباہ نہ ہوسکا تو ابوسفیان بن حرب کے نکاح میں آئیں۔

ہند کا باپ عتبہ بن ربیعہ اور شوہر ابوسفیان اسلام کے سخت دشمن تھے اور ہند بھی اسلام دشمنی میں ان سے کم نہ تھیں۔ ہجرت کے بعد ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس میں ہند کا والد عتبہ قریش کے کئی دوسرے سرداروں کے ہمراہ مارا گیا جن میں ابوجہل بھی تھا۔ اس کے بعد مشرکین مکہ کی قیادت ابوسفیان کے ہاتھ آئی۔ ہندہ نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اپنے شوہر کا ہاتھ بٹایا۔ وہ بڑی شعلہ بیان مقرر تھیں۔ باپ کے قتل نے ان کے دل میں جذبۂ انتقام کے شعلے بھڑکا دیئے تھے۔ ۳ ہجری میں مشرکینِ مکہ نے ابوسفیان کی زیرِ قیادت بڑی تیاری کیساتھ مدینہ پر حملہ کیا اور غزوۂ اُحد پیش آیا۔ ہند خصوصیت سے اپنے باپ کے قاتل حضرت حمزہؓ سے انتقام لینا چاہتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے جبیر بن مطعم کے غلام وحشیؓ کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا۔ وحشی بھالا پھینکنے میں زبردست مہارت رکھتے تھے۔ جب لڑائی کا تنور گرم ہو گیا تو ہند نہایت اشتعال انگیز رجز پڑھ پڑھ کر کفار کو جوش دلا رہی تھیں۔ وحشی گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ حضرت حمزہؓ

جونہی ان کی زد میں آئے انہوں نے اپنا بھالا پھینکا جو حضرت حمزہؓ کے جسم کے پار ہو گیا، اور ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ کفار کی عورتوں نے اس رجلِ عظیم کی شہادت پر مسرت کے گیت گائے۔ ہندہ نے جوشِ انتقام میں حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے جگر نکالا اور چبا گئیں لیکن گلے سے نہ اتر سکا، اس لئے اگلنا پڑا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دردناک واقعہ سے بے حد صدمہ پہنچا۔

ہندؓ دربارِ رسالت مآب ﷺ میں

۸ ہجری میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کیا اور فاتحانہ شان سے دس ہزار صحابہؓ کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتقام لینے سے روک سکتی۔ لیکن رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بدترین دشمنوں کو بھی معاف کر دیا۔ حتیٰ کہ اعلان فرمایا کہ جو شخص ابو سفیانؓ کے گھر میں پناہ لے گا اس سے بھی کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ ابو سفیانؓ نے فتح مکہ سے ایک دو دن پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہندہؓ پر بھی اب اسلام کی صداقت واضح ہو چکی تھی۔ چنانچہ وہ چند برقعہ پوش خواتین کے ہمراہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ اس موقع پر حضور ﷺ اور اُن کے درمیان یہ گفتگو ہوئی:

ہندہؓ: یارسول اللہ! آپ ہم سے کن باتوں پر بیعت لیتے ہیں؟

نبی کریم ﷺ: شرک نہ کرو اور خدا کی وحدانیت کا اقرار کرو۔

ہندہؓ: یہ عہد آپؐ نے مردوں سے نہیں لیا تاہم ہمیں منظور ہے۔

نبی کریم ﷺ: چوری نہ کرو۔

ہندہؓ: میں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ کر ڈالتی ہوں، معلوم نہیں یہ جائز ہے یا نہیں۔

نبی کریم ﷺ: اولاد کو قتل نہ کرو۔

ہندہؓ: ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا (یعنی قتل نہیں کیا تھا) جب بڑے ہوئے تو آپؐ نے قتل کر ڈالا۔

رسولِ کریم ﷺ کا دامنِ کرم بڑا کشادہ تھا۔ ہندہؓ نے اگرچہ آپ ﷺ کے محبوب چچا کا جگر چبایا تھا اور پھر اس موقع پر بھی ایسی بے باکانہ بلکہ گستاخانہ گفتگو کی تھی لیکن رحمت عالم ﷺ نے ان کی تمام خطاؤں کو بخش دیا۔ ہندہؓ کو اپنی جاں بخشی کی اُمید نہیں تھی لیکن جب رحمۃ اللعالمین ﷺ نے انہیں بالکل معاف کر دیا تو ان کے دل کی دنیا یکسر بدل گئی اور وہ صدقِ دل سے مسلمان ہو گئیں۔ اس وقت ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا:

''یارسول اللہ! اس سے پہلے آپ سے بڑھ کر میرے نزدیک کوئی دشمن نہ تھا۔ لیکن آج حضور ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب و محترم نہیں''۔

اس کے بعد گھر جا کر اپنے معبود بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

حضرت ہندؓ کا مجاہدانہ کردار

قبولِ اسلام کے بعد حضرت ہندہؓ کی زندگی یکسر خدمتِ اسلام کے لیے وقف ہو گئی۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں وہ اپنے شوہر حضرت ابوسفیانؓ کے ساتھ شام جانے والے مجاہدین کے لشکر میں شامل ہو گئیں۔ جس جوش و خروش کے ساتھ یہ دونوں میاں بیوی مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوا کرتے تھے اس سے کئی گنا زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کفار کے خلاف جہاد میں حصہ لیا اور اپنے قبولِ اسلام سے قبل کی اسلام دشمنی کا کفارہ ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

شام کی جنگوں میں جنگِ یرموک ایک زبردست اور فیصلہ کن جنگ تھی جس میں قیصرِ روم نے اپنی پوری طاقت جنگ کی آگ میں جھونک دی تھی۔ بعض روایتوں کے مطابق رومی لشکر کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ تھی اور ایک روایت کے مطابق دس لاکھ تھی۔ مجاہدین اسلام کی تعداد صرف تیس اور چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ اس جنگ میں حضرت ہندؓ اور ان کے شوہر ابوسفیانؓ دونوں بڑے جوش و خروش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوئے۔ لڑائی میں دشمن کے زبردست دباؤ کی وجہ سے مسلمانوں کے قدم کئی بار پیچھے ہٹے لیکن عورتوں نے ان کو غیرت دلائی اور خود خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر یا پتھر ہاتھوں میں لے کر رومیوں پر حملہ آور ہو گئیں۔ حضرت ہندؓ رجز پڑھ پڑھ کر

مسلمانوں میں جوش پیدا کرتی تھیں۔ اگر کوئی مسلمان لڑائی سے منہ موڑ کر پیٹھ پھیرتا تو اس کے گھوڑے کے منہ پر خیمے کی چوب مار کر غیرت دلاتیں کہ جنت چھوڑ کر جہنم خریدتے ہو اور اپنی عورتوں کو رومیوں کے حوالے کرتے ہو۔ یہ ہندؓ اور دوسری خواتین کی غیرت واستقامت ہی تھی کہ پیچھے ہٹے ہوئے مسلمان پلٹ کر اس زور سے رومیوں پر حملہ کرتے کہ ان کے پرّے کے پرّے کاٹ کر رکھ دیتے۔

ایک موقع پر پیچھے ہٹنے والے مسلمانوں میں حضرت ابوسفیانؓ بھی تھے۔ ہندؓ نے انہیں دیکھ لیا، اپنے خیمے کی چوب لے کر ان کی طرف لپکیں اور کہا:

''خدا کی قسم تم دینِ حق کی مخالفت کرنے اور خدا کے سچے رسول کو جھٹلانے میں بہت سخت تھے۔ آج موقع ہے رزمگاہ میں دینِ حق کی سربلندی اور رسولِ خدا کی خوشنودی کے لیے اپنی جان قربان کر دو اور خدا کے سامنے سرخرو ہو جاؤ''۔

حضرت ابوسفیانؓ کو سخت غیرت آئی اور پلٹ کر شمشیر بدست دشمن کے ٹڈی دل لشکر میں گھس گئے۔

اسی جنگ میں ایک اور موقع پر رومی عورتوں کی خیمہ گاہ تک آ پہنچے۔ تمام عورتوں نے جن میں حضرت اُمّ ابانؓ، اُمّ حکیمؓ، خولہؓ بنت ازور اور ہندؓ بھی شامل تھیں اپنے خیموں کی چوبیں اکھاڑ کر رومیوں کا منہ پھیر دیا۔ جب تک مسلمانوں کا ایک دستہ ان کی مدد کو نہ آ پہنچا وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتی رہیں اور متعدد رومیوں کو جہنم واصل کیا۔ حضرت ہندؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں امیر معاویہؓ تاریخ اسلام کی نامور شخصیت ہیں۔

جناب ہندؓ کے دیگر اوصاف:

ابن اثیرؒ نے ''اسد الغابہ'' میں لکھا ہے:

''حضرت ہندؓ ایک خوددار، غیرت مند، صائب الرائے اور دانشمند خاتون تھیں''۔

صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ طبعاً نہایت فیاض تھیں۔

شعر وشاعری میں بھی درک رکھتی تھیں۔ غزوۂ بدر میں اپنے بھائی ابوحذیفہؓ کو شعروں

میں ملامت کی۔ اسی طرح غزوۂ اُحد میں شعر پڑھ پڑھ کر مشرکینِ قریش کو لڑائی پر اُبھارتی تھیں۔ جب ان کی زندگی میں انقلاب آ گیا تو اپنے شعروں سے مجاہدینِ اسلام کو کفار کے خلاف جوش دلاتی تھیں۔ اہلِ سِیَر نے ان کے متعدد اشعار نقل کیے ہیں۔

ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ہجرتِ نبویؐ کے بعد جب حضرت زینبؓ بنتِ رسول اللہؐ نے مکہ سے مدینہ جانے کے لیے رختِ سفر باندھا، تو ہندؓ ان کے پاس گئیں اور کہا کہ:

''اے بنتِ محمد (ﷺ)! تم اپنے باپ کے پاس جا رہی ہو اگر کچھ زادِ راہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو بے تکلف کہہ دو میں مہیا کر دوں گی''۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے عداوت رکھنے کے باوجود ان میں رواداری کا فقدان نہیں تھا۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کے فطری جوہر خوب نمایاں ہوئے اور انہوں نے سابقہ زندگی کی تلافی اپنے حسنِ کردار سے کر دی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

❁❁❁❁

حضرت ام ابان رضی اللہ عنہا کو اپنے شوہر کی شہادت کے متعلق علم ہوا تو نہایت گھبراہٹ کے ساتھ لٹکے ہوئے دامنوں میں الجھتی اور ٹھوکریں کھاتی ہوئی ان کی لاش کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہیں دیکھ کر ثواب کی امید میں صبر کر کے سوائے اس جملہ کے اور کچھ زبان سے نہیں نکلنے دیا کہ "آپ کو جو عطا ہوا وہ مبارک ہو۔ آپ رب العالمین کے جوار رحمت اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے پاس چلے گئے۔ اس خداوند عالم کے پاس جس نے ہمیں ملایا تھا پھر جدا کر دیا۔ میں تمہاری مشتاق ہوں۔ خدا کی قسم اس قدر جہاد کروں گی کہ تم سے مل جاؤں کیونکہ نہ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھا اور آرام برتا اور نہ تم نے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔

میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا ہے کہ تمہارے بعد مجھے کوئی مس کرے۔ میں نے اپنی جان کو خداوند تعالیٰ کے راستے میں وقف کر دیا ہے۔ میں تم سے بہت جلد ملوں گی اور مجھے امید ہے کہ یہ کام بہت ہی جلدی ہو جائے گا"۔

کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ صبر کرنے والی عورت کوئی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کے بعد ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

حضرت ام ابانؓ

دولہا نے جامِ شہادت نوش کیا

حضرت ام ابان رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی اجنادین کے مقام پر حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ ابھی آپ کے ہاتھ اور سر سے شب عروسی مہندی اور عطر تک کا اثر زائل نہیں ہوا تھا کہ جنگ دمشق میں حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ کو زہر میں بجھا ہوا تیر آ کر لگا۔ انہوں نے اگرچہ اسے نکال لیا اور زخم پر اپنا عمامہ ہی بندھ لیا تھا۔ مگر انہوں نے اس کے زہر کا اثر اپنے بدن میں محسوس کیا اور الٹے گر پڑے۔ ان کے بھائیوں نے انہیں سنبھالا، لشکر میں اٹھا کر لائے اور ارادہ کیا کہ عمامہ کھول کر علاج کریں مگر حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ نے کھولنے سے منع کیا اور فرمایا کہ اگر اس کو کھول دیا گیا تو میرا دم اسی وقت کھولنے کے ساتھ ہی ساتھ نکل جائے گا۔ خدا کی قسم جو کچھ میں باری تعالیٰ سے مانگتا اور امید کرتا تھا وہ مجھے مل گیا۔ مسلمانوں نے ان کی خواہش کے خلاف اس زخم کو کھولنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائی انگلی سے اشارہ کیا اور کہا:

اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد رسول الله هذا ما وعد الرحمان وصدق المرسلون.

''نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں یہ وہ انعام ہے، جس کا وعدہ رحمان نے کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا''۔

آپ کے منہ سے ابھی یہ جملہ پورا نہیں نکلا تھا کہ روح اس قفس عنصری کو چھوڑ کر عالم بالا میں چلی گئی۔ خداوند تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔

نئی نویلی دولہن دولہا کی میت پر

حضرت ام ابان رضی اللہ عنہا کو اپنے شوہر کی شہادت کے متعلق علم ہوا تو نہایت گھبراہٹ کے ساتھ لٹکے ہوئے دامنوں میں الجھتی اور ٹھوکریں کھاتی ہوئی ان کی لاش کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ انہیں دیکھ کر ثواب کی امید میں صبر کر کے سوائے اس جملہ کے اور کچھ زبان سے نہیں نکلنے دیا کہ ''آپ کو جو عطا ہوا وہ مبارک ہو۔ آپ رب العالمین کے جوار رحمت اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے پاس چلے گئے۔ اس خداوند عالم کے پاس جس نے ہمیں ملایا تھا پھر جدا کر دیا۔ میں تمہاری مشتاق ہوں۔ خدا کی قسم اس قدر جہاد کروں گی کہ تم سے مل جاؤں کیونکہ نہ میں نے تمہیں اچھی طرح دیکھا اور آرام برتا اور نہ تم نے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔

میں نے اپنے اوپر حرام کر لیا ہے کہ تمہارے بعد مجھے کوئی مس کرے۔ میں نے اپنی جان کو خداوند تعالیٰ کے راستے میں وقف کر دیا ہے۔ میں تم سے بہت جلد ملوں گی اور مجھے امید ہے کہ یہ کام بہت ہی جلدی ہو جائے گا''۔

کہتے ہیں کہ ان سے زیادہ صبر کرنے والی عورت کوئی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس کے بعد ان کی تجہیز و تکفین کی گئی۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی قبر مشہور ہے۔

دلہن انتقام کے سفر پر

حضرت ام ابان رضی اللہ عنہا قبر کے پاس بالکل نہیں ٹھہریں بلکہ سیدھی خیمے میں آئیں اسلحہ سے مسلح ہوئیں۔ ڈھاٹا باندھا تلوار ہاتھ میں لی اور ہیئت بدل کر حضرت خالد بن ولید کو بغیر خبر کئے مسلمانوں کے ساتھ لشکر میں شامل ہو گئیں۔ لوگوں سے دریافت کیا کہ میرے شوہر کون سے دروازے پر شہید ہوئے؟ انہوں نے کہا توما نامی دروازے پر (جو ہرقل بادشاہ کے داماد کے نام سے

مشہور ہے) اور اسی نے تمہارے شوہر کو قتل کیا ہے۔تو آپ شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ جو اس دروازے پر مامور تھے، کی فوج کی طرف روانہ ہوئیں اور اس میں مل کر نہایت سختی سے لڑیں۔آپ نہایت اچھی تیر انداز تھیں۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس روز باب تو ما پر توما کے سامنے ایک شخص کو صلیب اٹھائے اور اپنے لشکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ اے خدا! تو صلیب کو اور اس شخص کو جس نے صلیب کی طرف پناہ لی ہے مدد دے۔اے اللہ! ان پر اس کا غلبہ ظاہر کر اور اس کو بلند مرتبہ کر۔

حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ دفعتاً ام ابان رضی اللہ عنہا نے ایک ایسا تیر چلایا کہ خطا کئے بغیر نشانہ پر جا لگا۔اسی وقت وہ صلیب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔ میں نے خود پر چمکتے ہوئے جواہر دیکھے۔مسلمانوں کا ہر شخص اس کے اٹھا لینے کے لئے اپنے بدن کو ڈھالوں سے چھپا کر دوڑا۔ قلعے سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ ہمارے آدمیوں نے صلیب کے اٹھانے کے لئے اس قدر سبقت کی کہ ایک دوسرے پر گرتا پڑتا چلا جا رہا تھا کہ میں پہلے اٹھاؤں۔خدا کے دشمن توما نے جب صلیب اٹھا لینے کے لئے مسلمانوں کی اس قدر کثرت اور عجلت دیکھی تو اسے اپنی ذلت اور خواری کا احساس ہوا اور سمجھ گیا کہ اب ہلاکت قریب ہے۔اس کا کفر اس وقت اور تیز ہوا اور اسے یہ سخت ناگوار گزرا۔ پھر اس نے دل میں غور کیا کہ بادشاہ کو اس کی خبر ضرور ہوگی کہ صلیب اعظم مجھ سے چھین لی گئی اور کچھ دنوں کے لئے اس کے مالک مسلمان ہو گئے۔ یہ سوچ کر اس نے کمر کسی، تلوار اور سپر ہاتھ میں لی اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ جسے میرا ساتھ دینا ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جسے بیٹھنا ہو وہ بیٹھے۔ میں اب ضرور مقابلہ کو نکلوں گا اور دشمن کو دفع کر کے اپنے دل کو آرام دوں گا۔ یہ کہہ کر وہ بہت پھرتی سے نیچے اترا۔ دروازہ کھول دینے کا حکم دیا اور دروازہ کھلتے ہی سب سے پہلے میدان میں نکلا۔رومی اس کی شجاعت، مردانگی اور دانشمندی اور شدت حملہ سے خوب واقف تھے۔اس لئے بعض تیر کمان اور بعض ڈھال اور تلوار لئے ہوئے ٹڈی دل کی طرح اس کے پیچھے پیچھے نکل پڑے۔مسلمانوں نے ایک دوسرے کو متنبہ کیا اور جب رومیوں کو آتے دیکھا تو صلیب حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی اور خود ان کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ دشمن کی طرف بڑھے اور اگرچہ دروازہ کے اوپر سے

تیر اور پتھر کافی مقدار میں برس رہے تھے مگر پھر بھی رومیوں پر پل پڑے۔

حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے آواز سے کہا: ''یامعاشر المسلمین! دروازے کے سامنے سے پیچھے ہٹ کر لڑو تا کہ دشمن کے پتھر اور تیروں سے محفوظ ہو جاؤ''۔ یہ سن کر مسلمان پیچھے ہٹے اور اس طرح دشمن کے شر سے محفوظ ہو گئے۔ جس وقت یہ پیچھے ہٹے تو خدا کے دشمن توما نے دائیں بائیں لڑتے مارتے ان کا تعاقب کیا۔ بہادرانِ روم اس کا حلقہ کئے ہوئے تھے اور وہ ایک مست اونٹ کی طرح جھوم رہا تھا۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے جب اس کی یہ حالت اور مشرکوں کا غلبہ دیکھا تو اپنی قوم کو خطاب کر کے کہنے لگے'' معاشر الناس! بہشت کے طلب کرنے کے لئے اپنی موت کو بھول جاؤ اپنے خالق کو راضی کر لو اور یاد رکھو وہ بھاگنے یا پیٹھ دکھانے سے راضی نہیں ہوتا۔ بڑھو حملہ کرو اور ان میں گھس جاؤ۔ خداوند تعالیٰ برکت دیں گے''۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے یہ سنتے ہی اس بے جگری کے ساتھ حملہ کیا کہ ایک جماعت دوسری میں گھس گئی۔ خدا کا دشمن توما صلیب کی تلاش میں تھا۔ اسے حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے پاس دیکھتے ہی بے صبری کے عالم میں تلوار نکال کر آپ کی طرف بڑھا۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر صلیب کو ہاتھ سے پھینک کر تلوار ہاتھ میں لی۔ سپر سینہ کے برابر کی اور مقابلے میں ڈٹ گئے۔ توما نے آپ پر پوری طرح حملہ کیا مگر جس وقت صلیب کو زمین پر پڑے دیکھا تو اپنے آدمیوں کو آواز دی اور وہ اس کی کمک کے لئے آ موجود ہوئے۔ ادھر حضرت ام ابان رضی اللہ عنہا نے جس وقت حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ پر توما کو حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو دریافت کیا۔ ''یہ اپنے نفس کو ذلیل کرنے والا کون ملعون شخص ہے''؟ مسلمانوں نے کہا'' یہی ہے وہ بادشاہ کا داماد اور آپ کے شوہر کا قاتل''۔

ام ابان رضی اللہ عنہا یہ سنتے ہی اس کی طرف جھپٹیں اور جس وقت اس کے قریب پہنچیں تو تیر کو چلہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ چھوڑ دیں رومی ان کے قریب پہنچ گئے۔ ارادہ کیا کہ انہیں گزند پہنچائیں مگر آپ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور بسم اللہ وعلیٰ برکۃ رسول اللہ کہہ کر نشان پر تیر چھوڑا۔ توما قریب تھا کہ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جائے کہ اوپر سے یہ تیر آیا جو اس کی دائیں آنکھ میں اترتا چلا گیا۔ تیر کھاتے ہی یہ چلاتا ہوا پیچھے مڑا۔ ادھر حضرت ام ابان

رضی اللہ عنہا نے دوسرے تیر کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کچھ رومی ان کی طرف لپکے اور بعض نے خدا کے دشمن توما کو ڈھالوں کی پناہ میں لے لیا۔ مسلمان بھی یہ دیکھ کر حضرت ام ابان رضی اللہ عنہا کی حفاظت کے لئے اس طرف بڑھے اور جس وقت یہ دشمنوں کے شر سے محفوظ ہو گئیں تو پھر حسب ذیل اشعار پڑھ پڑھ کر تیر برسانے لگیں:

''اے ام ابان! تو اپنا بدلہ لے اور ایک پہنچنے والا حملہ کر۔ تیرے تیروں سے رومیوں میں شور ہو گیا ہے۔ میں نے قسم کھالی ہے کہ میں اب لڑائیوں سے ہی بات کروں گی میں اب تمہیں چھوڑ کر عیش نہیں کروں گی''۔

انہوں نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے پھر ایک تیر مارا جو ایک رومی کے سینے پر لگا وہ چکرا کر زمین پر گرا تھا ہی کہ دوسرا پھر اس کی گردن پر پڑا۔ رومی اوندھا ہوا اور مر گیا۔ خدا کا دشمن توما پہلا تیر کھاتے ہی اونٹ کی طرح بلبلاتا اور چلاتا ہوا بھاگا۔ دروازے کے قریب آیا اور قلعے میں گھس گیا۔

ام ابان رضی اللہ عنہا نے اپنی بہادری اور دلیری سے توما کو میدان جنگ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اور کفار پر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان مرد ہی نہیں ان کی عورتیں بھی تم پر بھاری ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

فتوح الشام (اردو) سے ماخوذ

شیر اسلام حضرت ضرار ؓ دشمن کی قید میں تھے اور درد بھرے لہجے میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

''اے مخبر! میری قوم اور خولہ کو یہ خبر پہنچا دے کہ میں قیدی ہوں اور مشکوں میں بندھا ہوا ہوں، کافر بے دین میرے گرد جمع ہیں اور تمام زرہ پہنے ہوئے ہیں۔ اے دل! غم وحسرت کی وجہ سے مر جا اور اے جواں مردی کے آنسو! میرے رخسار پر بہہ جا''۔

حضرت خولہؓ بھائی کی آواز پہچان چکی تھیں۔ انہوں نے زور زور سے بھائی کی فریاد کا جواب دیا اور کہنے لگیں:

''تیری دعا قبول ہوگئی۔ اللہ کی مدد آ گئی۔ میں تیری بہن خولہ ہوں''۔

یہ کہہ کر انہوں نے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دیگر مسلمان بھی تکبیر کہتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمانوں کی تکبیروں کی وجہ سے ان کے گھوڑے بھی خوشی کے مارے ہنہنا رہے تھے۔

ایک ہی گھنٹے میں سب کافر واصل جہنم ہو چکے تھے۔ حضرت ضرار ؓ رسیوں میں جکڑے میدان میں کھڑے تھے، حضرت خولہؓ نے آگے بڑھ کر بھائی کو سلام کیا اور اپنے دلیر ہاتھوں سے بھائی کو کافروں کی باندھی ہوئی رسیوں سے آزاد کر دیا۔ سلام عرض کرنے کے بعد ایک لمبا نیزہ بھائی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اور پھر دونوں بہن بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک نئے عزم کے ساتھ پرچم اسلام کو سربلند کرتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنے لگے جہاں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک نیا میدان سجنے والا تھا۔

حضرت خولہ بنت ازورؓ

ابن عائشہ

مدینہ کے اردگرد پھیلے ہوئے طویل قامت کھجور کے درختوں کی اوٹ سے نکلتا ہوا سورج بڑا سہانا منظر پیش کر رہا تھا۔ آج سورج جیسے روشنی کے ساتھ ساتھ خوشبو بھی بکھیر رہا ہے، مدینۃ النبیؐ کی گلیوں میں معمول سے کئی گنا زیادہ بھیڑ نظر آ رہی ہے۔ مسجد نبوی کا صحن آنے والوں سے کھچا کھچ بھر چکا ہے لیکن دور دور تک اڑتی ہوئی غبار، گھوڑوں کے ہنہنانے اور اونٹوں کے دوڑنے کی آوازیں اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ آنے والوں کا سلسلہ ابھی بند نہیں ہوا۔ ہر آنے والے قافلے نے اپنے ساتھ اپنے قبیلے کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ اور ہر آنے والے قافلے کا سربراہ مسجد میں داخل ہو کر اپنی آمد سے مطلع کرتا اور اپنے ہمراہیوں کو باہر بیٹھنے کی تلقین کرتا۔

مسجد نبوی کے باہر گلیوں میں نئے آنے والوں کے بیٹھنے کے لئے انتظامات شروع ہو گئے۔ مدینہ کے مہمان نواز باسی اپنے آنے والے مہمانوں کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے تھے۔ چاشت کا وقت ہونے تک مسجد نبوی ﷺ کے اندر اور باہر بیٹھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ ہر کوئی اب ٹکٹکی باندھے منبر رسول ﷺ کی طرف متوجہ تھا کہ امیر المومنین اس کے لئے کیا حکم جاری کرتے ہیں؟؟

.....☆.....☆.....☆.....

یہ سنہ ۱۲ھ کا تذکرہ ہے۔ جب امیر المومنین سیدنا صدیق اکبر ﷛ نے نبوت کے جھوٹے

دعویدار مسلم کذاب کی سرکوبی کے بعد ملک شام پر پرچم اسلام لہرانے کا ارادہ کیا اور اسلام کے شیر دل جوانوں کی تلواروں کا رخ رومیوں کی طرف موڑنے کا عزم کیا اور اپنے ارادے سے صحابہ کرامؓ کو مطلع کیا اور فرمایا:

''آپ حضرات کو معلوم ہے رسول اللہ ﷺ پیغام حق کو ملک شام تک پہنچانے کے لئے وہاں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر جرار روانہ کرنا چاہتے تھے لیکن اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو اپنی طرف بلا لیا۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں مسلمانوں کو ان کے اہل وعیال کے ساتھ ملک شام کی طرف متوجہ کروں تا کہ آپ ﷺ کی خواہش کے مطابق وہاں کفر کے باطل نظام کو ختم کر کے حق کے پرچم کو لہرایا جاسکے''۔

رسول اللہ ﷺ کے بلا فصل خلیفہ کی گفتگو سن کر سب نے عرض کیا:

''رسول اللہ ﷺ کے جانشین! آقا کی خواہش پر ہم اپنا سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں، آپ ہمیں جہاں بھی حکم کریں گے ہم جانے کے لئے تیار ہیں''۔

یہ سن کر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور ایک خط کے ذریعے تمام مسلمانوں کو اس جہادی لشکر میں شرکت کی دعوت دی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ امیر المومنین کا یہ جہادی خط لے کر مختلف قبائل کی طرف گئے اور انہیں یہ خط پہنچایا جس کے آخر میں امیر المومنین نے یہ آیت تحریر کی تھی:

انفروا خفافا وثقالا وجاهدوا باموالكم وانفسكم في سبيل الله

......☆......☆......☆......

آج مدینۃ النبیؐ میں آنے والے یہ قافلے امیر المومنین کے اسی خط کا جواب بن کر آئے ہیں۔ جانشین پیغمبر ﷺ منبر پر تشریف لا چکے ہیں۔ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ بھی ان کے ہمراہ ہیں۔ ابھی وہ منبر پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ ان سمیت پورے مجمع کی توجہ مدینہ میں داخل ہونے والے اس قافلے کی طرف اٹھ گئی جو نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا، گھوڑوں کو کداتا ہوا، غبار اڑاتا ہوا، پُرجوش انداز میں یہ اشعار پڑھتا ہوا آ رہا تھا:

الحرب عادتنا والضرب همتنا

وذو الكلاع عندي بالرتب

قدم کتائبنا فالروم بغتنا
والشام مسکننا بالرغم للصلب
دمشق لنا دون الناس اجمعهم
وساکنیها نولیهم الی العطب

(ہماری عادت لڑائی کی ہے اور ہمت ہی مرنے مارنے کی ہے اور سب پر ذوالکلاع سردار ہے، ہمارا لشکر آ چکا ہے اور ملک روم ہمارا مطلوب و مقصود ہے اور شام ہمارا مسکن ہے اگر چہ عیسائی اس کو برا مانیں۔ دمشق ہمارا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو ہم ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیں گے)

کسی نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے قریب آ کر بتایا:

''یہ قبیلہ حمیر کے لوگ ہیں جو بمع اہل وعیال جہاد کے لئے آئے ہیں......!''

امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے مسکرا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھا:

''سنا آپ نے......؟''

علی کرم اللہ وجہہ کا چہرہ بھی خوشی سے چمک رہا تھا۔ دراصل دونوں حضرات کو اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت یاد آ گئی کہ ''جب قبیلہ حمیر کے لوگ اپنے اہل وعیال کے ساتھ جہاد کے لئے آئیں گے تو یہ خوشخبری ہے اللہ رب العزت کی نصرت اور مدد کی''۔

......☆......☆......☆......

قبیلہ بنی مراد کے لوگ بھی جنگی اشعار پڑھتے ہوئے مدینہ میں داخل ہو چکے تھے اور وہ کہہ رہے تھے ہمارا لشکر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہے۔ آپ ہمیں حکم دیں ہم رومیوں کو حمائل شدہ تلواروں سے تباہ کر دیں گے۔

قبیلہ طے اور قبیلہ دوس کے لوگ بھی مجمع میں کھڑے رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس قبیلہ میں ایک شخص کو دیکھ کر چہرے پہ مسکراہٹ آ گئی اور جو کمان لٹکائے اور ترکش لئے ہوئے تیار کھڑا تھا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا:

''ابو ہریرہ! تم بھی چلے آئے؟ حالانکہ تم لڑائی کے فن سے آشنا نہیں''۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اے صدیق! جہاد کا ثواب کمانے کا ارادہ ہے۔ آقا ﷺ کی خواہش اور اس کے جانشین کے حکم کو دیکھتے ہوئے اب گھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ آقا ﷺ کے پیغام کو ملک شام میں پہنچانے میں ابو ہریرہ کسی سے پیچھے کیوں رہے گا۔ میں نے اللہ رب العزت کے جہاد والے حکم کو آقا ﷺ کی زبان مبارک سے سنا ہے۔ پھر میں عورتوں کی طرح گھر کی زینت کیوں بنا رہوں گا؟ اور پھر میں نے شام کے سرسبز علاقوں کے میوے بھی تو کھانے ہیں!''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا جواب سن کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ ہنس پڑے اور آپ کو شام کی طرف جانے والے لشکر کے ساتھ شامل فرما دیا۔

......☆......☆......☆......

مدینہ منورہ اب اللہ کے شیروں سے بھر چکا تھا۔ تکبیر کے بلند ہونے والے نعروں سے ہر سو ایک زلزلہ بپا ہے۔ اسلام کے سپاہی جانشین پیغمبر ﷺ کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ شوق و ذوق، عزم و جزم، ایمان و ایقان، رفعت و عظمت، شجاعت و بسالت، ایثار و قربانی کی عجیب منظر ہے۔

تلواروں کی براقت، کمانوں کی کھٹ کھٹاہٹ، نیزوں کی چر چراہٹ، زرہوں کی چمک دمک، اونٹوں اور گھوڑوں کی شوخیوں نے مدینہ میں عجب سماں باندھ دیا ہے کہ ہر دیکھنے والا یہ گواہی دے رہا ہے کہ:

اُولٰئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ   یہی اللہ کی فوج ہے

جب شہر میں جگہ تنگ پڑ گئی تو لوگوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ اب لشکر کو روانہ کر دیا جائے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے فرمایا، آپ حضرات کو تکلیف دینا مقصود نہیں بلکہ انتظار ہے کہ جانے والے سب آ جائیں اور پھر جب انہیں بتایا گیا کہ جنہوں نے اس لشکر میں جانا ہے وہ سب آ گئے ہیں۔ تو امیر المومنین رضی اللہ عنہ شام کی طرف کوچ کرنے والے اس لشکر کو لے کر پیادہ پا اپنے ساتھیوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ کے ہمراہ مدینہ سے باہر نکل آئے اور لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔

اللہ کے شیروں کی تکبیروں سے پہاڑ گونج رہے تھے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ایک

بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر جانے والے لشکر کو الوداع کہہ رہے تھے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے اللہ کے ان سپاہیوں کو دیکھ کر امیر المومنین ﷺ بار بار اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ لشکر کے ذمہ داروں کو ہدایات بھی جاری فرما رہے تھے۔ امیر المومنین ﷺ کو پیدل چلتے دیکھ کر یزید بن سفیان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ! ہمیں حیا آتی ہے اور اللہ کے غضب سے ڈرتے ہیں کہ آپ پیدل چلیں اور ہم سوار ہوں۔ یا آپ بھی سوار ہو جائیں یا ہم اتر کر پیدل چلنا چاہتے ہیں"۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"نہیں! تم اترو، نہ میں سوار ہوں گا۔ ہاں! میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کچھ پیدل چلوں تاکہ میرے گناہ معاف ہو جائیں"۔

لشکر اسلام روانہ ہو گیا تو امیر المومنین مدینہ کے باہر دیر تک کھڑے ان کے لئے دعا کرتے رہے اور پھر واپس مدینہ کی طرف لوٹے جہاں ملک فارس کی طرف جانے والے اسلام کے شیران کے منتظر تھے۔

امیر المومنین ﷺ پھر منبر رسول اللہ ﷺ پر بیٹھ کر فارس کی طرف جانے والے لشکر کو ترتیب دینے لگے۔ مگر ابھی انہیں منبر پر بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک نوجوان نے جس کے جسم پر سجا ہوا خوبصورت جنگی لباس پورے لشکر کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا، امیر المومنین ﷺ کے پاس آ کر ان کے کان میں کوئی سرگوشی کی۔

اس خوبصورت جنگی لباس والے نوجوان کی بات سن کر امیر المومنین کے چہرے پر خوشی کے آثار واضح نظر آنے لگے۔ انہوں نے اس خوش خبری کو زیادہ دیر تک لشکر اسلام سے مخفی رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور کھڑے ہو کر سپاہ اسلام سے مخاطب ہوئے:

"اے اسلام کے جانبازو! آپ کو معلوم ہے کہ یہ لشکر لیلیٰ اور ملک فارس کی طرف روانہ ہونے والا ہے جہاں آپ کا مقابلہ ایسے دشمنان اسلام سے ہو گا جنہوں نے اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے آج وہ خود اسلام کے شیروں کے ہاتھوں نیست و نابود ہونے والا ہے۔ آج آپ کو ایک ایسے امیر لشکر کے ساتھ فارس کی طرف روانہ کر رہا

ہوں جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔ فتح و کامرانی نے ہمیشہ اس کے قدم چومے ہیں۔ میری مراد ابو سلیمان خالد بن ولید ہیں جو جنگوں میں آقاﷺ کے ساتھ شریک تھے"۔

خالد بن ولید ؓ کا نام سن کر پورے مجمع میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرف سے تکبیر کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔

......☆......☆......☆......

مدینہ سے روانہ ہو کر یہ لشکر ابھی دمشق پہنچا ہی تھا کہ دشمنان اسلام سے مڈھ بھیڑ ہو گئی اور کئی روز تک خون ریز جنگی معرکہ جاری رہا۔ مسلمانوں کی چمکتی ہوئی تلواریں کافروں کے سروں کو ان کی گردنوں سے جدا کرتی رہیں۔

اسی معرکہ کے دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ میدان میں یہ شعر پڑھتے ہوئے نظر آرہے تھے:

"ہم کفار کی جمعیت کو تباہ کر دیں گے اور اپنے نیزے کی پیاس کو رومی سرداروں کے خون سے بجھائیں گے۔"

کافروں کی کمک پہنچ چکی تھی۔ دشمن کا ٹڈی دل لشکر پہاڑوں سے اتر آیا تھا۔ لیکن اسلام کے یہ شیر کب دشمن کی تعداد سے مرعوب ہونے والے تھے۔

اللہ کے ایک اور شیر حضرت ضرار ؓ فرما رہے تھے:

"خدا کی قسم میں تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں برابر لڑوں گا اور کبھی میری پشت کو بھاگتے ہوئے نہیں دیکھیں گے"۔

......☆......☆......☆......

ضرار رضی اللہ عنہ شوقِ شہادت میں بے تاب ہو کر ننگے بدن گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر دشمن کی تاک میں کھڑے ہیں۔

ایک لمبا نیزہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جب دشمن کا لشکر قریب آیا تو انہوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور دشمن کے سینہ اور قلب پر حملہ کر دیا اور جو بھی آگے بڑھا اسے جہنم واصل کر دیا۔

اللہ کے شیروں کے ان کارناموں کو دیکھ کر دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ ان کی صلیب

زمین پر مجاہدین کے گھوڑوں کے سموں تلے روندی جا رہی تھی۔

اسی اثناء میں جب رومی لشکر کا سردار داردن میدان چھوڑ کر بھاگ رہا تھا تو ضرار رضی اللہ عنہ نے اس کو پکڑنے کے لئے تعاقب کیا۔ اور پھر آپ اس کے تعاقب میں بہت دور تک نکل گئے۔ یہاں تک کہ آپ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مگر اس حالت میں بھی آپ دائیں بائیں آگے پیچھے تلوار چلا رہے تھے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے:

اِنّ اللّٰہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہٖ صفًّا کانھم بنیان مر صو ص.

اچانک واردن کے بیٹے حمرہ نے ان کے قریب آ کر تیر پھینکا جو آپ کے بازو میں لگا اور آپ زخمی ہو گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے بپھرے ہوئے شیر کی طرح اس کو ایسا نیزہ مارا کہ وہ زمین بوس ہو گیا۔ مگر اگلے ہی لمحے آپ مکمل طور پر آدمیوں کے شکنجے میں آ چکے تھے۔

......☆......☆......☆......

پورا لشکر اسلام ضرار رضی اللہ عنہ کی گرفتاری پر غمگین اور پریشان تھا۔ صحابہ کرام حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو چھڑانے کے لئے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ اچانک یہ خبر خالد بن ولید ؓ تک پہنچی۔ یہ سنتے ہی انہوں نے لشکر اسلام کو کہا کہ گھوڑوں کو ایڑی لگا کر تیز چلو اور نیزوں کو سیدھا رکھو اور جب دشمن ملے تو یکبار حملہ کرو۔ اگر دشمن نے ضرارؓ کو شہید کر دیا تو بخدا ہم ان سے بھرپور انتقام لیں گے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ اللہ ہمیں ضرار کے متعلق صدمہ نہیں دیں گے۔

خالد ؓ رجزیہ اشعار ترنم کے ساتھ پڑھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک خوبصورت عمدہ گھوڑے پر سوار ایک شخص پر پڑی جس کے ہاتھ میں لمبا چمکدار نیزہ تھا۔ اس کے چلنے پھرنے سے بہادری دانائی اور جنگی مہارت نمایاں تھی۔ اس نے زرہ کے اوپر پورا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پورا بدن اور منہ چھپایا ہوا تھا۔

حضرت خالد ؓ ابھی اس کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ اسی دوران لشکر اسلام کفار کے قریب جا پہنچا۔ لوگوں نے اس شہسوار کو رومیوں پر ایسا کرتے دیکھا جس طرح باز شکار پر جھپٹتا ہے۔ اس نے دشمن کے مقتولین کے ڈھیر لگا دیئے اور بڑھتے بڑھتے لشکر روم میں گھستا چلا گیا۔ وہ کوندتی ہوئی بجلی تھی کہ آناً فاناً چند نوجوانوں کے سروں پر گرتی ہوئی چمکتی، دو چار کو بھسم کر

کے پانچ سات کے بدن پر گر کے پھر اسی جگہ نمودار ہوتی۔ پورا لشکر اسلام اس خوبصورت عربی گھوڑے پر سوار نوجوان کی جرأت و جوانمردی پر حیران تھا۔

پھر عمومی حملہ ہوا حضرت خالد ؓ لشکر کے آگے کھڑے ہیں کہ اچانک وہی سوار نظر آیا، مگر اس حال میں کہ خون میں لت پت ہے اور اس کا گھوڑا پسینے میں شرابور ہے۔ اس نوجوان کے سامنے رومیوں کا کوئی بھی سپاہی مقابلہ کے لئے آتا تو پشت دکھاتا اور بھاگتا ہوا نظر آتا، کفار بار بار اس نوجوان کو گھیرنے کی کوشش کرتے۔ یہ دیکھ کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حملہ کر کے اس نوجوان کے گرد سے کفار کے گھیرے کو توڑا اور وہ لشکر اسلام میں واپس پہنچ گیا۔ حضرت خالد ؓ نے نوجوان سے کہا:

"تم نے اپنے غصہ کو اللہ کے دشمنوں پر صرف کیا اور فی سبیل اللہ بڑا جہاد کیا۔ ذرا بتاؤ تم کون ہو؟

مگر اس سوار نے کچھ نہیں بتایا اور پھر جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔

یہ دیکھ کر حضرت خالد ؓ نے دوبارہ فرمایا:

"اللہ کے بندے تو نے مجھ سمیت سب مسلمانوں کو بے چینی میں مبتلا کر رکھا ہے اور خود اس قدر بے پرواہ ہے"۔

اس اصرار پر پردہ کی حالت میں نقاب کی پیچھے سے نسوانی لہجے میں آواز آئی:

"میں ایک عورت ذات ہوں۔ مجھے میرے درد دل نے اس میدان میں اترنے پر مجبور کیا۔ میں ضرار کی بہن خولہ بنت ازور ہوں"۔

......☆......☆......☆......

حضرت خالد ؓ نے تمام لشکر کو جمع کیا اور حضرت خولہ کی بہادری اور جرأت کی داستان سنائی اور خولہ کے درد سے پورے لشکر کو آگاہ کیا۔

پورا لشکر اسلام ضرار کی گرفتاری اور بھائی کی رہائی کیلئے خولہ کی داستان سن کر رو رہا تھا اور ہر سپاہی یہ عہد کر رہا تھا کہ ضرار کی رہائی کے لئے خون کے سمندروں سے گزر کر بھی اس مقام تک پہنچیں گے جہاں اسلام کا یہ شیر پابند سلاسل ہے۔

مسلمانوں نے کفار پر متحد ہو کر ایک بڑا حملہ کیا اس حملہ میں بھی حضرت خولہ پیش پیش تھیں اور کفار کی صفوں کو تتر بتر کرتی ہوئی اس کے قلب تک پہنچ گئیں اور زور زور سے پکارتی تھیں:

''یاثرات ضرار''......(ضرار کا بدلہ)

اور یہ شعر بار بار پڑھ رہی تھیں:

این الضرار لا اراہ یومی

ولا یراہ معشری وقومی

''ضرار کہاں ہیں؟ میں آج انہیں نہیں دیکھتی ہوں اور نہ آج ان کو میرا خاندان اور قوم دیکھتی ہے''۔

مسلمان بہن کی اس فریاد پر اشک بہار ہے تھے لیکن ان کی تلواریں برابر کفار سے برسر پیکار تھیں۔ وقت زوال تک گھسان کی جنگ جاری رہی مگر ضرار کا کہیں کوئی سراغ نہ ملا۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا بھائی کو یاد کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں:

''میرے بھائی! کاش مجھے یہ خبر ہوتی کہ آیا تمہیں جنگل میں ڈال دیا گیا ہے یا کہیں ذبح کر ڈالا ہے، تمہاری بہن تم پر قربان۔ بھائی! واللہ تم نے اپنی بہن کے دل میں ایک ایسی سلگتی ہوئی چنگاری چھوڑی ہے جس کے شرارے کبھی ٹھنڈے نہیں ہوں گے۔ تم اپنے والد جو آقا ﷺ کے سامنے شہید ہوئے تھے جا ملے ہو۔ میری طرف سے تمہیں قیامت تک سلام پہنچتا رہے''۔

مسلمان حضرت خولہ کے یہ الفاظ سن کر بہت روئے اور ان میں جوشِ انتقام مزید بھڑک اٹھا۔

......☆......☆......☆......

مسلمان اب بھرپور حملہ کے لئے تیار کھڑے تھے کہ کفار کی صفوں سے کچھ سوار لفون، لفون یعنی امان امان پکارتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہیں امان دے دو اور میرے پاس لے آؤ۔ پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

''ہم واردن کے فوج کے سپاہی اور حمص کے رہنے والے ہیں''۔

''کیا چاہتے ہو؟''

''ہم صلح چاہتے ہیں''۔

حضرت خالد ﷛ نے فرمایا:

''صلح تو حمص میں پہنچ کر ہی ہوگی، البتہ تمہیں امان ہے۔ لیکن تم ہیں یہ ضرور بتلاؤ گے کہ ہمارا ایک بہادر نوجوان جس نے تمہارے سردار کے بیٹے کو قتل کیا تھا اور وہ اس وقت تمہاری فوج کی قید میں ہے۔ اس کے متعلق بتاؤ کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟''

انہوں نے جواب دیا:

''شاید آپ اس نوجوان کی بات کر رہے ہیں جو ننگے بدن تھے۔ جنہوں نے ہمارے بہت سے آدمیوں کو اور سردار کے بیٹے کو بھی قتل کیا''

حضرت خالد ﷛ نے فرمایا:

''ہاں! وہی نوجوان۔ ہمیں جلدی سے اس کے متعلق بتاؤ۔ اسے اس وقت کہاں رکھا گیا ہے؟''

انہوں نے کہا کہ واردن نے اسے قید کر کے اپنی شجاعت دکھانے کیلئے اپنے بادشاہ کے پاس حمص روانہ کر دیا ہے۔

یہ سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ حضرت رافع ﷛ کو بلایا اور فرمایا ''تم راستوں سے اچھی طرح واقف ہو اپنی مرضی کے جوانوں کا انتخاب کرو اور حمص پہنچنے سے پہلے ضرار کو دشمن کی قید سے چھڑاؤ''۔

حضرت رافع ﷛ نے ایک سو نوجوان جو لشکر اسلام میں سب سے زیادہ بہادر تھے اور ان کے پاس صحت مند گھوڑے تھے ان کا انتخاب کیا اور حمص کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ پہلے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو اس لشکر کے ساتھ روانہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن جب ان کا اصرار بڑھا تو انہیں بھی اجازت دے دی۔

......☆......☆......☆......

یہ لشکر سرپٹ گھوڑے دوڑاتا ہوا سلمہ کے مقام پر پہنچا تو حضرت رافع رضی اللہ عنہ دشمن

کے لشکر کو دیکھ کر ایک دوسری پہاڑی سے آگے بڑھ کر دشمن کے راستے میں تاک لگا کر بیٹھ گئے۔
اسی دوران دشمن کا لشکر غبار اڑاتا ہوا دکھائی دیا۔ مسلمان حملہ کے لئے بیدار تھے۔ جبکہ شیر اسلام حضرت ضرارؓ دشمن کی قید میں تھے اور درد بھرے لہجے میں یہ اشعار پڑھ رہے تھے:
''اے مخبر! میری قوم اور خولہ کو یہ خبر پہنچا دے کہ میں قیدی ہوں اور مشکوں میں بندھا ہوا ہوں، کافر بے دین میرے گرد جمع ہیں اور تمام زرہ پہنے ہوئے ہیں۔ اے دل! غم وحسرت کی وجہ سے مر جا اور اے جواں مردی کے آنسو! میرے رخسار پر بہہ جا''۔
حضرت خولہؓ بھائی کی آواز پہچان چکی تھیں۔ انہوں نے زور زور سے بھائی کی فریاد کا جواب دیا اور کہنے لگیں:
''تیری دعا قبول ہوگئی۔ اللہ کی مدد آ گئی۔ میں تیری بہن خولہ ہوں''۔
یہ کہہ کر انہوں نے زور سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور دیگر مسلمان بھی تکبیر کہتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمانوں کی تکبیروں کی وجہ سے ان کے گھوڑے بھی خوشی کے مارے ہنہنا رہے تھے۔
ایک ہی گھنٹے میں سب کافر واصل جہنم ہو چکے تھے۔ حضرت ضرارؓ رسیوں میں جکڑے میدان میں کھڑے تھے، حضرت خولہؓ نے آگے بڑھ کر بھائی کو سلام کیا اور اپنے دلیر ہاتھوں سے بھائی کو کافروں کی باندھی ہوئی رسیوں سے آزاد کر دیا۔ سلام عرض کرنے کے بعد ایک لمبا نیزہ بھائی کے ہاتھ میں تھما دیا۔
اور پھر دونوں بہن بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک نئے عزم کے ساتھ پرچم اسلام کو سربلند کرتے ہوئے اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنے لگے جہاں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ایک نیا میدان سجنے والا تھا۔

❀❀❀❀

(حضرت خولہ بنت ازورؓ کی بے پناہ جرأت وشجاعت اور جنگجوئی کے مفصل واقعات کے لئے فتوح الشام کا اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب)

ذریعہ بنت حارث اور چند دیگر خواتین

قثامہ رضی اللہ عنہ بن اشیم قبیلہ کنانہ کے تھے۔ آپ تلوار اور نیزہ لے کر مسلمانوں کے آگے ہوکر کفار کی نیزہ اور شمشیر دونوں سے تواضع کر رہے تھے اور رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔

ساھمل فی الروم الکلاب النوابح
واضربھم ضربًا بحد الصفائح
وارضی رسول اللّٰہ خیر مومل
نبی الھدی المبعوث للدین ناصح

''میں بھونکنے والے رومی کتوں پر بہت جلد حملہ کروں گا اور میں ان کو چوڑی تلواروں سے مار مار کر گراؤں گا۔ میں رسول اللہ ﷺ کو جو بہترین امید گاہ اور نبیٔ ہدیٰ اور امت کے خیر خواہ ہیں خوش کرلوں گا''۔

آپ رضی اللہ عنہ کی تین تلواریں ٹوٹ گئیں اور جب تلوار یا نیزہ خراب ہو جاتا تو آپ فرماتے کہ کوئی شخص ہے جو مجھے اللہ کے راستے میں تلوار عاریۃً دیدے اور اس کا اجر حاصل کرے۔ پھر قثامہ نے اپنی قوم کو پکارا، صبر کی تلقین کی۔ قوم لبیک کہہ کر میدان میں آئی اور اس طرح سخت جنگ ہوئی کہ باید وشاید۔ قناطر کی فوجیں اور مسلمان ایک دوسرے میں رل مل گئے۔ اتنے میں سیف اللہ خالد رضی اللہ عنہ آئے اور رومیوں کو کاٹنا شروع کیا۔ بے تحاشا لوگوں کو مارا مگر رومی اتنے زیادہ تھے کہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کوئی قتل بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ آپ کے ساتھ دو ہزار کا لشکر تھا۔ بڑی کوشش کے بعد

میدان صاف ہوگیا۔لوگوں نے قنامہ ﷺ کا شکریہ ادا کیا۔خالد ﷺ نے جاکران کی پیشانی کو بوسہ دیا اور دعا کی۔ایک خاتون نے خالد ﷺ سے یرموک کے اس میدان کارزار میں فرمایا کہ اے خالدؓ! تو نے لوگوں کو بھاگنا سکھایا، جرنیل کے بھاگنے سے لوگ بھاگتے ہیں اور ان کے استقلال سے ثابت قدم رہتے ہیں۔حضرت خالد ﷺ نے فرمایا کہ میدان کے بیچ میں جو غبار اٹھ رہا تھا میں ادھر ہی لڑ رہا تھا، بھاگا نہیں تھا۔اس خاتون نے فرمایا کہ پھر جو شخص جرنیل کو چھوڑ کر بھاگ جائے اللہ اس کا بُرا کرے۔اس خاتون کا نام ذریعہ بنت حارث تھا۔

......☆......

لڑائی برابر جاری تھی، رومی مسلمانوں سے مل گئے تھے۔مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے کہ عورتوں نے اپنے بچوں کو گود میں اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کے سامنے کیا اور گھوڑوں کو مار مار کر لوٹا دیا اور بعضوں نے مشرکین سے مقابلہ کیا اور بعضوں نے بھاگنے والے مسلمانوں کو مارنا شروع کر دیا حتیٰ کہ مسلمان پھر میدان کی طرف پلٹ گئے۔مردوں کی حمایت میں عورتیں بھی لڑ رہی تھیں کہ رومیوں نے ان پر حملہ کیا جس سے لخم جذام اور خولان کی عورتیں پسپا ہو گئیں مگر خولہ، ام حکیم، لبنیٰ اور سلمیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہن اجمعین نے ان عورتوں کو ڈانٹا کہ ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ، تم نے ہم کو بھی سست کر دیا۔یہ سن کر یہ خواتین پھر لڑائی کی طرف لوٹ آئیں اور بے خوف وخطر لڑنے لگیں۔حضرت ہندہ، ام حکیم، خولہ رضی اللہ تعالیٰ عنہن برابر لڑ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ اے عربی ماؤں کے بیٹو! تم ان کافروں سے بھاگتے ہو، آگے آؤ اور ان کو مارو۔حضرت اسماءؓ بنت ابی بکر حضرت زبیرؓ کے ساتھ اپنا گھوڑا ملا کر برابر لڑ رہی تھیں اور ان عفت مآب باپردہ شریف ماؤں نے ایک دفعہ پھر ثابت کیا کہ عورتیں بھی اسلام کی سپاہی ہیں اور اسلام کی آبیاری میں یہ کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

......☆......

صاحب فتوح الشام لکھتے ہیں کہ اہل دمشق ایک عظیم بہادر کے پاس جمع ہو گئے جو اس سے قبل کسی جنگ میں صحابہ کے سامنے نہیں آیا تھا۔یہ شخص ہرقل کا نہایت معتمد تھا اور اللہ کی مخلوق میں بہترین درجہ کا تیرانداز تھا۔اس شخص کا نام بولص تھا۔دمشق کے لوگوں نے ان کو امیر بنایا اور ہر قسم کا

لالچ دے کران کو جنگ کے لئے آمادہ کیا۔ یہ سخت انکار کرتا تھا کہ تم لوگ بزدل ہو، پھر لڑو گے نہیں، تم کم ہمت ہو۔ لوگوں نے کہا کہ ہم جائیں گے، انجیل وعیسیٰ کی قسم آخر دم تک لڑیں گے۔ جو بھاگے گا تو آپ کو اختیار ہوگا کہ اس کو خود قتل کر دو۔ یہ عہد و پیان جب مکمل ہو گیا تو بولص گھر میں داخل ہو کر زرہ وغیرہ اسلحہ پہن رہا تھا تو بیوی نے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ بولص نے کہا، کہ دمشق والوں نے مجھے اپنا امیر بنایا ہے۔ اب عربوں کے ساتھ لڑنے جا رہا ہوں۔ بیوی نے کہا کہ ایسا مت کرو بلکہ گھر میں بیٹھے رہو، تم میں عربوں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ ان سے خواہ مخواہ ٹکر مت لو۔ میں نے آج ہی خواب میں دیکھا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کمان ہے اور ہوا میں چڑیوں کا شکار کر رہے ہو۔ بعض چڑیاں زخمی ہو کر گر گئیں مگر پھر اٹھ کر اڑنے لگیں۔ میں تعجب میں پڑ گئی کہ اچانک اوپر سے عقاب آ گئے اور تم اور تمہارے ساتھیوں پر ایسے ٹوٹ پڑے کہ سب کو نیست و نابود کیا۔ بولص نے کہا تو نے مجھے بھی خواب میں دیکھا تھا؟ اس نے کہا ہاں، ایک عقاب نے زور سے تجھے ٹھونک ماری اور تو بے ہوش ہو گیا۔ بولص نے اپنی بیوی کو طمانچہ رسید کیا اور کہا کہ تیرے دل میں عربوں کا خوف بیٹھ گیا ہے۔ خواب میں بھی وہی خوف ہے، گھبراؤ مت میں ابھی ان کے امیر کو تیرا خادم اور اس کے ساتھیوں کو بکریوں اور خنزیروں کا چرواہا بنادوں گا۔

بولص نہایت طمطراق سے چھ ہزار سوار اور دس ہزار پیدل نہایت آزمودہ لشکر کو لے کر مقابلہ کے لئے نکل گیا اور عورتوں، بچوں، مال مویشی اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے ایک ہزار لشکر کا تعاقب کیا۔ مسلمان بھی مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کفار اشرار پہنچ گئے۔ بولص آگے آگے ہے، اس نے ایک دم چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کیا۔ بولص کا بھائی بطرس پیدل فوج کے ساتھ مسلمان عورتوں کی طرف بڑھا اور کچھ عورتیں گرفتار کر کے دمشق کی طرف واپس لوٹ گیا۔ نہر استریاق پر پہنچ کر اپنے بھائی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ مصیبت ناگہانی دیکھ کر فرمایا کہ خالد رضی اللہ عنہ کی رائے صحیح تھی، عورتوں کی حفاظت پر بھی کسی کو رکھنا چاہئے تھا۔ عورتیں اور بچے چلا رہے تھے، ادھر ایک ہزار مسلمانوں نے دل کھول کر مقابلہ کیا۔ بولص نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ پر بار بار حملہ کیا۔ آپ نے بھی شدید مقابلہ کیا۔ دونوں طرف سے بازار کارزار گرم ہوا۔ غبار جنگ اٹھنے لگا، اس طرح تلواریں چلیں کہ زمین لالہ زار بن

گئی۔ حضرت سہل ؓ نے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر بجلی کی طرح حضرت خالد ؓ کے پاس پہنچ کر سارا قصہ سنایا۔ حضرت خالد ؓ نے انا للّٰہ پڑھا اور اس کے بعد حضرت رافع بن عمیرہ ؓ کو ایک ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف کو ایک ہزار لشکر دے کر روانہ کیا تاکہ بچوں، عورتوں کی حفاظت ہو جائے۔ اس کے بعد حضرت ضرار ؓ کو ایک ہزار سوار دے کر رخصت کیا اور خود بھی لشکر لے کر دشمن کی طرف چلے۔ جب بولص کے ساتھ ابو عبیدہ ؓ مصروف جنگ تھے اتنے میں مسلمانوں کے لشکر پہنچ گئے۔ بہادرانِ اسلام اور محمدی کھچار کے شیر دل جوانوں نے ایسا حملہ کیا کہ صلیبیں جھک گئیں۔ رومیوں کو اپنی ذلت وخواری کا یقین ہو گیا۔ حضرت ضرار ؓ آگ کے شعلہ کی طرح بولص کی طرف بڑھے۔ دشمنِ خدا نے جب آپ ؓ کو دیکھا تو کانپ اٹھا۔ اس نے پہچان لیا کہ کلوس وعزرائیل کے ساتھ جنگ میں کارنامے اسی نے انجام دیئے ہیں۔ بولص نے حضرت ابو عبیدہ ؓ سے کہا، اے عربی! تمہیں اپنے دین کی قسم، مجھے اس شیطان سے علیحدہ رکھو کہ مجھ پر یہ کہیں حملہ نہ کرے۔ حضرت ضرار ؓ نے فرمایا کہ میں اس وقت شیطان بنوں گا جب تجھے چھوڑوں گا، یہ کہہ کر بولص پر زور کا نیزہ مارا۔ بولص نے نیزہ پڑنے سے پہلے اپنے آپ کو گھوڑے سے نیچے گرایا تاکہ پیدل بھاگ جائے۔ حضرت ضرار ؓ نے بھی گھوڑے سے اتر کر اس کا تعاقب کیا اور کہا کہ کہاں بھاگ رہے ہو؟ شیطان تیری طلب میں ہے۔ بولص نے کہا کہ اے بدوی مجھے زندہ چھوڑو کیونکہ میرے زندہ چھوڑنے میں تمہاری عورتوں اور بچوں کی زندگی ہے۔ حضرت ضرار ؓ نے اس کو زندہ پکڑ لیا اور قید کر لیا۔

جنگ شحورا میں کفار کے چھ ہزار آدمیوں میں سے بمشکل سو آدمی زندہ بچ گئے تھے اور "قاتلوھم یعذبھم اللّٰہ بایدیکم" پر خوب عمل ہوا۔ ویخزھم پر بھی ہوا، وینصرکم علیھم بھی صادق آیا اور ویشف صدور قوم مومنین بھی واضح ہو گیا اور یذھب غیظ قلوبھم بھی نمایاں ہو گیا اور ویتوب اللّٰہ علی من یشاء بھی دیکھنے میں آیا۔ حضرت ضرار ؓ پریشان تھے کیونکہ خولہ بھی قید ہو چکی تھیں۔ تو خالد ؓ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں ہم نے ان کے ایسے آدمی پکڑے ہیں جس کے بدلے میں ہمارے قیدی باآسانی رہا ہو جائیں گے۔

......☆......

اس کے بعد حضرت خالد ﷺ نے دو ہزار سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے لیا اور باقی تمام افواج کو ابو عبیدہ ﷺ کے حوالہ کر دیا تا کہ عورتوں کی حفاظت ہو جائے اور خود قیدی خواتین کی تلاش میں نکل گئے۔ ضرار ﷺ بن ازور اور دوسرے بہادرانِ اسلام تیز تیز چل رہے تھے۔ حضرت ضرار ﷺ یہ اشعار پڑھ رہے تھے:

یا رب فرج ما تزی من کربتی
ولا تمتنی عاجلا بحسرتی
حتٰی اری بناظری اخیتی
ذاک منای ثم ذاک بغیتی
سیرو بنا الٰی العدو یا صحبتی
عسٰی انال بغیتی ومنیتی
ان لم اقاتل فاحلقو الی لحیتی

"اے اللہ میری مصیبت دور فرما اور مجھے اس ارمان کی حالت میں نہ مارنا یہاں تک کہ میں اپنی بہن کو دیکھ لوں یہی میرا مقصود و مطلوب ہے۔ دوستو! دشمن کی طرف چلو شاید میں اپنا مقصد پا لوں اور دشمن کے ساتھ اگر میں نہ لڑوں تو میری داڑھی منڈوا دینا"۔

حضرت خالد ﷺ یہ سن کر ہنستے تھے۔ یہ حضرات جلدی جلدی چلے اور نہر استریاق کے قریب پہنچ گئے۔ دیکھا کہ غبار اڑ رہا ہے اور بیچ میں تلواریں چمک رہی ہیں۔ ان کو تعجب ہوا کہ یہاں لڑائی کیوں ہو رہی ہے۔ چنانچہ مسلمان چوکس ہو گئے اور حقیقت معلوم کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ بولص کا بھائی بطرس خواتین عرب کو گرفتار کر کے نہر کے پاس بھائی کے انتظار میں رک گیا تھا۔ عورتوں کے بارے میں ہر ایک نے کہا کہ فلاں میری ہے، فلاں میری ہے۔ بطرس نے خولہ کے بارے میں کہا کہ یہ میری ہے۔ وہ لوگ عورتوں کو ایک خیمہ میں قید کر کے چھوڑ گئے اور خود آرام کرنے لگے اور بولص کا انتظار بھی تھا۔ ان گرفتار شدہ عورتوں میں اکثر قوم حمیر تبابعہ اور قبیلہ عمالقہ کی بڑی بہادر اور تجربہ کار شہسوار عورتیں بھی تھیں۔ وہ ہر قسم کی جنگ جانتی تھیں۔ یہ آپس میں جمع ہوئیں اور خولہ نے

اس طرح خطاب کیا۔

''اے حمیر کی بیٹیو! اور اے قبیلہ تبع کی یادگارو! کیا تم اس پر راضی ہو کہ رومی کفار بے دین تم کو لونڈیاں بنائیں، کہاں گئی تمہاری شجاعت اور تمہاری وہ غیرت جس کا ذکر عربی مجلسوں میں ہوا کرتا تھا؟ افسوس میں تمہیں غیرت سے علیحدہ اور شجاعت و حمیت سے خالی پا رہی ہوں۔ اس آنے والی مصیبت سے تو تمہاری موت بدرجہا افضل ہے۔''

یہ سن کر عفیرہؓ نے کہا، اے خولہ! تو نے جو کچھ بیان کیا بے شک درست ہے لیکن یہ بتاؤ کہ ہم قید میں ہیں، ہمارے ہاتھ میں نیزہ اور تلوار نہیں، ہم کیا کر سکتی ہیں؟ نہ گھوڑا ہے، نہ اسلحہ۔ کیونکہ اچانک ہم کو قید کر لیا گیا ہے۔ خولہؓ نے فرمایا کہ ہوش کرو خیموں کے ستون تو موجود ہیں، ہمیں چاہئے کہ انہیں اٹھا اٹھا کر ان بدبختوں پر حملہ کریں، آگے مدد اللہ فرمائے گا یا تو غالب آ جائیں گی ورنہ شہید تو ہو جائیں گی۔ اس پر ہر خاتون نے خیمہ کی ایک ایک لکڑی اٹھائی۔ حضرت خولہؓ ایک بڑی لکڑی کاندھے پر رکھ کر آگے ہوئیں۔ حضرت خولہؓ نے اپنی ماتحت خواتین سے فرمایا کہ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک ساتھ ہو جاؤ، متفرق نہ ہونا ورنہ سب قتل ہو جاؤ گی۔ اس کے بعد ھــل مــن مبارز کا نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور خولہؓ نے آگے بڑھ کر ایک رومی کافر کو مار کر قتل کیا۔

رومی حیران ہوئے کہ یہ کیا ہوا؟ دیکھا تو اسلام کی مائیں اب شیرنیاں بنی ہوئی تھیں۔ بطرس نے کہا، بدبختو! یہ کیا کر رہی ہو؟ حضرت عفیرہؓ نے فرمایا کہ آج ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان لکڑیوں سے تمہارے دماغ درست کر دیں اور تمہیں قتل کر کے اپنے اسلاف کی عزتوں کی حفاظت کریں۔ بطرس نے کہا کہ ان کو زندہ پکڑ لو، خولہ کا خیال رکھو۔ چاروں طرف سے تین ہزار رومی حلقہ باندھ کر کھڑے ہیں مگر کوئی شخص عورتوں تک نہیں آ سکتا اگر آگے بڑھتا ہے تو یہ عورتیں ان کے گھوڑے اور پھر ان کو مار دیتی ہیں۔ اس طرح تیس سواروں کو ان عورتوں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بطرس یہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ گھوڑے سے نیچے اترا اپنے ساتھیوں کیساتھ ہو کر تلواروں سے حملہ آور ہوا۔ مگر یہ عورتیں ایک جگہ اکٹھی تھیں کوئی قریب نہ آ سکا۔ حضرت خولہ بیچ میں ایک شیرنی کی طرح دوڑ رہی تھی اور کچھ جزیہ اشعار پڑھ رہی تھی۔

بطرس ملعون نے کہا کہ اے خولہ اپنی جان پر رحم کرو، میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میرے دل میں تیرے لئے بہت جگہ ہے، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ میں بادشاہ جیسا آدمی تیرا مالک بنوں اور میری ساری جائیداد تمہاری ہو جائے۔ حضرت خولہؓ نے فرمایا، اے کافر بد بخت، فاجر کے بیٹے! خدا کی قسم اگر میرا بس چلے تو ابھی تیرا سر اس لکڑی سے توڑ دوں۔ واللہ مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ تو میری بکریوں اور اونٹوں کا چرواہا بنے چہ جائیکہ تو میری برابری کا دعویٰ کرے۔ اس پر بطرس نے لشکر سے کہا کہ ان سب کو قتل کر دو۔ یسوع مسیح اور بادشاہ سے خوف کرو، کسی کو مت چھوڑو۔ لشکر والے نئے سرے سے تیار ہو ہی رہے تھے اور ابتدائی حملہ کر ہی رہے تھے اور یہ جاں نثار خواتین اس حملہ کو برداشت کر ہی رہی تھیں کہ اسلام کا لشکر خالدؓ کی سر کردگی میں پہنچا۔ غبار اٹھا، تلواریں چمکیں، عورتوں کی بہادری اور مقابلہ سے مسلمان انتہائی خوش ہوئے اور پھر پورے لشکر نے کفار کے اردگرد گھیرا ڈال دیا اور ایک ساتھ حملہ کیا۔ خولہؓ نے چلا کر کہا کہ تبابعہ کی لڑکیو! اللہ کی مدد آ گئی ہے، اللہ نے مہربانی کر لی ہے۔

جب بطرس نے اسلام کی فوج ظفر موج کو دیکھا تو کانپنے لگا۔ سب ایک دوسرے کا حیران ہو کر منہ تکنے لگے۔ بطرس نے عورتوں سے کہا کہ چونکہ ہماری بھی مائیں بہنیں ہیں لہٰذا میرے دل میں شفقت آ گئی ہے اب میں اس صلیب کے صدقے تم کو چھوڑتا ہوں۔ تم اپنے مردوں کو اطلاع کر دینا یہ کہہ کر بھاگنے لگا مگر بھاگنے سے پہلے پہلے اس نے اسلامی لشکر کے دو شہبازوں کو گھوڑے کداتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ ایک ننگے بدن کا ہے، نیزہ ہاتھ میں ہے۔ ایک خالد بن ولیدؓ اور دوسرے ضرارؓ بن ازور ہیں۔ جب خولہؓ نے اپنے بھائی کو دیکھا تو کہا، بھائی جان کہاں چلے آئے۔ اللہ نے پہلے سے ہماری مدد فرمائی تھی۔

بطرس نے خولہ سے کہا، تم اپنے بھائی کے پاس جاؤ، میں تجھے اس کے حوالے کرتا ہوں اور بھاگنے لگا۔ خولہؓ ایک دم آگے آئیں اور فرمایا کہ یہ عربوں کے دستور کے خلاف ہے کہ تم مہربانی و شفقت کا ہاتھ بڑھاؤ اور ہم بے رخی کریں۔ بطرس نے غصے میں کہا، مجھے اپنی شکل مت دکھاؤ۔ خولہؓ نے فرمایا مگر مجھے تو ہر حالت میں تیرا ساتھ دینا چاہئے۔ ادھر سے حضرت ضرارؓ اور خالدؓ آئے۔ جب بطرس نے ضرارؓ کو دیکھا تو چلا کر بولا، اے عربی! یہ میدان میں تیری بہن ہے۔

لے لو تمہیں مبارک ہو۔ میری طرف سے تمہیں ہدیہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بہت اچھا! میں نے تیرا ہدیہ قبول کیا مگر میرے پاس اس وقت تیرے ہدیہ کا بدلہ دینے کے لئے کچھ نہیں ہے صرف یہ نیزہ ہے اسے لے لو۔

اس کے بعد ضرار نے یہ آیت پڑھی "وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا" یہ کہہ کر اس کو ایک نیزہ مارا۔ وہ گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ پھر ضرار ؓ نے دوسرا وار کیا اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ حضرت خالد ؓ چلائے اور فرمایا شاباش۔ حضرت ضرار ؓ نے 30 رومیوں کو ادھر ہی مارا اور خولہؓ نے بھی بہت سے رومیوں کو قتل کیا تھا جو تھوڑے سے بچ گئے تھے وہ دمشق تک بھاگے اور مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

حضرت زینبؓ بنتِ علیؓ

واقعۂ کربلا تاریخ اسلام کا انتہائی افسوسناک اور دردانگیز واقعہ ہے۔ جس میں خانوادۂ رسول کونہایت بے دردی سے خون آشام تلواروں اور تیروں کی بھینٹ چڑھادیا۔ ایسا کرنے والے کون تھے، اگر چہ ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے مؤرخین نے اس واقعہ کی جو عکس بندی کی ہے، اس میں اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر صورتِ واقعہ کو افسانوی رنگ دے کر اصل کرداروں کو سات پردوں میں چھپانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاہم اہل نظر آج بھی مکروہ چہروں کو خوب جانتے اور پہچانتے ہیں۔

رنگ باز افسانہ سازوں نے حقائق کو بہر طور مسخ کر ڈالا ہے اور خانوادۂ نبوت سے ہمدردی کے بہروپ میں جو کہانی وضع کی ہے اُس میں کربلا کے تمام جانبازوں اور جانثاروں کو حریف کے مد مقابل ڈٹ کر میدان میں دادِ شجاعت دیتا ہوا دکھانے سے زیادہ انہیں بے صبری کے ساتھ آہ وفغاں کرتا ہوا دکھلایا ہے۔

نیز اس واقعہ کو کم وبیش ایک صدی بعد حوالۂ قرطاس کرتے وقت تحقیق وتجسس کی واجبی سی کوشش بھی روا نہیں رکھی۔ اور سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات کو تاریخ کے اوراق پر سجا کر امت کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ شاید اس کا یہ مقصد ہو کہ ''خیر امت'' خانوادۂ رسول کی اس مجروح داستان کو سن کر رونے دھونے کو ہمیشہ کیلئے اپنا شعار بنالے اور مائیں آئندہ کے لئے حقیقی وارثانِ حسین کو دودھ پلانا چھوڑ دیں یا پھر بقول اقبال۔

ذرا سی بات تھی ، افسانۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کیلئے

……☆……

کربلا میں شریک خانوادۂ نبوت کی خواتین میں سب سے بلند تر اور شجاعت وغیرت کے خمیر میں گندھا ہوا وجود سیدہ زینب بنت علی المرتضیٰؓ کا ہے۔ افسوس کہ عجم کے مجوس سازشی ذہن نے اس مقدس نام کو اپنی جھوٹی ہمدردی کے لبادے میں پامال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور ایک عام رقیق القلب خاتونِ خانہ کی طرح انہیں مصائب کے گردابِ بلا خیز میں نہایت بے صبر اور جزع وفزع کی تصویر بنا کر پیش کیا ہے۔ ہمارے عام مورخین نے چونکہ سارا مواد انہی سابقین سے لیا ہے، لہٰذا ان کی تحریروں میں بھی وہی مجلسی رنگ نمایاں ہے۔ اس لئے اس موضوع پر لکھنے والے حضرات سے مکمل اتفاق بہر طور ناممکن ہے۔ ذیل میں ہم سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے حوالے سے جناب طالب الہاشمی کی تحریر پیش کر رہے ہیں، امید ہے کہ قارئین انہی معروضات کے تناظر میں اس کا مطالعہ فرمائیں گے۔

……☆……

ربیع الاوّل ۱۱ ہجری میں رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپؐ نے اپنی لختِ جگر سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ سے فرمایا کہ اپنے بچوں کو بلا لاؤ۔ سیدہؓ نے تعمیل ارشاد کی اور اپنے تمام بچوں کو حضورؐ کے پاس لے گئیں۔ بچوں نے اپنے شفیق نانا کو بے چین دیکھا تو بے اختیار رونے لگے ان میں سے ایک چھ سالہ بچی کو تو اتنا صدمہ ہوا کہ اس نے حضورؐ کے سینہ مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچی کی پیشانی چومی اور اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر پھیر کر دلاسا دیا۔ یہ وہی بچی تھی جو چھ سال پہلے شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے گھر پیدا ہوئی تھی تو رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے۔ تین دن بعد آپ تشریف لائے تو سیدھے سیدہ فاطمۃ الزہراؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس کو گود میں لیا اور بہت دیر تک روتے رہے۔ پھر دہنِ مبارک میں کھجور چبائی اور لعاب مبارک بچی کے منہ میں ڈالا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اس کا بچی کا نام "زینبؓ" تجویز

کیا اور فرمایا۔ ''یہ ہم شبیہ خدیجہ ہے'' چھ سال بعد آج یہی زینبؓ اپنے شفیق نانا سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی تھی۔ چھ سال کی معصوم جان کے لئے یہ ایک بہت سانحہ تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ آئندہ زندگی میں اس پر اس قدر قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں کہ اس کی کنیت ہی اُم المصائب مشہور ہو جائے گی۔ یہی زینبؓ جنہیں زینبؓ کبریٰ بھی کہا جاتا ہے، تاریخ اسلام کی وہ مہتم بالشان شخصیت ہیں کہ جن کے علم و فضل' ذہانت و فطانت، فصاحت و بلاغت، حق گوئی و بے باکی، تسلیم و رضا اور صبر و استقامت کے واقعات سے تاریخ کے اوراق آج تک جگمگا رہے ہیں اور جگمگاتے رہیں گے۔

......☆......

سیدہ زینب کبریٰؓ نے جس گھرانے میں ہوش کی آنکھیں کھولیں وہ روئے زمین کا بہترین گھرانا تھا، ان کے نانا سید الانبیاء فخرِ موجودات رحمتِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو نانی اسلام کی خاتونِ اوّل اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ والد اسد اللہ الغالب سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تھے تو والدہ سیدۃ النساء خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا بتول تھیںؓ۔ ان کے بھائی جوانانِ جنت کے سردار سیدنا حسنؓ اور سیدنا حسینؓ شہید کربلا تھے تو چچا محبوبِ رسول سیدنا جعفر طیارؓ شہید موتہ تھے۔ حضرت زینبؓ مستند روایات کے مطابق جمادی الاولیٰ سن ۵ ہجری میں پیدا ہوئیں۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا نام زینب رکھا اور اپنا لعابِ مبارک ان کے منہ میں ڈالا۔ ان کی کنیت اُم الحسن یا بروایتِ دیگر اُمِ کلثوم تھی۔ واقعۂ کربلا کے بعد ان کی کنیت ام المصائب بھی مشہور ہو گئی۔ چند مشہور القاب یہ ہیں:

نائبۃ الزہرا۔ شریکۃ الحسین ۔ راضیۃ بالقدر والقضا۔ ناموس الکبریٰ صدیقۃ الصغریٰ۔ شجاعہ۔ فصیحہ' بلیغہ ' زاہدہ فاضلہ۔ عالمہ عابدہ، محبوبۃ المصطفیٰ۔ عاقلہ کاملہ۔ موثقہ۔ ولیۃ اللہ۔ کعبۃ الرزایا۔ امینۃ اللہ۔ قرۃ عین المرتضیٰ۔ خاتونِ کربلا۔

حضرت زینبؓ کی پرورش اور تربیت کا آغاز سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم حیدر کرارؓ اور سیدۃ النساءؓ کے زیر سایہ ہوا۔ ایک دن عہدِ طفلی میں حضرت زینب قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں کہ بے خیالی میں سر سے اوڑھنی اتر گئی۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ نے دیکھا تو ان کے سر پر اوڑھنی ڈالی اور فرمایا۔ ''بیٹی اللہ کا کلام ننگے سر نہیں پڑھتے''۔ ایک دن حضرت حسینؓ اور حضرت زینبؓ میں

معصومانہ لڑائی ہوگئی۔ سیدۃ النساءؓ نے انہیں کلام مجید کی آیات پڑھ کر سنائیں اور فرمایا:

''بچو لڑائی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے۔''

دونوں بچے خوفِ خدا سے کانپ اٹھے اور کہا کہ آئندہ کبھی نہ لڑیں گے، سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بہت خوش ہوئیں اور انہیں گلے سے لگالیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت زینبؓ سے بے حد محبت فرماتے تھے کئی مرتبہ حسینؓ کی طرح وہ بھی حضورؐ کے کندھے مبارک پر سوار ہوئیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت زینبؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھیں۔ اس وقت ان کی عمر پانچ سال کی تھی اور یہ ان کا پہلا سفر تھا۔

سنہ ۱۱ ہجری میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی تو سیدہ زینبؓ کی عمر چھ برس کے لگ بھگ تھی، چھ ماہ بعد ماں کی آغوش شفقت سے بھی محروم ہوگئیں۔ ان حادثوں نے ننھی زینبؓ کو سخت صدمہ پہنچایا کہ شفیق ناناﷺ اور جانثار ماں دونوں کی جدائی سے وہ اور ان کے دوسرے بھائی سبھی غم والم کی مورتیں بن گئے۔ سیدنا حضرت علیؓ نے اب بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام خود سنبھالا اور کچھ مدت کے بعد ان کی نگرانی کے لئے ام البنین بنت حزام کلابیہ سے نکاح کرلیا۔

بحرِ علوم جب خود معلم ہوں تو شاگردوں کی خوش بختی کا کیا ٹھکانہ۔ تھوڑی ہی مدت میں بچوں کے دل و دماغ علم و حکمت کے خزانوں سے معمور ہوگئے۔ حضرت زینبؓ نے بھی اپنے جلیل القدر باپ کے علم اور دوسرے اوصاف سے خوب خوب استفادہ کیا یہاں تک کہ زہد و تقویٰ، عقل و فراست، حق گوئی و بیباکی، عصمت اور عبادت و شب بیداری میں سیدۃ النساء فاطمہ الزہراؓ کا نمونہ بن گئیں۔ دراز قد اور متناسب الاعضاء تھیں۔ چہرہ مبارک پر اپنے ناناؐ کا جلال اور حرکات و سکنات اور چال ڈھال میں وقارِ حیدری نمایاں تھا۔ تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ علم و فضل میں صرف بنو ہاشم ہی نہیں بلکہ تمام قریش میں کوئی لڑکی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بے مثال خطیب تھے، وہ اپنے خطبات اور تقاریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیتے تھے۔ حضرت زینب کو اپنے عظیم باپ کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان ورثہ میں ملے۔ ان کیلئے یہ مستقل خطبات تاریخ نے اپنے صفحات میں محفوظ کرلئے ہیں انہیں پڑھ کر

کون سا دل ہے جو پگھل نہ جائے اور کون سی آنکھ ہے جو اشکبار نہ ہو جائے۔

☆

سیدہ زینبؓ جب سنِ بلوغ کو پہنچیں تو قبیلہ کندہ کے رئیس اشعث بن قیس نے ان کیلئے پیغام نکاح بھیجا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ' نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حیدر کرارؓ کے بھتیجے، شہیدِ موتہ حضرت جعفر طیار بن ابی طالب کے فرزند عبداللہؓ اپنے عمِ محترم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کی خواہش ظاہر کی۔ حضرت جعفرؓ کی شہادت کے بعد سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عبداللہؓ کی پرورش و تربیت فرمائی تھی اور حضورؐ کے وصال کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ' ان کے نگران و سرپرست تھے۔ وہ بڑے پاکیزہ اخلاق کے حامل تھے اور سیرت و صورت میں جوانانِ قریش میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ سیدنا علی المرتضیٰؓ نے نہایت سادہ طریق سے لختِ جگر کا نکاح حضرت عبداللہ سے پڑھا دیا۔ یہ واقعہ حضرت عمر فاروق کے دورِ خلافت کا ہے اس وقت سیدہ زینبؓ کی عمر بہ اختلاف روایت گیارہ یا تیرہ سال کی تھی۔ نکاح کے بعد خاندان کی عورتیں انہیں حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے گھر خود پہنچا آئیں۔ دوسرے دن انہوں نے دعوتِ ولیمہ کی مہر کی رقم کے بارے میں مورخین میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۴۸۰ درہم لکھا ہے اور بعض نے چالیس ہزار۔ حضرت عبداللہؓ بن جعفرؓ اس وقت تجارت کرتے تھے اور ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔

حضرت زینبؓ کی ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار تھی، وہ اپنے شوہر کی بے حد خدمت گزار تھیں اور عبداللہ ﷛ بھی ان کی دل جوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ اگرچہ گھر میں لونڈیاں بھی تھیں اور خادم بھی لیکن وہ گھر کا کام کاج زیادہ تر خود اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ حضرت عبداللہ بن جعفر ﷛ فرمایا کرتے تھے: ”زینب بہترین گھر والی ہے۔“

حضرت عبداللہ ﷛ نہایت کشادہ دست اور فیاض تھے۔ سیدۃ النساءؓ کی بیٹی بھی اسی رنگ میں میں رنگی ہوئی تھیں۔ ناممکن تھا کہ کوئی سائل یا حاجت مند ان کے دروازے پر آئے اور خالی ہاتھ چلا جائے یا کسی کی مصیبت کا انہیں پتہ چلے اور وہ اس کی خبر گیری نہ کریں۔ دونوں میاں بیوی کی جود و سخا کا یہ عالم تھا کہ کئی غیر مستحق لوگ بھی ان کے دست کرم سے فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ ایک مرتبہ امام حسینؓ نے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے کہا:

"اے ابن عم تم بہت اسراف سے کام لیتے ہو اور غیر مستحق لوگوں کو بھی اپنی کمائی میں شریک کر لیتے ہو۔"

حضرت عبداللہؓ نے جواب دیا: "جان برادر کیا کروں، سائل کو دیکھ کر دل قابو میں نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دولت اسی لئے دی ہے کہ اس کے بندوں میں بانٹوں۔"

خاوند کے گھر میں دولت کی ریل پیل حضرت زینبؓ کے مزاج میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی اور وہ بدستور صبر و قناعت، سادگی اور جفاکشی کا پیکر بنی رہیں۔

......☆......

۳۷ ہجری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے عہدِ خلافت میں کوفہ کو اپنا مستقر بنایا تو حضرت زینبؓ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؓ بھی مدینہ منورہ سے کوفہ آ گئے۔ کوفہ میں حضرت زینبؓ نہایت تندہی سے درس و تدریس اور وعظ و ہدایت کے کام میں مشغول ہو گئیں۔ کوفہ کی خواتین اکثر سیدہ زینب کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور نہ صرف ان کے پندرہ و نصائح سے مستفیض ہوتیں۔ مگر ان سے قرآن کریم کے معانی و مطالب بھی پوچھا کرتیں۔ ایک دفعہ سیدہ زینبؓ عورتوں کے سامنے سورۃ کھیعص کی تفسیر بیان کر رہی تھیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ وہاں تشریف لائے اور بڑے غور سے اپنی لخت جگر کی تقریر سنتے رہے۔ جب ان کا بیان ختم ہوا تو امیر المومنین نہایت مسرور ہوئے فرمایا:

"جان پدر، میں نے تمہارا بیان سنا اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم کلام الٰہی کے مطالب اتنے عمدہ طریقے سے بیان کر سکتی ہو۔"

جلد ہی حضرت زینبؓ کے علم و فضل کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ یہ اُن کی زندگی کا بہترین دور تھا لیکن افسوس کہ سکھ اور اطمینان کا یہ زمانہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ مسجد کوفہ میں بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز تھے کہ ایک بدبخت خارجی عبدالرحمٰن بن ملجم نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا اور اپنی زہر آلود تلوار کے بھرپور وار سے امیر المومنین کو شدید زخمی کر دیا۔ ابن ملجم کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا۔ حضرت زینبؓ نے اسے دیکھا تو غم و غصہ سے بے تاب ہو گئیں اور اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"او دشمن خدا تو نے امیر المومنین کو زخمی کر ڈالا۔"

ابن ملجم نے کہا۔ ''امیر المومنین کو نہیں، تمہارے باپ کو۔''

حضرت زینبؓ نے فرمایا: ''ان شاء اللہ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

ابن ملجم نے نہایت بے حیائی سے جواب دیا۔ ''تو پھر آہ و فغاں کیوں کرتی ہو۔ خدا کی قسم میں نے کئی روز تک اپنی تلوار کو زہر پلایا ہے۔''

اسی زہر آلود تلوار کے زخم سے امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ ہجری کو جام شہادت پی کر خلدِ بریں میں پہنچ گئے۔ اپنے عالی رتبہ اور معدن علم و فضل باپ کی شہادت سے حضرت زینبؓ پر غم و اندوہ کا وہ پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن ابھی ان کی قسمت میں اور بڑے بڑے صدمے لکھے تھے۔ ۴۹ ہجری ۵۰ ہجری میں انہیں اپنے برادرِ بزرگ سیدنا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا صدمہ سہنا پڑا۔ اس وقت وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھیں۔

ذی الحجہ ۶۰ ھ میں سیدنا حضرت امام حسینؓ نے اہل کوفہ کی دعوت پر اپنے اہل و عیال اور جانثاروں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکہ سے کوفہ کا عزم کیا تو حضرت زینبؓ بھی اپنے دو نوخیز فرزندوں کے ہمراہ اس مقدس قافلے میں شامل ہو گئیں۔ حضرت عبداللہؓ بن جعفرؓ اگرچہ خود اس قافلے میں شریک نہ ہو سکے لیکن انہوں نے حضرت زینبؓ اور اور اپنے بچوں کو امام حسینؓ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ ہجری کو کوبلا کا دلدوز سانحہ پیش آیا جس میں حضرت زینبؓ کی آنکھوں کے سامنے اُن کے بچے بھتیجے بھائی اور ان کے متعدد ساتھی شامی فوج سے مردانہ وار لڑتے ہوئے ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ اس موقعہ پر سیدہ زینبؓ نے جس حوصلے، شجاعت اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ نو اور دس محرم کی درمیانی شب کو حضرت امام حسینؓ کی تلوار صاف کی جانے لگی تو انہوں نے چند عبرت انگیز اشعار پڑھے۔ حضرت زینبؓ قریب ہی تھیں، یہ اشعار سن کر ان پر رِقت طاری ہو گئی اور زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

''اے کاش آج کا دن دیکھنے کیلئے میں زندہ نہ ہوتی، ہائے میرے ناناؐ، میری ماںؓ، میرے باپؓ اور میرے بھائی حسنؓ سب مجھ کو داغ مفارقت دے گئے۔ اے بھائی اللہ کے بعد ہمارا سہارا اب آپ ہی ہیں، ہم آپ کے بغیر کیسے زندہ رہیں گے۔''

امام حسینؓ نے فرمایا۔ ”زینب صبر کرو۔“

حضرت زینبؓ نے روتے ہوئے عرض کی۔ ”میرے ماں جائے، آپ کے بدلہ میں، میں اپنی جان دینا چاہتی ہوں۔“

امام حسینؓ اپنی پیاری بہن کی دلدوز باتیں سن کر اشکبار ہو گئے لیکن مومنانہ شان سے فرمایا:

”اے بہن صبر کرو، خدا سے تسکین حاصل کرو، خدا کی ذات کے سوا ساری کائنات کے لئے فنا ہے۔ ہمارے لئے ہمارے لئے ہمارے نانا خیر الخلائق ﷺ کی ذاتِ اقدس نمونہ ہے۔ تم انہیں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنا۔ اے بہن تمہیں خدا کی قسم ہے کہ اگر میں راہ راہِ حق میں کام آ جاؤں تو میرے ماتم میں گریبان نہ پھاڑنا، چہرہ کو نہ نوچنا اور بین نہ کرنا۔“

۱۰ محرم کو جب تمام جانثاران اہل بیت ایک ایک کر کے دوشِ رسولؐ کے سوار پر قربان ہو گئے تو جوانان اہل بیت کی باری آئی۔ ہم شبیہ پیغمبر حضرت علی اکبر بن حسینؓ دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے تو حضرت زینبؓ "یا ابنِ اخاہ" کہتی ہوئی خیمے سے باہر دوڑیں، اس بھتیجے کو انہوں نے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ ان کی خون آغشتہ لاش سے چمٹ گئیں۔ حضرت حسینؓ نے انہیں وہاں سے اٹھا کر خیمہ کے اندر بھیجا اور جوان فرزند کی لاش اٹھا کر خیمے کے سامنے لے آئے۔

علی اکبرؓ کے بعد عبداللہ بن مسلم بن عقیلؓ، احمد بن حسنؓ، ابوبکر عبداللہ بن حسنؓ جعفر بن عقیلؓ، عمر بن علیؓ اور دوسرے نوجوان سوائے سات نفوس کے ایک کر کے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اب حضرت زینبؓ نے اپنے نوخیز فرزندوں عونؓ اور محمدؓ کو رزم گاہ میں بھیجنے کیلئے سیدنا حسینؓ سے اجازت چاہی۔ انہوں نے اجازت دینے میں تامل کیا لیکن حضرت زینبؓ نے اس قدر اصرار کیا کہ وہ بادل نخواستہ انہیں میدان جنگ میں بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔ زینبؓ کے دونوں لال اس شان سے لڑے کہ شجاعت بھی آفرین پکار اٹھی۔ آخر شامیوں نے انہیں نرغے میں لے کر تلواروں اور نیزوں کا مینہ برسا اور دودمانِ ہاشمی کے دونوں نونہال جام شہادت پی کر خلد بریں میں پہنچ گئے حضرت زینبؓ اور مظلوم ماموںؓ کے قلب و جگر کے ٹکڑے اڑ گئے لیکن آسمان کی صرف نظر کی اور خاموش ہو گئے۔

عون و محمد کی شہادت کے بعد خانوادۂ نبوت کے باقی نوجوان بھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔ عباس بن علیؓ پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔ اب سیدنا حسینؓ تنہا رہ گئے۔ زین العابدین علیؓ بن حسینؓ بیمار تھے اور لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کو اللہ اور زینبؓ کے سپرد کیا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر سبط رسولؐ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔ پیاس کا غلبہ تھا، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو جانثاروں کی شہادت سے سخت دل فگار تھے لیکن آخر حیدرِ کرار کے فرزند تھے، دشمن کا دل بادل کائی کی طرح پھٹ جاتا۔ شامی بار بار نرغہ کرتے تھے انہیں جوں ہی شمشیر حسینی چمکتی، بھاگ کھڑے ہوتے۔ دوش رسول کے سوار لڑتے لڑتے زخموں سے چُور چُور ہو گئے لیکن اللہ رے ہیبت کہ کوئی تنہا سامنے آنے کی جرأت نہ کرتا تھا، جمگھٹے بنا کر ہر طرف سے تیروں تلواروں خنجروں اور نیزوں بارش کر رہے تھے۔ حصین بن نمیر نے ایک نیزہ پھینکا جو گلوئے مبارک میں پیوست ہو گیا اور دہن مبارک سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے۔ اپنے چلو میں تھوڑا سا خون لے کر آسمان کی طرف اچھالا اور فرمایا:

"الٰہی جو کچھ تیرے حبیبؐ کے نواسے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ تجھی سے اس کی فریاد کرتا ہوں۔"

حضرت زینبؓ نے دور سے اپنے محبوب اور شفیق بھائی کو خون کی کلیاں کرتے دیکھا تو بے تاب ہو گئیں اور دوڑتی ہوئی رزم گاہ کے قریب ایک ٹیلہ پر کھڑی ہو گئیں۔ وہیں سے شامی فوج کے سردار عمر بن سعد کو پکار کر کہا:

"اے عمر بن سعد کیا قیامت ہے کہ ابو عبداللہ قتل کئے جا رہے ہیں اور تم دیکھ رہے ہو۔"

عمر بن سعد کی آنکھوں پر کوفے کی حکومت کے لالچ نے پردہ ڈال رکھا تھا لیکن پھر بھی حضورؐ کے ماموں زاد بھائی (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ) کا فرزند تھا فرط ندامت سے رونے لگا اور حضرت زینبؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا تاہم تاہم شامیوں کو لڑائی سے روکنا اب اس کے بس میں نہیں تھا یا ظلم سے روکنے کی سعادت کی قسمت ہی میں نہ لکھی تھی۔ سیدنا حسینؓ حضرت زینبؓ کے سامنے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے سنگ دل شامیوں کے دل ان کی شہادت سے بھی ٹھنڈے نہ ہوئے۔ انہوں نے شہدائے کربلا کے مقدس جسموں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کیا، سیدۃ النساءؓ کے لال کا سرِ اقدس نیزے پر چڑھایا اور پھر اہل بیت کے خیموں کا رخ کیا۔ ایک بد بخت نے چاہا کہ حضرت زید العابدینؒ کو بھی (جو علیل تھے شہید کر دے لیکن حضرت زینبؓ ان

کے سامنے کھڑی ہو گئیں اور فرمایا:

"خدا کی قسم جب تک میں زندہ ہوں، اس بیمار کو کوئی قتل نہیں کر سکتا۔"

ان کا عزم دیکھ کر وہ بد بخت اپنے ارادے سے باز آ گیا۔

......☆......

۱۲ محرم الحرام سن ۶۱ ہجری کو قافلۂ حسینی کے پسماندگان کو، جن میں کچھ خواتین بچے اور عابد بیمار تھے، شامی فوج اسیر کر کے کوفہ کی طرف لے چلی۔ شہداء کے لاشے بھی میدان کربلا میں بے گور و کفن ہی پڑے تھے۔ جب یہ ستم زدہ قافلہ ان کے پاس سے گزرا تو اہل قافلہ فرطِ الم سے نڈھال ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت زینبؓ کے جذباتِ غم ان الفاظ میں ڈھل گئے:

"اے محمد مصطفیٰ! آیئے دیکھئے آپ کے حسینؓ کا خون آغشتہ لاشہ چٹیل میدان میں پڑا ہے۔

اس کا جسم پارہ پارہ کر دیا گیا ہے۔

آپ کے گھرانے کی لڑکیاں رسیوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔

آپ کی ذریت قتل کر کے ریت پر بچھا دی گئی ہے اور اس پر خاک اڑ رہی ہے۔

اے میرے نانا یہ آپ کی اولاد ہے جسے ہنکایا جا رہا ہے۔

ذرا حسین ﷺ کو دیکھئے اس کا سر کاٹ لیا گیا ہے۔

اس کا عمامہ اور چادر چھین لی گئی ہے۔"

زینب کبریٰؓ کا نوحہ سن کر دوست دشمن سبھی روتے تھے۔

جب اسیرانِ حق کا لٹا ہوا قافلہ کوفے میں داخل ہوا تو اہل کوفہ ہزاروں تعداد میں انہیں دیکھنے کیلئے جمع ہو گئے۔ ان میں سے بعض کی آنکھوں سے آنسو تھے۔ بے وفا کوفیوں کے ہجوم کو دیکھ کر شیرِ خدا کی بیٹی کو تاب ضبط نہ رہی، ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"لوگو اپنی نظریں نیچی رکھو، یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی لٹی ہوئی اولاد ہے۔"

اس کے بعد انہوں نے اہل کوفہ کے سامنے ایک عبرت انگیز خطبہ دیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود حیدر کرار تقریر فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

''اے کوفیو، اے مکارو، اے عہد شکنو! اپنی زبان سے پھر جانے والو، خدا کرے تمہاری آنکھیں ہمیشہ روتی رہیں، تمہاری مثال ان عورتوں کی سی ہے جو خود ہی سوت کاتتی اور پھر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ تم نے خود ہی میرے بھائی سے رشتہ بیعت جوڑا اور پھر خود ہی توڑ ڈالا۔ تمہارے دلوں میں کھوٹ اور کینہ ہے۔ تمہاری فطرت میں جھوٹ اور دغا ہے۔ خوشامد، شیخی خوری اور عہد شکنی تمہارے خمیر میں ہے، تم نے جو کچھ آگے بھیجا ہے وہ بہت بُرا ہے۔ تم نے خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند کو جو جنت کے جوانوں کے سردار ہیں قتل کیا ہے خدا کا قہر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

آہ اے کوفہ والو! تم نے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو منہ بگاڑ دینے والا اور مصیبت میں مبتلا کر دینے والا ہے یاد رکھو تمہارا رب نافرمانوں کی تاک میں ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔''

اس خطبہ کو سن کر کوفیوں کو اس قدر ندامت ہوئی کہ ان میں سے اکثر کی روتے روتے گھگی بندھ گئی۔ حذلم بن کثیر جو عرب کے فصیح ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا، وہ بھی حضرت زینبؓ کا خطبہ سننے والوں میں شامل تھا۔ خطبہ سن کر وہ سیدہؓ کے زور بیان فصاحت وبلاغت سے دنگ رہ گیا اور بے ساختہ کہنے لگا:

''واللہ اے علیؓ کی بیٹی، تمہارے بوڑھے سب بوڑھوں سے، تمہارے جوان سب جوانوں سے، تمہاری عورتیں سب عورتوں سے اور تمہاری نسل سب نسلوں سے بہتر ہے جو حق بات کہنے میں کسی سے نہیں ڈرتی۔''

......☆......

دوسرے دن کوفہ کے گورنر عبید اللہ بن زیاد نے دربار منعقد کیا اور اسیران اہل بیت کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت زینبؓ بہت خستہ حالت میں تھیں۔ ابن زیاد نے پوچھا، یہ عورت کون ہے؟

ایک لونڈی نے کہا: ''زینب بنت علیؓ ہیں''۔

ابن زیاد نے کہا: ''خدا کا شکر ہے جس نے تمہیں رسوا اور تمہاری جرأتوں کو جھٹلایا''۔

حضرت زینبؓ نے نہایت بے باکی سے جواب دیا:

''خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں عزت بخشی،

ان شاءاللہ فاسق رسوا ہوں گے اور جھٹلائے جائیں گے۔"

ابن زیاد نے کہا: "تم نے دیکھا تمہارے بھائی اور اس کے ساتھیوں کا کیا حشر ہوا؟"

حضرت زینبؓ نے فرمایا: "اللہ تعالٰی نے انہیں درجہ شہادت پر فائز کیا، عنقریب وہ اور تم داور محشر کے سامنے جمع ہوں گے اس وقت تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس کا کیا حشر ہوتا ہے"۔

ابن زیاد جھلا کر بولا: "بنی ہاشم کے سب سے سرکش آدمی کے قتل سے میرا دل ٹھنڈا ہو گیا ہے"۔

حضرت زینبؓ کو ابن زیاد کے اس طرح اظہار مسرت کرنے پر بڑا دکھ ہوا۔ ان کا آبگینۂ دل حوادثِ کربلا سے ٹوٹ چکا تھا، بے اختیار رو دیں اور فرمایا: "خدا کی قسم تو نے ہمیں اپنے گھروں سے نکالا، ہمارے ادھیڑوں کو قتل کیا، ہماری شاخوں کو کاٹا، ہماری جڑوں کو اکھاڑا، اگر اسی سے تمہارا دل ٹھنڈا ہونا تھا تو ہو گیا۔"

ابن زیاد سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اب اس کی نظر زین العابدینؓ پر پڑی، پوچھا: "لڑکے تم کون ہو؟

انہوں نے جواب دیا۔ "علی بن حسینؓ"

ابن زیاد نے عمر بن سعد سے پوچھا۔ "اسے کیوں نہیں قتل کیا؟"

اس نے جواب دیا۔ "بیمار ہے۔"

ابن زیاد نے کہا۔ "اسے میرے سامنے قتل کرو۔"

حضرت زینبؓ یہ حکم سن کر تڑپ اٹھیں اور بولیں:

"اے ابن زیاد! کیا تو ابھی تک ہمارے خون سے سیر نہیں ہوا، کیا اس نقاہت اور بیماری کے مارے ہوئے مصیبت زدہ بچے کو بھی مارو گے۔ اگر اسے قتل کرنا ہے تو اس کے ساتھ مجھے بھی مار ڈال۔"

یہ کہہ حضرت زین العابدینؓ سے چمٹ گئیں۔ ابن زیاد کے دل میں خیال آیا اور اس نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو عورتوں کے ساتھ رہنے کیلئے چھوڑ دو۔ بعد ازاں ابنِ زیاد نے شہداء کے سروں اور اسیرانِ اہل بیت کو فوج کے پہرے میں یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا۔

طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد اسیران اہل بیت دمشق پہنچے تو تین چار دن کے بعد انہیں یزید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ ایک سرخ رنگ کے شامی نے فاطمہؓ بنتِ حسینؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''امیر المومنین یہ لڑکی مجھے دے دیجئے۔''

حضرت زینبؓ تڑپ اٹھیں اور بولیں۔ ''خدا کی قسم یہ لڑکی نہ تجھے مل سکتی ہے اور نہ یزید کو جب تک کہ اللہ کے دین کو ترک کرنے کا اعلان نہ کر دے پیغمبرؐ کے خاندان میں کسی کو تو یا تیرا بادشاہ ہرگز لونڈی نہیں بنا سکتا۔''

شامی نے دوبارہ یہی سوال کیا لیکن یزید نے اسے روک دیا۔

جب امام حسینؓ کا سرِ اقدس یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو خواتین اہل بیت رونے لگیں۔ حضرت زینبؓ نے سر اقدس کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

''اے حسین، اے محمد مصطفیٰ کے دل بند، اے دوشِ پیغمبرؐ کے سوار، اے فاطمۃ الزہرا کے لختِ جگر، اے جنت کے جوانوں کے سردار۔''

یزید نے پوچھا: ''یہ عورت کون ہے؟

اسے بتایا گیا کہ حسینؓ کی چھوٹی بہن زینبؓ ہیں۔

یزید نے حضرت زینبؓ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کیا تمہارا بھائی یہ نہیں کہتا تھا کہ میں یزید سے بہتر ہوں اور میرا باپ یزید کے باپ سے بہتر تھا۔''

حضرت زینبؓ نے دلیری سے جواب دیا۔ ''بے شک میرا بھائی سچ کہتا تھا۔''

یزید نے کہا۔ ''میری عمر کی قسم، حسین کے نانا میرے دادا سے بہتر تھے حسین کی ماں میری ماں سے بہتر تھیں، رہا میرا باپ اور حسین کا باپ تو سب کو معلوم ہے کہ خدا نے کس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔''

اس پر حضرت زینبؓ نے یزید اور اس کے اہل دربار کو مخاطب کر کے ایک دردناک تقریر کی، انہوں نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا:۔

''اے یزید! گردشِ افلاک اور ہجوم آفات نے مجھے تجھ سے مخاطب ہونے پر مجبور کر دیا۔ یاد رکھ رب العزت ہم کو زیادہ عرصے تک اس حال میں نہ رکھے گا۔

ہمارے مقاصد کو ضائع نہ کرے گا۔ تو نے ہمیں نقصان نہیں پہنچایا اپنے آپ کو پہنچایا ہے۔ آہ تیرے آدمیوں نے دوشِ رسولؐ کے سوار اور اس کے بھائیوں، فرزندوں اور ساتھیوں کو نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا۔ انہوں نے پردہ نشینانِ اہل بیت کی حرمتی کی۔ اے کاش تو اس وقت شہیدانِ کربلا کو دیکھ سکتا تو اپنی ساری دولت وحشمت کے بدلے اُن کے پہلو میں کھڑا ہونا پسند کرتا۔ ہم عنقریب اپنے ناناؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان مصائب کو بیان کریں گے جو تیرے بے درد ہاتھوں سے ہمیں پہنچے ہیں اور یہ اس جگہ ہوگا جہاں اولادِ رسولؐ اور اس کے ساتھی جمع ہوں گے، ان چہروں کا خون اور جسموں کی خاک صاف کی جائے گی۔ وہاں ظالموں سے بدلہ لیا جائے گا۔ حسینؓ اور ان کے ساتھی مرے نہیں اپنے خالق کے پاس زندہ ہیں اور وہی ان کیلئے کافی ہے۔ وہ عادل حقیقی نبیؐ کی اولاد اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے والوں سے ضرور بدلہ لے گا، وہی ہماری امید گاہ ہے اور اسی سے ہم فریاد کرتے ہیں۔"

حیدر کرارؓ کی بیٹی کی گرج سن کر یزید اور اس کے درباری سکتے میں آ گئے۔ یزید کو خوف محسوس ہوا کہ کہیں لوگ خاندانِ رسالت کی حمایت میں میرے خلاف نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ اس نے خواتینِ اہل بیت کو اپنے خاص حرم میں ٹھہرایا اور جہاں تک ہو سکا، ان کی دل جوئی کی کوشش کی۔ چند دن بعد اس نے حضرت نعمان بن بشیر انصاریؓ کے زیرِ حفاظت قافلۂ اہل بیت کو بھی مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ جب قافلہ چلنے لگا تو حضرت زینبؓ نے فرمایا:

"محملوں پر سیاہ چادریں ڈال دو تا کہ دیکھنے والوں کو پتہ چل جائے کہ یہ سیدۃ النساءؓ کی دل فگار اولاد ہے۔"

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے جہاں تک بن پڑا، ان مصیبت زدہ مسافروں کی مدد کی اور راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ جب یہ قافلہ کربلا پہنچا تو وہاں بزرگ صحابی حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ اور بنو ہاشم کے کچھ لوگ مدینہ منورہ سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر حضرت زینبؓ نے فرطِ الم میں پکارا:

''اے بنی ہاشم تمہارا چاند غروب ہو گیا۔ اے میرے نانا کے صحابیؓ تو نے جس بچے کو کبھی اپنے آقاؐ کے دوشِ مبارک پر سوار کیا تھا اس کا جسم اطہر گھوڑوں کے سُموں سے پامال ہو گیا۔''

اس کے بعد اس قدر روئیں کہ غش آ گیا۔ اس موقع پر موجود دوسرے لوگ بھی رونے لگے۔ جب قافلہ مدینہ منورہ پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔ فاتح خیبرؓ کی غیور بیٹیوں زینبؓ اور فاطمہؓ نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کو ان کے حُسن سلوک کے عوض اپنی چوڑیاں اتار کر پیش کیں اور ساتھ ہی معذرت کی کہ اس وقت ہمارے پاس اور کچھ نہیں کہ آپ کی خدمت کا معاوضہ دیں۔

نعمانؓ اشک بار ہو گئے اور کہا: ''اے بنات رسول، خدا کی قسم میں نے جو کچھ کیا ہے صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کیلئے کیا ہے۔ یہ چوڑیاں لے کر میں اپنا اجر ضائع نہیں کروں گا۔ خدا کیلئے انہیں اپنے پاس ہی رکھئے۔''

اس دن سارا مدینہ منورہ سوگوار تھا۔ ہزاروں لوگوں نے روتے ہوئے استقبال کیا جس سے ان مصیبت زدہ مسافروں کی چیخیں نکل گئیں اور زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے:

''اے میرے پیارے ناناؐ جان میں آپ کے فرزند اور اپنے بھائی حسینؓ کی شہادت کی خبر لائی ہوں۔ آپ کی اولاد کو رسیوں سے باندھ کر کوفہ اور دمشق کی گلیوں میں پھرایا گیا۔''

اس وقت روضۂ نبویؐ کے قریب جتنے لوگ موجود تھے سب حضرت زینبؓ کے الفاظ سن کر رونے لگے۔ پھر وہ اپنی والدہ ماجدہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے مزار پر گئیں اور اس درد سے روئیں کہ پتھروں کا کلیجا بھی پانی ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں سے ملیں، انہیں اپنی رودادِ غم سنائی اور سب کو صبر کی تلقین کی۔

بے پناہ مصائب نے حضرت زینبؓ کے دل و جگر کے ٹکڑے اڑا ڈالے تھے۔ کربلا سے واپس آنے کے بعد کبھی کسی نے ان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ ایک روایت کے مطابق انہوں ۶۲ ہجری میں مدینہ منورہ ہی میں اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کی اور یوں یتیمان اہل بیت کی سرپرست شہدائے کربلا کی یادگار، اور دشمنوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے والی بے مثال خطیبہ،

اپنے محبوب اور مظلوم بھائی سے جنت الفردوس میں جا ملیں۔

ایک دوسری روایت کے مطابق حضرت زینبؓ اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے ساتھ شام چلی گئیں۔ دمشق کے پاس حضرت عبداللہؓ کی کچھ زمینداری تھی۔ وہاں پہنچنے کے بعد بیمار ہوئیں اور وہیں رحلت فرمائی۔

ایک اور روایت کے مطابق حضرت زینبؓ مدینہ منورہ پہنچ کر شہیدان کربلا کے مصائب نہایت درد انگیز لہجہ میں کمال فصاحت و بلاغت سے لوگوں کو سنایا کرتی تھیں۔ لوگ ان سے بہت متاثر ہوتے اور ان میں اولاد رسول کی حمایت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ عاملِ مدینہ نے ان حالات کی اطلاع یزید کو دی۔ اس نے حکم بھیجا کہ زینبؓ کو کسی دوسرے شہر میں بھیج دو۔ حضرت زینبؓ پہلے تو جانے پر آمادہ نہ ہوئیں پھر بعض ہوا خواہوں کے سمجھانے بجھانے سے رضامند ہو گئیں اور حضرت سکینہؓ و فاطمہؓ بنات حسینؓ اور کچھ دوسری قرابت دار خواتین کے ہمراہ مصر چلی گئیں۔ وہاں کے والی حضرت مسلمہؓ بن مخلد انصاریؓ نے ان کی نہایت عزت و تکریم کی اور اپنے دارالاقامہ میں ٹھہرا دیا۔ تقریباً ایک سال بعد ۶۲ھ میں حضرت زینبؓ وہیں دارِ فنا سے عالمِ بقا کو سدھاریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مدینہ منورہ میں تو حضرت زینبؓ کی قبر کا کوئی نشان نہیں البتہ دمشق اور قاہرہ دونوں جگہ ان کے مزار موجود ہیں اور زیارت گاہِ خواص و عوام ہیں۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہا

حبیبہ بنت ہاشمؓ کے جہادی کارنامے

آپ اسلام کے ایک مایہ ناز سپہ سالار ہاشم بن عتبہؓ کی صاحبزادی تھیں۔ سولہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوئی لیکن چند سال بعد ہی بیوہ ہوگئیں۔ آپ نے اپنی باقی ساری زندگی اسلام کے لئے وقف کر دی اور بہت سی جنگوں میں حصہ لیا۔ اکثر معرکوں میں عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے۔

ایک مرتبہ ایران کے آتش پرستوں نے مل کر یہ طے کیا کہ ایک مرتبہ پورا زور لگا کر ایران کی اسلامی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ لہٰذا معرکہ کارزار گرم ہوا۔ مسلمانوں کی فوج کی قیادت آپ کے والد ہاشم بن عتبہ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ آپ بھی داد شجاعت دے رہی تھیں۔

دورانِ جنگ آپ بار بار یہ نعرہ لگاتیں ''مردان صف شکن بڑھے چلو فتح تمہاری منتظر ہے''۔ اس نعرے نے اسلامی لشکر میں جوش و ولولہ پیدا کر دیا۔ آپ خود ایسی بہادری سے لڑیں کہ ایرانی لشکر میں تہلکہ برپا کر دیا۔ آخر کار آپ لڑتے لڑتے گھوڑے سے گر کر زخمی ہوگئیں۔ آپ کے والد نے چاہا کہ آپ کچھ آرام کر لیں لیکن آپ نے منظور نہ کیا اور برابر لڑتی رہیں۔ جب باپ نے بار بار اصرار کیا تو آپ نے کہا:

''ابا جان! مجھے اس سعادت سے محروم نہ کریں۔ یوں تو اسلام کی ہر چیز مجھے عزیز ہے لیکن شوہر کی وفات کے بعد میری یہی تمنا رہ گئی ہے اسلام کی خاطر لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں اور اپنے شوہر سے جاملوں''۔

آخرکار مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ بعد میں آرمینیا کی جنگ میں آپ بذاتِ خود ایک دستے کی کمان کررہی تھیں۔ چنانچہ اعلیٰ جنگی قابلیت کی بنا پر مختصر عرصہ میں آرمینیا کا پورا علاقہ فتح کرلیا۔ اسی اثنا میں بلخ میں دشمن کا ایک بڑا لشکر مسلمانوں کے مقابلے کے لئے جمع ہوا۔ اطلاع ملتے ہی ہاشم بن عتبہ رضی اللہ عنہ آپ کو لے کر بلخ جا پہنچے۔ گھمسان کی جنگ ہوئی اور عظیم الشان فتح مسلمانوں کا مقدر بنی۔

اس معرکہ کے بعد فرغانہ کا معرکہ پیش آیا اس میں ایک موقع پر آپ بری طرح دشمنوں میں گھر گئیں، آپ کے ساتھ صرف چار سو جانباز تھے۔ یہ ایک ایسا نازک موقع تھا جبکہ بڑے بڑے جانباز بھی گھبرا جاتے ہیں لیکن آپ مطلق نہ گھبرائیں اور مٹھی بھر جانبازوں کے ساتھ تلوار چلاتی دشمنوں کے لشکر کو چیرتی صاف بچ کر نکل گئیں اور پلٹ کر ایسا سخت حملہ کیا کہ دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے۔

اُمّ علقمہ

حجاج بن یوسف ثقفی پہلی صدی ہجری میں بنواُمیہ کا مشہور فوجی افسر اور گورنر گزرا ہے۔ وہ اپنی بعض خوبیوں اور کارناموں کے باوجود تاریخ میں ایک ظالم اور سفاک انسان کی حیثیت سے مشہور ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُموی حکومت یا اپنے مخالفین پر قابو پا کر ان سے نہایت بے رحمانہ سلوک کرتا تھا۔ اس کی سفاکی کا شکار ہونے والے لوگوں میں صحابہ کرامؓ بھی شامل تھے اور تابعینؒ بھی۔ عبدالملک بن مروان کے عہدِ حکومت میں اس نے مکہ معظمہ پر قبضہ کرنے کے لئے خانہ کعبہ پر منجنیقوں کے ذریعے پتھر برسانے سے بھی گریز نہ کیا۔ جلیل القدر صحابیہ حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کی رو سے سفاک ٹھہرایا۔ جس زمانے میں حجاج عراق کا گورنر تھا، خوارج کے ساتھ سرکاری فوج کے کئی معرکے ہوئے۔ علماء اسلام نے اگرچہ خوارج کو مردود و مبغوض ٹھہرایا ہے لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ قرنِ اول کے خوارج بڑے جانباز لوگ تھے اور اپنے مقصد کی خاطر جان پر کھیل جانا ان کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ پھر ان کی زندگی (معاشرت) بہت سادہ بلکہ زاہدانہ ہوتی تھی اور وہ عبادت الٰہی سے بہت شغف رکھتے تھے۔ اُموی فوج کے خلاف لڑنے والے خارجیوں میں اُم علقمہ نام کی ایک انتہائی دلیر اور جنگجو عورت بھی تھی۔ اس نے ہر معرکے میں ایسی جرأت اور سرفروشی کا مظاہرہ کیا کہ اس کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔ بدقسمتی سے ایک لڑائی میں وہ سرکاری فوج کے ہاتھ گرفتار ہوگئی اور اسے حجاج کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ حجاج نے اس کے ہم مسلک لوگوں پر قابو پا کر ان کو طرح طرح کی

اذیتیں دے کر ہلاک کیا تھا، اس لئے وہ اس سے سخت نفرت کرتی تھی۔ دشمن کے قبضے میں ہونے کے باوجود اس کے طنطنے میں کوئی کمی نہ آئی اور وہ حجاج کی طرف سے منہ پھر کر کھڑی ہوگئی۔ حجاج نے اس سے مخاطب ہو کر کہا...... "اے خارجیہ میرے منہ کی طرف دیکھ"!

اُم علقمہ نے نہایت حقارت اور نفرت کے ساتھ کہا...... "جو منہ بارگاہِ خداوندی سے مردود ہو چکا ہے میں اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"

حجاج نے غضب ناک ہو کر اپنے مصاحبوں سے پوچھا: "اس گستاخ عورت کے خون کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟" سب نے بیک زبان ہو کر کہا...... "حلال ہے"۔ یہ سن کر اُم علقمہ خوفزدہ ہونے کے بجائے مسکرانے لگی۔

حجاج اس کو ہشاش بشاش اور متبسم دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اس سے پوچھا:

"اس موقعہ پر جب کہ موت تیرے سر پر کھڑی ہے تو کیوں مسکرا رہی ہے؟"

امّ علقمہ نے کہا، "اس لئے کہ تیرے مصاحبوں نے تیرے دوست کے مصاحبوں کو بھی مات کر دیا۔"

حجاج نے پوچھا: "وہ کون میرا دوست ہے؟"

اُمّ علقمہ بولی: "فرعون...... اس نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا تو ان سب نے یک زبان ہو کر مشورہ دیا کہ ارجہ واخاہ یعنی اس کو اور اس کے بھائی کو چند روز کی مہلت دے، لیکن تیرے مصاحب فرعون کے مصاحبوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ ایک عورت کے قتل کا مشورہ دے رہے ہیں۔"

حجاج پر اُمّ علقمہ کی باتوں کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو اس سے کہا، جا میں تجھے مہلت دیتا ہوں اپنے گھر بیٹھ اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو۔"

(مشاہیر النسا۔ مشاہیر نسواں)

ملکہ سیدہ

رے، ہمدان اور اصفہان کے دَیلمی (بویہی) فرمانروا فخر الدولہ ابوالحسن علی (۳۶۶ھ تا ۳۸۷ھ) کی بیگم تھی۔ ۳۸۷ھ میں فخر الدولہ نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا اور جانشین مجد الدولہ ابوطالب رستم نابالغ تھا۔ چنانچہ حکومت کی باگ ڈور ملکہ سیدہ نے سنبھال لی۔ وہ نہایت دانشمند قابل اور مخیّر خاتون تھی۔ اس نے حکومت کا کاروبار ایسی خوش اسلوبی سے چلایا کہ رعایا خوشحال ہوگئی۔ لیکن جب مجد الدولہ نے بالغ ہونے کے بعد عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے اپنی والدہ کی ہدایتوں پر چلنا چھوڑ دیا اور ایک نالائق شخص ابوعلی کو وزیر بنا کر اس کے غلط مشوروں پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ملکی نظم ونسق ابتر ہوگیا اور لوگوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ملکہ سیدہ نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ لارستان پہنچی اور وہاں کے حاکم حسین بن بدر سے مدد چاہی۔ حسین نے ایک فوجِ گراں کے ساتھ دارالحکومت شیراز پر چڑھائی کی اور مجد الدولہ کو شکست دے کر اسے اور اس کے وزیر ابوعلی دونوں کو قید خانے میں ڈال دیا اور حکومت سیدہ کے حوالے کر دی۔ جب وہ تاج وتخت کی مالک ہوئی تو حسین بن بدر کو اس قدر انعام واکرام دیا کہ وہ خوش ہوگیا۔ پھر وہ رفاہِ عامہ کی طرف متوجہ ہوئی اور ایسے ایسے کام کیے کہ لوگ آسودہ حال ہوگئے اور ہر طرف امن چین کا دور دَورہ ہوگیا۔ یہ قابل ملکہ اپنے وزراء اور حکام پر کڑی نگرانی رکھتی اور ان سے باقاعدہ مراسلت رکھتی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر غیر ممالک کے سفیروں سے گفتگو کرتی اور کسی سے مشورہ کیے بغیر ان کے سوالوں کے نہایت معقول جواب دیتی۔ ایک دفعہ سلطان محمود غزنویؒ (۳۸۸ھ تا ۴۲۱ھ) نے اس کو پیغام بھیجا کہ اپنی

مملکت میں میرے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کرو ورنہ لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ ملکہ سیدہ نے اس کے جواب میں سلطان محمود کو لکھا:

''اگر سلطان مجھ سے لڑنے آتا ہے تو بسم اللہ، وہ مجھے میدانِ جنگ سے روگرداں ہوتے نہ دیکھے گا۔ جنگ کا نتیجہ ہمیشہ فتح یا شکست کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر مجھے فتح ہوئی تو اطراف واکناف میں مشہور کروں گی اور اس پر فخر کروں گی کہ محمود جیسے نامور فرمانروا کو میں نے شکست دی اور سلطان کی بدنامی ہوگی کہ ایک عورت نے اس کو پسپا کیا اور اگر مجھے شکست ہوئی تو ایک عورت کو شکست دے کر سلطان کو نہ ناموری حاصل ہوگی اور نہ اس کے لئے کوئی قابلِ فخر کارنامہ ہوگا۔''

سلطان محمودؒ کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے لڑائی کا ارادہ ترک کر دیا اور جب تک سیدہ زندہ رہی اس نے اس کے ملک کا قصد نہ کیا۔

چند سال حکومت کرنے کے بعد سیدہ کی محبتِ مادری جوش میں آئی اور اس نے مجد الدولہ کو آزاد کر کے تخت پر بٹھا دیا۔ اب وہ اپنی والدہ کی نصیحتوں پر چلتا رہا اور ملک بھی آباد اور خوشحال رہا۔ لیکن جب ۴۲۰ھ میں سیدہ نے وفات پائی اور مجد الدولہ نے حسبِ سابق من مانی کرنی چاہی تو سلطان محمود غزنویؒ نے فوراً اس پر یلغار کر دی اور ملک پر قبضہ کر لیا۔ مجد الدولہ کو وہ گرفتار کر کے اپنے ساتھ خراسان لے گیا۔

(مشاہیر نسواں بحوالہ خلاصۃ الاخبار وحدیقۃ الاقلیم)

ملکہ ترکان خاتون (بیگم ملک شاہ سلجوقی)

ترکان خاتون الملقب بہ خاتونِ بزرگ وخاتون الجلالیہ تاریخ اسلام کے نامور فرماں روا سلطان ملک شاہ سلجوقی" کی ملکہ تھی۔...... وہ عماد الدولہ طقاج (یا تغمش) خان ابوالمظفر ابراہیم بن نصر ایلک کی بیٹی تھی، جو ماوراء النہر کے مغربی علاقے کا حکمران تھا۔ اس کی شادی ملک شاہ سے ۴۵۶ھ میں ہوئی تھی۔ اُس وقت ملک شاہ کا والد سلطان الپ ارسلان زندہ تھا اور اسی نے اپنے بیٹے کی شادی کے لئے خان ابوالمظفر ابراہیم کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ اس کا مقصد خوانینِ ماوراء النہر سے اپنے تعلقات استوار کرنا تھا۔

میر خواند نے "روضۃ الصفا" میں لکھا ہے کہ خانِ اعظم نے اپنی بیٹی کا ڈولہ بڑی شان و شوکت سے نیشاپور روانہ کیا۔ جب دلہن شہر میں داخل ہوئی تو تمام شہر آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک ہزار ترکی غلام ڈولہ کی جلو میں تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک نادر تحفہ ترکستان کا تھا۔ مشک وعنبر اور کافور کی گولیاں جلوس پر نثار کی جاتی تھیں۔

ترکان خاتون کا شمار تاریخ عالَم کی مشہور خواتین میں ہوتا ہے۔ وہ بڑی آن بان کی عورت تھی اور اس کے رعب وجلال کا یہ عالم تھا کہ اس کے سامنے بڑے بڑے امراء و وزراء کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ سلطان ملک شاہ کے نزدیک اس کی یہ قدر و منزلت تھی کہ وہ سلطنت کے ہر معاملے میں اس سے ضرور مشورہ کرتا تھا۔

۴۷۴ھ میں عباسی خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے سلطان ملک شاہ کو اس کی بیٹی کے لئے پیغام

بھیجا۔ سلطان نے خلیفہ کا پیغام سن کر کہا کہ اس معاملہ میں شہزادی کی والدہ ترکان خاتون ہی کوئی جواب دے سکتی ہے۔ یہ پیغام خلیفہ مقتدی کا ایک انتہائی قابلِ اعتماد اور معزز امیر ابونصر محمد بن جہیر لایا تھا۔ سلطان نے اس سے کہا کہ آپ خواجہ نظام الملک کے ہمراہ ملکہ ترکان خاتون کے پاس جائیں اور عرضِ مدعا کریں۔

دوسرے دن فخر الدولہ اور خواجہ نظام الملک دونوں خاتونِ بزرگ ترکان خاتون کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بڑے احسن انداز میں خلیفہ کے پیام کا ذکر کیا۔ ترکان خاتون نے جواب دیا کہ شاہِ غزنین اور ماوراء النہر کے کئی خوانین اپنے اپنے فرزندوں کے لیے شہزادی کا رشتہ مانگ رہے ہیں اور وہ چار لاکھ نقد مہر دینے کو تیار ہیں اگر خلیفہ مقتدی اتنا مہر دینے پر آمادہ ہو تو میں اس کو دوسرے تمام پیغام بھیجنے والوں پر ترجیح دوں گی۔

سلطان کی پھوپھی ارسلان خاتون کو ترکان خاتون کے جواب کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئی کیونکہ وہ اس رشتہ کی دل سے خواہاں تھی۔ اس نے پہلے فخر الدولہ اور خواجہ نظام الملک سے مشورہ کیا، پھر خود ترکان خاتون کے پاس گئی اور اس کو سمجھایا کہ خاندانِ خلافت میں رشتہ کرنا ہمارے لیے باعثِ فخر ومباہات ہے۔ دوسرے لوگ خواہ کتنے ہی ذی حشم ہوں، ان کو خلیفہ سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی وہ تو خلیفہ کے غلاموں اور خدمت گاروں کا درجہ رکھتے ہیں۔ خلیفہ امیر المومنین ہے۔ اس کے سامنے مال کا ذکر کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

بڑی بحث وتمحیص کے بعد ترکان خاتون ان شرطوں پر خلیفہ سے شہزادی کا عقد کرنے پر رضامند ہوگئی۔

(۱) پچاس ہزار دینار مہر معجّل ہوگا۔
(۲) میری لڑکی کے سوا خلیفہ کے پاس کوئی بیوی یا لونڈی نہ ہوگی اور نہ وہ میری لڑکی کی خواب گاہ کے سوا کسی اور جگہ شب باش ہوگا۔

فخر الدولہ نے خلیفہ کی طرف سے ان شرطوں کو منظور کرنے کی حامی بھر لی اور صفر ۴۷۵ھ میں بغداد واپس آ گیا۔ خلیفہ مقتدی نے ان شرطوں کو منظور کر لیا اور عقد ہو گیا لیکن شہزادی کی رخصتی پانچ سال بعد ۴۸۰ھ میں ہوئی۔ دلہن جس شان سے (اصفہان سے) بغداد کی طرف روانہ ہوئی

مؤرخین نے اس کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

جہیز کا سامان ایک سوتیس اونٹوں اور چوہتر خچروں پر لدا ہوا تھا۔ اونٹوں پر دیبائے رومی کی جھولیں تھی جن پر سونے اور چاندی کا (سنہرا اور روپہلا) کام کیا ہوا تھا۔ خچروں پر دیبائے علمی کی جھولیں لٹک رہی تھیں۔ اونٹوں پر تمام سامان سونے اور چاندی کا تھا اور خچروں پر دوسرا بیش قیمت سامان تھا۔ اس کے علاوہ چھ خچروں پر قیمتی جواہرات اور زیورات سے بھرے ہوئے صندوق لدے ہوئے تھے۔ اس قطار کے آگے مرصّع زینوں والے اصیل گھوڑوں پر تینتیس سوار تھے اور تین عماریاں تھیں جو صنعت اور لاگت کے اعتبار سے بے مثل تھیں۔ ان کے ساتھ ایک بہت بڑا سنہری فرش تھا۔ اس جلوس کے پیچھے دلہن کا محفہ تھا۔ اس کے بعد ملکہ ترکان خاتون اور دوسری معزز خواتینِ بغداد کے محفے تھے۔ ان کے ساتھ تین سو کنیزوں کی پالکیاں تھیں اور خواجہ سراؤں کی تعداد کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ جدھر جدھر سے جلوس گزرتا لوگ اس پر دینار اور قیمتی کپڑے نچھاور کرتے تھے۔ اس جلوس کی نگرانی خواجہ نظام الملک طوسی اور امیر سعد الدولہ گوہر آئین (امیر برسق) کے سپرد تھی۔ جس دن یہ جلوس بغداد پہنچا، سارے شہر میں بڑے اہتمام سے چراغاں کیا گیا تھا اور بغداد کا کوچہ کوچہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ خلیفہ نے اپنے وزیر ابوشجاع اور کئی دوسرے سرکردہ امراء کو تین سو مشعل برداروں کی معیت میں جلوس کے استقبال کے لئے بھیجا۔ ابوشجاع نے ترکان خاتون کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ سیدنا و مولانا امیر المومنین نے پیغام بھیجا ہے:

ان اللّٰہ یأمر کم ان تؤدوا الامٰنٰتِ الی اھلھا. (نساء: ۵۸)

''بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے مالکوں کے سپرد کر دو''۔

ترکان خاتون نے جواب دیا: ''بسر و چشم''۔

چنانچہ جلوس حریمِ خلافت کی طرف روانہ ہوا۔ خواجہ نظام الملک دوسرے اعیانِ سلطنت کے ہمراہ آگے چل رہا تھا۔ اُن کے ساتھ سینکڑوں شمعیں اور مشعلیں روشن تھیں، ان کے بعد امرائے دولت کی خواتین کے محفے تھے جن کے اردگرد ہزار ہا خدام اور مشعل بردار تھے۔ ان کے پیچھے دلہن کا خاص محفہ تھا جس کے گرد دو سو ترکی لونڈیاں زرق برق ملبوسات میں گھوڑوں پر سوار تھیں۔ قصرِ خلافت میں شاہی خاندان اور ارکانِ دولت کی خواتین نے ترکان خاتون کا استقبال کیا۔ تمام مہمان

خواتین کو محفوں سے اتارا اور دلہن کو حجلۂ عروسی میں مسند پر جا بٹھایا۔

دوسرے دن خلیفہ مقتدی بامر اللہ نے ترکان خاتون اور ان تمام خواتین کو جو اس کے ساتھ آئی تھیں، بیش قیمت خلعت بھیجے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شاندار دعوتِ ولیمہ کا اہتمام کیا۔ اس میں تمام سردارانِ لشکر، امراء دولت، رؤسائے شہر، چھوٹے بڑے تمام ملازموں، اہلِ خدمت اور غرباء و مساکین کو کھانا کھلایا گیا۔ جس شان کی یہ دعوت تھی اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف شکر اس میں چالیس ہزار من صَرف ہوئی۔ دعوتِ ولیمہ کے بعد خلیفہ نے تمام سردارانِ لشکر اور اعیانِ سلطنت کو خلعت عنایت کیے۔ اس طرح نہایت پُر مسرت ماحول میں یہ تقریب ختم ہوگئی۔

علامہ ابن اثیرؒ کا بیان ہے کہ اہلِ بغداد نے اس شان کی شادی اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

سلطان ملک شاہ کے آخری زمانے میں ترکان خاتون وزیر اعظم خواجہ نظام الملک طوسی سے اس بنا پر ناراض ہوگئی کہ وہ اس کے نابالغ بیٹے محمود کے بجائے شاہزادہ برکیا روق کو ولی عہد بنانے کا حامی تھا جو ملک شاہ کی دوسری بیگم زبیدہ بنت یاقوتی بن داؤد کے بطن سے تھا۔ اس کی یہی ناراضی خواجہ نظام الملک کی معزولی پر منتج ہوئی۔

شوال ۴۸۵ھ میں سلطان ملک شاہ نے قیامِ بغداد کے دوران میں وفات پائی تو ملکہ ترکان خاتون نے اس کی موت کو مخفی رکھا اور اس کی میت نہایت خاموشی سے اصفہان روانہ کر دی جہاں اس کو مدرسۂ اعظم میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ترکان خاتون خود بھی اصفہان پہنچ گئی اور اپنے بیٹے محمود کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ساتھ ہی شہزادہ برکیا روق کو اپنے آدمی بھیج کر گرفتار کر لیا لیکن برکیا روق اپنے چند ہوا خواہوں کی مدد سے اصفہان کے قید خانے سے فرار ہوگیا۔ اس کے بعد برکیا روق اور محمود (یا دوسرے لفظوں میں ترکان خاتون) کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ۴۸۷ھ تک ملک کی یہ کیفیت تھی کہ دارالسلطنت اصفہان اور اس کے متعلقات پر ترکان خاتون کا قبضہ تھا اور باقی سلطنت کے بیشتر علاقے برکیا روق کے زیرِ اقتدار تھے۔ اسی اثناء میں ترکان خاتون کا وقتِ آخر آ پہنچا اور اس نے رمضان ۴۸۷ھ میں پیکِ اجل کو لبیک کہا۔ اس کے ایک ماہ بعد اس کا چہیتا بیٹا محمود بن ملک شاہ بھی چیچک میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ (نظام الملک طوسی۔ مشاہیر نسواں وغیرہ)

بی بی اسماء

یمن کے حکمران ابو کامل علی بن محمد صلیحی (۴۲۹ھ تا ۴۷۳ھ) کی اہلیہ تھی۔ (بنو صلیح یا صلیحی ایک شیعی خاندان تھا جو یمن پر ۴۲۹ھ سے ۴۹۲ھ تک حکمران رہا۔ صلیحی حکمرانوں کا پایۂ تخت صنعاء تھا)

اسماء حسن و جمال، تدبیر و دانش، علم و فضل اور شجاعت میں بے مثال تھی۔ وہ اپنے شوہر کی بنتِ عم تھی۔ علی بن محمد کو دشمنوں سے جو معرکے پیش آئے اسماء ان سب میں اس کی دست و بازو بنی رہی۔ ایک دفعہ جب وہ اپنے شوہر کی معیت میں مکہ معظمہ جا رہی تھی کہ اچانک دشمنوں نے چھاپہ مارا۔ علی بن محمد کے ساتھ آدمی کم تھے۔ اس کو شکست ہوئی اور اسماء دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو گئی۔ وہ ایک عرصہ تک ان کے پاس قید رہی۔ اس پر سخت پہرہ رہتا تھا لیکن اس نے اپنی رہائی کے لیے ایک عجیب ترکیب کی۔ ایک قاصد کو جو ایک گداگر کی صورت میں تھا اس نے روٹی کے اندر ایک خط رکھ کر اپنے بیٹے المکرّم احمد کے پاس روانہ کیا۔ اس خط میں ضروری ہدایات درج تھیں۔ یہ خط ملتے ہی مکرم ایک بھاری فوج لے کر دشمن پر حملہ آور ہوا اور اپنی ماں کو آزاد کرا لیا۔ اسماء نے ۴۹۷ھ میں وفات پائی۔

(خواتین اسلام کی بہادری بحوالہ تاریخ عمارۂ یمنی)

❁❁❁❁

ملکہ اَمَۃُ الحبیب

امیر تیمور گورگان (۷۷۱ھ، ۱۳۶۹ء تا ۸۰۷ھ، ۱۴۰۴ء) کی بیگم تھی۔ والد کا نام یزدانی تھا جو چوتھے عثمانی فرمانروا سلطان بایزید اوّل (۷۹۲ھ، ۱۳۸۹ء تا ۸۰۷ھ، ۱۴۰۴ء) کی فوج کا ایک جرنیل تھا۔ امۃ الحبیب ترکستان میں پیدا ہوئی۔ والد نے اس کو دوسرے علوم کے علاوہ شہسواری اور فنونِ سپہ گری سکھانے کا بھی خاص اہتمام کیا۔ چنانچہ جوان ہو کر وہ اپنے باپ کا دست و بازو بن گئی اور کئی فوجی مہموں میں اس کے ساتھ شریک ہوئی۔ ۸۰۴ھ، ۱۴۰۱ء میں امیر تیمور نے سلطنتِ عثمانیہ پر یلغار کی تو سلطان بایزید نے انگورہ (ANKARA) کے مقام پر اس کا پُر جوش مقابلہ کیا۔ ترک فوج میں یزدانی بھی اپنی بیٹی اَمَۃُ الحبیب کے ساتھ شامل تھا۔ ترک فوج کی جانبازی کے باوجود قسمت نے سلطان بایزید کا ساتھ نہ دیا اور اس نے شکست کھائی۔ امیر تیمور نے سلطان بایزید سمیت ترک فوج کے سینکڑوں سپاہیوں اور افسروں کو گرفتار کر لیا۔ امیر تیمور فطری طور پر بڑا سخت دل واقع ہوا تھا اس نے سلطان بایزید کو لوہے کے ایک بڑے پنجرے میں محبوس کر دیا اور دوسرے تمام قیدیوں کے قتل کا حکم صادر کیا۔ ان قیدیوں میں اَمَۃُ الحبیب بھی شامل تھی۔ اس وقت اس نے مردانہ فوجی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طریقے سے امیر تیمور کے سامنے پہنچ گئی اور اس کے سامنے ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی جس میں اس کو آخرت کا خوف دلایا اور اسیرانِ جنگ کے ساتھ نرم سلوک کرنے کی ترغیب دی۔ یہ تقریر کرنے کے بعد اس نے اپنا آہنی خود سر سے اتار کر زمین پر پٹک دیا اور امیر تیمور سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے بادشاہ! میری طرف دیکھ، میں ایک عورت ہوں اور موت سے بالکل نہیں ڈرتی۔ مجھے اور میری قوم کے سپاہیوں کو قتل کر کے تیرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ جس قوم میں مجھ جیسی عورتیں ہوں وہ کبھی نہیں مرسکتی۔"

اَمَۃُ الحبیب کی تقریر ایسی مؤثر تھی کہ امیر تیمور جیسے شخص کا دل بھی موم ہو گیا۔ اس نے اَمَۃُ الحبیب اور دوسرے ترک قیدیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا (البتہ بایزید کو اس نے رہا نہ کیا) رہا ہونے والے قیدیوں میں اَمَۃُ الحبیب کا باپ بھی تھا۔ امیر تیمور نے اس سے اَمَۃُ الحبیب کا رشتہ مانگ لیا جو اس نے منظور کر لیا اور یوں وہ بادشاہ بیگم بن گئی۔ امیر تیمور نے اس کو حمیدہ بانو بیگم کا خطاب دیا۔ اَمَۃُ الحبیب سے شادی کے بعد امیر تیمور صرف تین سال زندہ رہا اور ۸۰۷ھ میں فوت ہو گیا۔ اَمَۃُ الحبیب کے بطن سے اس کی جو اولاد ہوئی وہ زندہ نہ بچی۔ بیوہ ہونے کے بعد اس کے سوتیلے بیٹے نے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ آخر وہ سمرقند سے طفلس چلی گئی لیکن وہاں بھی حالات ناسازگار پائے۔ آخر اس نے قسطنطنیہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور وہیں اکسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اَمَۃُ الحبیب بڑی دانا اور علم دوست خاتون تھی۔ وہ دنیا کی کئی زبانیں جانتی تھی مثلاً ترکی، عربی، فارسی اور چینی۔ وہ یہ زبانیں نہ صرف روانی سے بولتی تھی بلکہ ان میں لکھ بھی سکتی تھی۔ اس نے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں لیکن یہ سب حوادثاتِ زمانہ کا شکار ہو گئیں۔

(تاریخِ اسلام، خلافت عثمانیہ، شرف النساء، لکھنؤ سالنامہ ۱۹۵۴ء، مسلمان خواتین کی دینی اور علمی خدمات)

❁❁❁❁

ایک عظیم مگر گمنام خاتون

بالوں کی رسی، مجاہد کے گھوڑے کی لگام

مدینہ منورہ میں ایک مجاہد "ابوقدامہ شامی" تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رومیوں کے خلاف جہاد کرنے کا شوق اور ولولہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ ایک بار وہ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ ان کے ساتھیوں نے کہا: "اے ابوقدامہ! آج آپ اپنے جہاد کا کوئی عجیب و غریب واقعہ بتائیے"۔

ابوقدامہ نے کہا کہ "ایک بار میں "رقہ" نامی شہر میں اونٹ خریدنے گیا تا کہ اس پر اپنا اسلحہ لاد سکوں۔ ایک دن میں وہاں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور کہنے لگی "اے ابوقدامہ! معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کو جہاد کی دعوت اور ترغیب دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسے بال عطا فرمائے ہیں جو میرے علاوہ کسی عورت کو عطا نہیں فرمائے۔ میں نے ان بالوں کو کاٹ کر ایک رسی بنالی ہے۔ اس پر اچھی طرح مٹی مل دی ہے تا کہ ان بالوں کو کوئی دیکھ نہ سکے۔ میری تمنا ہے کہ آپ میرے بالوں کی اس رسی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ دشمنوں کے ساتھ جہاد کے وقت آپ یا کوئی اور ضرورت مند مجاہد اس رسی کو گھوڑے کی لگام وغیرہ میں استعمال کرے۔ تا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے راستے کا غبار نصیب ہو جائے۔

نوجوان مجاہد، شہید ابن شہید

میں ایک بیوہ عورت ہوں، میرا خاوند اور خاندان سب اللہ کے راستے میں شہید ہو چکے

ہیں۔ اگر مجھے جہاد کرنے کی اجازت ہوتی تو میں بھی شریک ہوتی۔ اس نے وہ رسی مجھے دے دی اور کہنے لگی "اے ابوقدامہ! میرے شہید خاوند نے اپنے پیچھے ایک لڑکا بھی چھوڑا ہے جو قرآن کا عالم، گھڑسواری، تیراندازی کا مشاق ماہر اور خوبصورت نوجوان ہے۔ وہ راتوں کو قیام کرتا ہے اور دن کو روزے رکھتا ہے۔ اس کی عمر پندرہ سال ہے۔ ابھی وہ اپنے والد کی چھوڑی ہوئی زمین پر گیا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی روانگی سے پہلے آ جائے۔ میں اسے اللہ تعالیٰ کے حضور بطور ہدیہ آپ کے ساتھ میدان جہاد میں بھیج دوں گی۔ میں آپ کو اسلام کی حرمت کا واسطہ دیتی ہوں کہ میری اجر و ثواب حاصل کرنے کی تمنا ضرور پوری کریں۔

ابوقدامہؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے وہ رسی لے لی اور اسے اپنے سامان میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں رفقاء سمیت "رقہ" سے روانہ ہو گیا۔ ابھی ہم مسلمہ بن عبدالملک کے قلعہ کے پاس پہنچے تھے کہ ایک گھڑسوار نے مجھے پیچھے سے آواز دی، ہم رک گئے۔ میں نے ساتھیوں سے کہا، تم لوگ چلتے رہو۔ میں اس گھڑسوار کو دیکھتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں وہ گھڑسوار آ پہنچا اور اس نے ملاقات کے بعد کہا: "اے عزیز! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے آپ کی ہمراہی سے محروم نہیں فرمایا اور مجھے ناکام نہیں لوٹایا"۔ میں نے کہا: "اے عزیز! اپنے چہرے سے کپڑا ہٹاؤ تاکہ میں تمہیں دیکھ کر فیصلہ کر سکوں کہ تم پر جہاد لازم ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر لازم ہوگا تو ساتھ لے جاؤں گا ورنہ واپس لوٹا دوں گا۔ اس نے چہرہ کھولا تو وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ایک نہایت حسین و جمیل لڑکا تھا۔ اس کے چہرے پر ناز و نعمت کے آثار چمک رہے تھے۔ میں نے کہا: "بیٹا تمہارے والد زندہ ہیں؟"

اس نے کہا: "آپ کے ساتھ اپنے والد کا انتقام لینے کے لئے نکلا ہوں۔ وہ اللہ کے راستے میں شہید ہو چکے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ مجھے اللہ ان کی طرح قبول فرمالے"۔ میں نے پوچھا "اے بیٹے! کیا تمہاری والدہ نہیں ہے؟" اس نے کہا: "میری والدہ زندہ ہیں"۔ میں نے کہا: "جاؤ ان سے اجازت لے کر آؤ۔ اگر اجازت دیں تو آ جاؤ ورنہ ان کی خدمت کرو کیونکہ جنت تلواروں کے سائے اور ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔" نوجوان نے کہا: "اے ابوقدامہ! آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں اس خاتون کا بیٹا ہوں جس نے آپ کو اپنے بالوں کی رسی دی ہے۔ میں انشاء اللہ شہید ابن شہید ہوں۔ آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں آپ مجھے جہاد سے محروم نہ کریں۔ میں نے

قرآن مجید حفظ کر لیا ہے اور حضور اقدس ﷺ کی سنت کا علم بھی حاصل کر لیا ہے۔ گھڑ سواری اور تیر اندازی بھی سیکھ چکا ہوں بلکہ میں نے اپنے علاقے میں اپنے پیچھے اپنے جیسا کوئی گھڑ سوار نہیں چھوڑا۔ آپ میری عمر کو نہ دیکھیں۔ میری والدہ نے مجھے قسم دی ہے کہ میں واپس لوٹ کر ان کے پاس نہ جاؤں اور انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اے پیارے بیٹے! کافروں سے ڈٹ کر ثابت قدمی کے ساتھ لڑنا اور اپنی جان اللہ تعالیٰ کو پیش کرنا اور اللہ کے قرب کی جستجو کرنا اور اپنے شہید والد اور ماموں صاحبان کے ساتھ جنت میں ملنے کی کوشش کرنا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شہادت کی نعمت نصیب فرمائے تو پھر قیامت کے دن میری شفاعت کرنا کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہید قیامت کے دن اپنے ستر اہل خانہ اور ستر پڑوسیوں کی شفاعت کر دے گا۔ پھر میری ماں نے مجھے سینے سے لگا کر بھینچا اور اپنا رخ آسمان کی طرف کر کے کہا: ''اے میرے اللہ! اے میرے آقا! اے میرے مولا! یہ میرا بچہ ہے۔ میرے دل کا پھول، کلیجے کا ٹکڑا ہے۔ میں اسے تیرے سپرد کر رہی ہوں۔ اسے اپنے والد کے قریب کر دے''۔

ابو قدامہؒ کہتے ہیں کہ میں نے جب یہ باتیں سنیں تو میں رونے لگا۔ لڑکے نے کہا: ''اے چچا جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اگر آپ کو میرا بچپن دیکھ کر رونا آ رہا ہے تو اگر مجھ سے بھی چھوٹی عمر والا کوئی شخص نافرمانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے بھی عذاب دے گا''۔ میں نے کہا: ''میں تمہاری چھوٹی عمر پر نہیں رو رہا بلکہ میں تمہاری والدہ کے دل کا سوچ کر رو رہا ہوں اور اس بات پر بھی کہ تمہاری شہادت کے بعد اس پر کیا گزرے گی۔ بہرحال ہمارا لشکر روانہ ہو گیا۔ میں نے اس لڑکے کے معمولات پر غور کیا جو اللہ کے ذکر سے بالکل غافل نہیں ہوتا تھا۔ جب ہمارا لشکر چلتا تو وہ ہم میں بہترین گھڑ سوار تھا اور جب ہم کسی منزل پر رکتے تو وہ ہمارا خدمت گار بن جاتا تھا۔ وہ مسلسل اپنے عزم کو مضبوط اور اپنی چستی کو دوبالا اور اپنے دل کو صاف ستھرا کرنے میں لگا رہتا تھا اور خوشی کے آثار اس کے چہرے سے پھوٹتے نظر آتے تھے۔

خواب میں باغاتِ بہشت کی سیر

ایک دن غروب آفتاب کے وقت ہم نے دشمن کے علاقے کے بالکل قریب پہنچ کر پڑاؤ

ڈالا۔ چونکہ ہم روزے دار تھے اس لیے وہ نوجوان ہمارے افطار کے لئے کھانا بنانے لگا۔ اچانک اسے اونگھ آ گئی۔ وہ سو گیا اور نیند کے دوران مسکرانے لگا۔ جب وہ بیدار ہوا تو میں نے کہا: "بیٹے! آپ نیند میں ہنس رہے تھے"۔ اس نے کہا: "میں نے ایک ایسا عجیب خواب دیکھا جس نے مجھے خوشی سے ہنسا دیا"۔ میں نے پوچھا: "تم نے خواب میں کیا دیکھا؟" کہنے لگا: "میں نے دیکھا کہ میں عجیب وغریب باغ میں ہوں۔ میں اس میں گھوم پھر رہا تھا کہ میں نے چاندی کا ایک محل دیکھا۔ جس پر موتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے سونے کے دروازے پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کچھ نوجوان لڑکیوں نے پردے ہٹائے۔ ان لڑکیوں کے چہرے چاند کی طرح خوبصورت تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو خوش آمدید کہنے لگیں۔ میں نے ان میں سے ایک کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تو اس نے کہا: "جلدی نہ کرو، ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ پھر میں نے سنا کہ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہی تھیں کہ یہ مرضیہ کا خاوند ہے۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگیں: "تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو، آگے بڑھو! میں آگے بڑھا تو محل کے اوپر والے حصے پر سرخ سونے کا ایک کمرہ تھا۔ جس میں سبز زمرد کی ایک مسہری تھی۔ جس کے پائے چاندی کے تھے۔ اس پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کا چہرہ سورج کی طرح تابناک تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ میری نظروں کو مضبوط نہ فرماتے تو کمرے کا حسن اور لڑکی کی خوبصورتی دیکھ کر میری عقل زائل ہو جاتی اور میری آنکھیں دیکھنے کے قابل نہ رہتیں۔ جب اس لڑکی نے مجھے دیکھا تو کہنے لگی: "خوش آمدید! خوش آمدید! اے اللہ کے ولی اور اس کے محبوب! تم میرے ہو اور میں تمہاری ہوں"۔

ابو قدامہؒ کہتے ہیں کہ خواب سن کر میں نے کہا: "بیٹے! تم نے بڑی خیر کی بات دیکھی ہے۔ اب خیر ہی ہوگی (انشاء اللہ)۔ صبح کے وقت اعلان جنگ ہو گیا۔ ہر طرف سے آوازیں لگنے لگیں۔ "اے اللہ کے سپاہیو! سوار ہو جاؤ اور جنت کی بشارت پاؤ!"۔

اسی اثناء میں دشمن کا ٹڈی دل لشکر سامنے آ گیا۔ ہم میں سے سب سے پہلے اسی نوجوان نے حملہ کیا اور دشمنوں کو خوب قتل کیا اور ان کے جتھے کو اس نے توڑ دیا اور ان کی صفوں کے اندر تک گھستا چلا گیا۔ میں نے اسے اس طرح لڑتے دیکھا تو اس کے قریب آ کر میں نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور کہا: "اے بیٹے! تم ابھی بچے ہو اور لڑائی کے گر ول سے ناواقف ہو۔ اس لئے پیچھے

واپس چلو اور اس طرح سے دشمن کے درمیان نہ گھسو"۔ اس نے کہا: "چچا جان! آپ نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی "اے ایمان والو! جب تم کافروں سے میدان جنگ میں لڑو تو پیٹھ نہ پھیرو!"۔

نوجوان نے جام شہادت پی لیا

اے چچا جان! آپ چاہتے ہیں کہ میں پیچھے ہٹ کر دوزخ والوں میں سے ہو جاؤں۔ ہم دونوں باتیں کر رہے تھے کہ دشمن نے ہم پر یک بارگی حملہ کر دیا اور وہ ہم دونوں کے درمیان حائل ہو گئے اور ہر شخص اپنے طور پر لڑائی میں لگ گیا۔ اس دن بہت سارے مسلمان شہید ہو گئے۔ جب لڑائی تھمی تو مقتولوں کی تعداد گننے میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اپنے گھوڑے پر مقتولین کے درمیان گھومنے لگا۔ ان کا خون زمین پر بہہ رہا تھا اور خون اور غبار کی کثرت کی وجہ سے ان کے چہرے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ ابھی میں گھوم ہی رہا تھا کہ میں نے اسی نوجوان لڑکے کو گھوڑوں کے سموں کے درمیان مٹی اور خون میں تڑپتے دیکھا وہ زخمی حالت میں کہہ رہا تھا: "اے مسلمانو! میرے چچا ابوقدامہ کو میرے پاس بھیجو۔ میں آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ خون، غبار اور سموں کے نیچے روندے جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے کہا: "میں ابوقدامہ ہوں"۔

اس نے کہا: "اے چچا جان! رب کعبہ کی قسم، میرا خواب سچا نکلا۔ میں اسی رسی والی خاتون کا بیٹا ہوں۔ ابوقدامہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے گود میں لے لیا اور اس کی پیشانی کا بوسہ لے کر اس کے چہرے سے خون اور غبار صاف کرنے لگا۔ میں نے کہا: "پیارے بیٹے! قیامت کے دن شفاعت کے وقت اپنے چچا ابوقدامہ کو نہ بھول جانا"۔ اس نے کہا: "آپ جیسوں کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ آپ تو اپنے کپڑوں سے میرا چہرہ صاف کر رہے ہیں۔ حالانکہ میرے کپڑے اس خون اور خاک کے زیادہ مستحق ہیں۔ چچا جان مجھے اس طرح چھوڑ دیں تاکہ میں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کروں۔ چچا جان! وہ حور عین جس کا میں نے رات کو آپ سے تذکرہ کیا تھا، میرے سرہانے کھڑی ہے۔ اور مجھے کہہ رہی ہے کہ جلدی کیجئے۔ میں بہت مشتاق ہوں۔ چچا جان!! اگر آپ واپس چلے گئے تو میری غمگین اور بے چین ماں کو میرے یہ خون آلود کپڑے دیجئے گا تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی وصیت کو پورا کیا ہے۔ اور دشمنوں کے ساتھ مقابلہ میں، میں نے بزدلی

نہیں دکھائی اور میری طرف سے اسے سلام بھی کہہ دیجئے گا اور کہیے گا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا تحفہ قبول کر لیا ہے۔ اے چچا جان! میری ایک چھوٹی سی بہن ہے وہ ابھی دس سال کی ہے۔ میں جب گھر آتا تھا تو وہ سلام کر کے میرا استقبال کرتی تھی اور جب میں گھر سے نکلتا تھا تو وہی سب سے آخر میں مجھ سے جدا ہوتی تھی۔ ابھی جب میں آ رہا تھا تو اس نے مجھے رخصت کرتے وقت کہا تھا کہ بھائی جان! اللہ کے واسطے واپس آنے میں زیادہ دیر نہ کرنا۔ جب آپ کی اس سے ملاقات ہو تو اسے میرا سلام کہیے گا۔ اور کہیے گا کہ تمہارے بھائی نے کہا ہے، اے پیاری بہن! اب قیامت تک اللہ تمہارا نگہبان ہے۔ پھر وہ مسکرایا اور اس نے کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہ وقت ہے جس کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول سچے ہیں''۔

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی روح پرواز کر گئی۔ ہم نے اسے دفن کر دیا۔ اللہ اس سے اور ہم سے راضی ہو جائے۔

خاتون خوش ہو جاؤ، تمہارا تحفہ قبول ہوا

ہم جب اس لڑائی سے واپس لوٹے تو ''رقہ'' شہر بھی آئے۔ میں فوراً اس نوجوان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت بچی جو شکل اور خوبصورتی میں اس نوجوان جیسے تھی۔ دروازے پر کھڑی ہے اور ہر گزرنے والے شخص سے پوچھتی ہے: ''چچا جان! آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟'' وہ جواب دیتا جہاد سے، تو پھر پوچھتی ہے: ''کیا میرا بھائی آپ کے ساتھ واپس نہیں آیا؟''۔ وہ کہتا: ''میں تمہارے بھائی کو نہیں پہچانتا''۔ ابوقدامہؓ کہتے ہیں: ''میں نے جب یہ سنا تو میں اس کے پاس پہنچا۔ مجھ سے بھی اس نے وہی پوچھا کہ چچا جان! آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟'' میں نے کہا: ''جہاد سے''۔ کہنے لگی: ''کیا میرا بھائی آپ کے ساتھ نہیں آیا؟'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور کہنے لگی کہ کیا ہو گیا؟ سارے لوگ آ رہے ہیں میرا بھائی ابھی تک نہیں آیا۔ اس کی یہ بات سن کر مجھے بہت رونا آیا۔ (بہنیں، بہنیں ہی ہوتی ہیں جو بھائیوں کی جدائیاں بڑی مشکل سے برداشت کرتی ہیں) مگر میں نے اس بچی کی خاطر خود کو سنبھال لیا۔ میں نے کہا: ''بیٹی اس گھر کی

مالکن کو بتاؤ کہ ابوقدامہ سے بات کرلے۔ میری آواز سن کر وہ خاتون آئیں۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا اور کہنے لگیں: ''ابوقدامہ! خوشخبری دینے آئے ہو یا تعزیت کرنے؟'' میں نے کہا: ''مجھے اپنی بات کا مطلب سمجھایئے''۔ کہنے لگیں: ''اگر میرا بیٹا واپس آ گیا ہے تو پھر تم تعزیت کرو۔ اگر شہید ہو گیا تو تم خوشخبری سنانے والے ہو''۔ میں نے کہا: ''خوش ہو جاؤ! اللہ نے تمہارا تحفہ قبول کرلیا ہے''۔ وہ رونے لگی اور کہنے لگی: ''کیا واقعی قبول فرمالیا ہے؟'' میں نے کہا: ''ہاں!''۔ وہ کہنے لگی: ''تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اسے میرے لئے آخرت کا ذخیرہ بنا دیا''۔ پھر میں بچی کی طرف بڑھا اور میں نے کہا: ''بیٹی! تمہارے بھائی نے سلام کیا ہے کہ میرے بعد اللہ تمہارا نگہبان ہے''۔ یہ سن کر بچی نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے ہلایا تو اس کی روح پرواز کر چکی تھی۔ میں نے نوجوان کے کپڑے اس کی والدہ کے سپرد کئے اور میں نوجوان اور بچی کے انتقال پر صدمے اور اس عورت کے صبر و استقلال پر تعجب کے ساتھ واپس آ گیا۔

قربان جائیں، ایسی ماؤں پر! جو اپنے تمام گھر کے افراد کو جہاد کے موقع پر شہید ہونے کے باوجود اپنے بیٹے کی شہادت کی منتظر رہتی ہیں۔ آج بھی کچھ ایسی مائیں ہیں جو بیٹوں کی شہادت کی شدت سے منتظر ہیں اور تڑپتی ہیں۔

✿✿✿✿

ملکہ رضیہ سلطانہ

رضیہ سلطانہ جسے رضیہ سلطان بھی کہا جاتا ہے پہلی اور آخری مسلمان خاتون ہے جو دِلّی کے تخت پر بیٹھی اور ۶۳۴ھ، ۱۲۳۷ء سے ۶۳۷ھ، ۱۲۴۰ء تک ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ خاندانِ غلاماں کے تیسرے فرمانروا سلطان شمس الدین التمش (۶۰۷ھ، ۱۲۱۰ء تا ۶۳۳ھ، ۱۲۳۶ء) کی بیٹی اور اسی خاندان کے پہلے فرمانروا سلطان قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء تا ۶۰۷ھ، ۱۲۱۰ء) کی نواسی تھی۔ بچپن ہی سے بڑی ذہین و فطین تھی۔ علم دوست والد نے اس کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی۔ رضیہ نے ابتداء میں قرآنِ پاک پڑھا، پھر اونچے درجے کے علماء سے مروّجہ علوم کی تعلیم پائی۔ اس کے ساتھ ہی عربی فارسی اور ترکی میں اعلیٰ دستگاہ حاصل کی۔ علاوہ ازیں اس نے فنونِ حرب و ضرب بھی سیکھے اور شہسواری، شمشیر زنی، اور نشانہ بازی میں بھی طاق ہوگئی۔ اس کے اعلیٰ اوصاف و خصائل کی بنا پر التمش اس کو بے حد عزیز جانتا تھا۔ وہ اس کو کاروبارِ حکومت چلانے کے گُر بھی بتاتا رہتا تھا اور وقتاً فوقتاً امورِ مملکت میں اس سے مشورہ بھی لیتا تھا۔ اگر کسی مہم کے سلسلے میں اسے دارالحکومت سے باہر جانا پڑتا تو بیٹوں کی موجودگی کے باوجود وہ رضیہ ہی کو اپنا جانشین بنا کر جاتا۔ وہ اس کی غیر حاضری میں حکومت کے تمام کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتی اور نظم ونسق میں کسی قسم کا خلل نہ پڑنے دیتی۔ اس طرح اس کو التمش کی زندگی ہی میں حکومت سنبھالنے اور انتظامی امور سے نبٹنے کی عملی تربیت مل گئی تھی۔

مشہور سیاح ابنِ بطوطہ نے جو محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا، اپنے سفرنامے

میں لکھا ہے کہ...... ''رضیہ مردانہ لباس میں تمام ہتھیار لگا کر گھوڑے پر سوار باہر نکلتی تھی، ہندوستان کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ جب وہ شکار کو جاتے تھے تو اپنے ساتھ حرم کی خواتین کو بھی لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ التمش شیر کے شکار کو گیا۔ خواتین پیچھے تھیں کہ ایک شیر جنگل سے نکل بادشاہ پر جھپٹا، عین اس وقت رضیہ برق رفتاری سے لپک کر وہاں پہنچی اور تلوار کا ایسا بھرپور وار شیر پر کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اگر وہ نہ پہنچ گئی ہوتی تو بادشاہ بری طرح زخمی ہو گیا ہوتا۔'' اس واقعہ کے بعد التمش کی نظر میں رضیہ کی وقعت دو چند ہو گئی۔

''فتوح السلاطین'' کے مصنف عصامی کا بیان ہے کہ:......

''رضیہ کو ذہانت اور خوبصورتی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ شہزادگی ہی کے زمانے میں اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ بڑے بڑے جہاندیدہ مدبر اس کی ذہانت اور لیاقت کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ اگرچہ رضیہ کے بھائی موجود تھے لیکن سلطان التمش کو جب بھی سرکشوں کی سرکوبی کرنے کے لئے دارالحکومت سے باہر جانا پڑتا، وہ دلی میں رضیہ ہی کو اپنا نائب بنا کر جاتا۔ اس کو اس بات کا احساس تھا کہ عورت کی حکمرانی اس کے عمائدِ سلطنت کو ناگوار گزرے گی چنانچہ ایک مرتبہ اس نے اپنے اقدام کے جواز میں امراء حکومت کے سامنے یہ تقریر کی کہ ''یہ درست ہے کہ میری بیٹی رضیہ عورت ہے مگر اس میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ اس کا دل ودماغ مردوں جیسا ہے اور جتنا میرے سارے بیٹوں کا حوصلہ اور دماغ ہے اس سے کہیں بڑھ کر رضیہ علم ودانش ہمت اور دلاوری سے بہرہ مند ہے۔''

سلطان التمش کے آٹھ بیٹے تھے۔ ایک بیٹا اس کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا باقی سات پر قابلیت اور حسنِ سیرت کے اعتبار سے وہ رضیہ کو ترجیح دیتا تھا۔ چنانچہ وفات سے پہلے اس نے رضیہ ہی کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس نے بسترِ مرگ پر اپنے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تاج وتخت سونپ دیا لیکن بیشتر مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس کی خواہش یہی تھی کہ اس کے بعد رضیہ ہی تخت حکومت پر بیٹھے۔ التمش نے وفات پائی تو امرائے دربار نے عورت کی حکمرانی کو ناپسند کرتے ہوئے اس کے ایک بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ وہ پرلے درجے کا عیاش اور

اوباش نوجوان تھا۔ ہر وقت شراب کے نشے میں دُھت رہتا تھا اور سلطنت کا انتظام اس کی ماں شاہ ترکان چلاتی تھی۔ وہ بڑی سنگدل عورت تھی اس کے مظالم سے لوگوں میں سخت بے چینی پھیل گئی۔ آخر ۶۳۴ھ میں دلی کے عوام اور فوج کے ایک حصے کی جانب سے رکن الدین فیروز کو معزول کر کے رضیہ کے ملکہ ہونے کا اعلان کر دیا گیا...... وہ رضیہ سلطان کا لقب اختیار کر کے بڑی شان و شوکت سے تختِ شاہی پر متمکن ہوئی اور عامۃ الناس سے وعدہ کیا کہ وہ ان کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ بھی اس کے بس میں ہے کرے گی۔ رضیہ سلطان کے اوصافِ حمیدہ کے باوجود، وزیرِ سلطنت نظام الملک محمد جنیدی اور متعدد دوسرے عمائدِ سلطنت، ملک علاؤ الدین شیر خانی، ملک سیف الدین کوچی، ملک اعز الدین کبیر خانی وغیرہ نے اس کو ملکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خلاف بغاوت کی تیاری میں مشغول ہو گئے لیکن رضیہ سلطان نے تنہا اپنی تدبیر و شجاعت سے ان میں پھوٹ ڈلوادی اور پھر ان کو ایسا زچ کیا کہ وہ ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے مگر کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔

رضیہ سلطان نے ان تمام قوانین وضوابط کو جو اس کے والد کے عہد میں نافذ تھے اور رکن الدین فیروز کے زمانے میں منسوخ کر دیئے گئے تھے ازسرِ نو قائم کیا اور مختلف عہدوں پر ایسے لوگوں کا تقرر کیا جو بڑے قابل اور باصلاحیت تھے۔ ''تاریخ فرشتہ'' میں ہے کہ ''سلطان رضیہ ایسے تمام اوصاف سے مزین تھی جو ایک عاقل اور صاحبِ رائے بادشاہ کے لئے ضروری ہیں۔ اصحابِ نظر اس میں سوائے اس کے کہ وہ عورت تھی، کوئی اور عیب نہیں پاتے تھے۔ وہ قرآن مجید پورے آداب کے ساتھ پڑھا کرتی تھی اور دوسرے علوم سے بھی آگاہی رکھتی تھی۔ اپنے باپ کے زمانہ ہی سے ملکی معاملات میں دخل دیا کرتی تھی اور فرمانروائی کیا کرتی تھی۔ سلطان اس کی عقل و فراست اور فرزانگی دیکھ کر مانع نہ ہوتا۔''

رضیہ سلطان کا نظامِ حکومت نہایت عادلانہ تھا۔ وہ امیر غریب، مسلم اور غیر مسلم ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتی تھی۔ مظلوموں کی فریاد سنتی اور ظالموں کو سزا دیتی تھی۔ شاہی ملازمین میں سے کسی کو رشوت لینے کی مجال نہ تھی۔ وہ مردانہ لباس پہنتی اور قباء کلاہ کے ساتھ دربار کیا کرتی تھی۔ ہاتھی پر بھی سوار ہوتی تھی لیکن گھوڑے کی سواری اُسے بہت پسند تھی۔ جنگ کے وقت فوج کو خود مرتب کرتی تھی اور اپنے سپاہیوں کے دوش بدوش میدانِ رزم میں دادِ شجاعت دیتی تھی۔ اپنے دور

حکومت کے آخر میں اس نے پردہ ترک کر دیا تھا اور بلا نقاب دربار میں آتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک پردہ سلطنت کے کام کاج میں حارج ہوتا تھا۔ اس نے قاضی کبیر الدین، قاضی نصیر الدین، قاضی سعید الدین اور قاضی جلال الدین پر مشتمل ایک مجلسِ قضاۃ قائم کی جس کے مشورے سے جملہ احکام صادر کیے جاتے تھے۔

رضیہ سلطان نے نظامِ سلطنت کو کامیابی سے چلانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن اس کو امن چین سے بیٹھنا بہت کم نصیب ہوا کیونکہ متعدد امراء اس کے خلاف سازشوں میں برابر مصروف رہے۔ ان کی مخالفت کے مختلف اسباب تھے جن میں سے کچھ یہ تھے۔

(۱) وہ عورت کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتے تھے اور اسے اپنے لیے باعثِ توہین سمجھتے تھے۔

(۲) اس کے مردانہ لباس پہننے اور بے نقاب دربار میں آنے کو وہ ناجائز سمجھتے تھے۔

(۳) ملکہ نے ایک حبشی غلام ملک جمال الدین یاقوت کو جو شاہی اصطبل کا مہتمم تھا، ترقی دے کر میرِ شکار کے عہدے پر فائز کر دیا اور ساتھ ہی اس کو امیر الامراء کا خطاب دیا۔ اس عنایتِ خسروانہ کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک لڑائی میں اس نے ملکہ کی جان بچائی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یاقوت ایک قابل اور باصلاحیت آدمی تھا اسی لیے ملکہ نے اس کو ترقی کا مستحق سمجھا لیکن تُرک امراء نے اس کو غلط معنی پہنائے، اس کی ترقی کو انہوں نے اپنی توہین سمجھا اور ملکہ پر تہمت طرازی کی۔

مخالف امراء کی سازشوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ پہلے لاہور کے حاکم ملک عزیز الدین نے علَمِ بغاوت بلند کیا۔ ملکہ اس کی سرکوبی کے لیے فوج لے کر خود روانہ ہوئی۔ حاکمِ لاہور کو مقابلے پر آنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے بغیر جنگ کے اطاعت قبول کر لی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ملک اختیار الدین التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ ملکہ اس کی سرکوبی کے لیے لشکر لے کر دِلّی سے چلی۔ ایک روایت کے مطابق اسے شکست ہوئی اور وہ گرفتار کر لی گئی۔ دوسری روایت کے مطابق سازشیوں نے اس کے خیمے پر شب خون مارا اور اسے گرفتار کر کے ملک التونیہ کے سپرد کر دیا۔ دوسری طرف دِلّی میں مخالف ترک امراء نے یاقوت کو قتل کر کے رضیہ سلطان کے بھائی معز الدین بہرام کو تختِ شاہی پر بٹھا دیا۔ یہ واقعہ رمضان ۶۳۶ھ کا

ہے۔اُدھر ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ سے شادی کر لی۔ پھر دونوں لشکر لے کر کھوئے ہوئے تخت کی بازیابی کے لیے دِلّی کی طرف روانہ ہوئے مگر کیتھل کے قریب معزالدین بہرام شاہ کی فوج سے شکست کھائی۔ دوسرے دن اس کے حکم سے ملک التونیہ اور رضیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ (۲۷ر رمضان المبارک ۶۴۰ھ) اور وہیں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں رضیہ سلطان کے چھوٹے بھائی سلطان ناصرالدین محمود نے دونوں کی قبروں پر ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا جو آج بھی کیتھل (ضلع کرنال مشرقی پنجاب بھارت) میں کھنڈر کی صورت میں موجود ہے۔اس سے ملحق ایک مسجد کے بھی کچھ آثار باقی ہیں۔

رضیہ سلطان کی موت کا ایک اور قصہ بھی بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ ملک التونیہ تو قتل کر دیا گیا لیکن رضیہ جان بچا کر جنگل میں چھپ گئی۔ جب بھوک پیاس نے تنگ کیا تو ایک دہقان سے کھانے کو کچھ مانگا۔تھوڑی سی روٹی کھا کر وہ ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر سو گئی۔اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی لیکن نیند کی حالت میں کپڑے اِدھر اُدھر کھسکے تو دہقان کو معلوم ہو گیا کہ وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے،اس نے زیوروں کے لالچ میں اسے سوتے میں قتل کر ڈالا اور وہیں دفن کر دیا۔ جب وہ زیورات فروخت کرنے شہر گیا تو پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ پر اس نے سارا واقعہ بتا دیا۔ چنانچہ ملکہ کی نعش کو وہاں سے نکال کر دِلّی کے قریب دریائے جمنا کے کنارے دفن کیا گیا۔یہ قبر اب بھی موجود ہے اور لوگ اسے "رجی کی درگاہ" کہتے ہیں۔(واللہ اعلم بالصواب)

ملکہ رضیہ سلطان کا دورِ حکومت صرف تین سال اور تین ماہ پر محیط ہے۔اس مدت کا بیشتر حصہ انتشار کی حالت میں گزرا پھر بھی اس کے دورِ حکومت کے کئی خوشگوار واقعات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ بڑی باتدبیر، زیرک، بہادر، انصاف پسند، خوش اخلاق، اور علم دوست خاتون تھی۔ حنفی المسلک اور علماء وصوفیہ کی بڑی عقیدت مند اور قدر دان تھی۔اس نے متعدد مدرسے قائم کیے اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلفاء کی تبلیغ اسلام میں اعانت کی۔اس نے مہرولی میں اپنے والد کا شاندار مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔

طبقاتِ ناصری کے مصنف مولانا منہاج سراج نے اس کو"عالم نواز" (یعنی علماء وفضلاء کی قدر دان) کا خطاب دیا ہے۔

ملکہ رضیہ سلطان کو شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق تھا وہ فارسی کی نغز گو شاعرہ تھی اور شیریںؔ تخلص کرتی تھی۔ تذکروں میں اس کے یہ چند اشعار محفوظ ہیں:

غلطیدن نور رُخِ خورشید ازیں چہ
بسمل شدۂ تیغ نگاہ غضب ماست
از ماست کہ بر ماست چہ تقصیر دلِ زار
آں کشتۂ اندازِ غم بے سبب ماست

......☆......

دردہانِ خود دارم عندلیب خوش الحاں
پیشِ من سخن گویاں زاغ در دہن دارند

......☆......

کنم بحرکتِ پا چرخ تختِ سلطانی
دہم ببالِ ہُما خدمتِ مگس رانی

......☆......

باز آ شیریںؔ ، منہ در راہِ الفت گامِ خویش
ہاں دلے نشنیدہ باشی قصۂ فرہاد را

(طبقات ناصری۔ مشاہیر نسواں۔ ناموران عالم۔ دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰،
''نگار'' لکھنؤ پاکستان نمبر جنوری فروری ۱۹۴۸ء۔
سیارہ ڈائجسٹ لاہور مارچ ۱۹۸۸ء، خواتینِ اسلام کی بہادری)

✿✿✿✿✿

شہزادی گیتی آراء

(ولادت ۷۸۰ھ)

بنت آمنہ

کئی سو سال پہلے کی بات ہے کہ ملک ''زابلستان'' پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا اس کا نام علی مردان خان تھا۔ ۷۸۰ء میں علی مردان کے سرسبز وشاداب ازدواجی باغ میں ایک کلی کھلی۔ بادشاہ نے شہزادی کا نام ''گیتی آراء'' رکھا۔ یہ وقت تھا جب یورپ جہالت اور تعصب کے دلدل میں پھنسا ہوا تھا اور اسلام کا ستارہ اوج ثریا پر چمک رہا تھا۔ دن تیزی کے ساتھ گزرتے گئے اور شہزادی حلقہ درس میں داخل ہوگئی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح معمولی لہو لعب میں دلچسپی نہ لیتی بلکہ مردانہ اور شجاعانہ کھیلوں میں شرکت کر کے حقیقی مسرت حاصل کرتی۔

علی مردان حد درجہ جوہر شناس اور اپنے وقت کا ایک نامور سپہ سالار تھا۔ اس نے اپنی جامع الصفات شہزادی کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا اس نے اپنے اراکین ومدبران مملکت کے مشورے سے شہزادی کے لئے ایسے قابل اتالیق مقرر کیے جو صبح وشام اس کی فطرت کے مطابق درس دیتے تھے۔ یوں شہزادی کے فطری جوہر چمک اٹھے اور یوں وہ حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی سے بھی مالا مال ہوگئی۔

چنانچہ سن شعور سے پہلے ہی اس نے وہ بات حاصل کر لی جسے لوگ حیرت سے دیکھتے تھے اور اس کی خداداد شجاعت اور استعداد کا چرچا دور ونزدیک تک پھیل گیا۔ اس کی ذات غور وفکر وتدبر وتامل جیسی خوبیوں سے تو پہلے ہی مزین تھی اب اس نے مصوری میں بھی اعلیٰ درجے کی مہارت

حاصل کر لی۔اس کی بنائی ہوئی تصویریں آج بھی عجائب خانہ ایران میں موجود ہیں۔
گیتی آراء کے لازوال، بے مثال اور زریں کارناموں پر تاریخ آج بھی نازاں ہے۔
خواتین کو فن پارہ گری سکھانے اور ان کی باقاعدہ فوج مرتب کرنے میں شہزادی گیتی آراء کا نام اولین خواتین کی فہرست میں شامل ہے۔اگرچہ آج بہت سے یورپین ممالک میں خواتین فن پارہ گری سیکھنے لگی ہیں اور ان کی باقاعدہ فوج بھی ہے۔لیکن آج سے کئی سو سال پہلے یہ بات، بہت ہی عجیب اور حیرت انگیز تھی۔

شہزادی نے عمر کے بارہویں سال میں زابلستان میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنے باپ کی طرف سے تمام ممالک میں یہ حکم جاری کر دیا کہ بیس سے پچیس برس کی درمیانی عمر کی وہ تمام خواتین جو اس وقت کنواری ہوں اس مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کریں۔اگر کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو اس پرسختی سے عمل درآمد کیا جائے گا اور اس نافرمانی کی سزا پر جرمانہ بھی ہو سکتا ہے اور جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔

رعایا ازبلستان اس عجیب حکم پر سراسیمہ تو ضرور ہوئے لیکن انہوں نے ''کم حاکم مرگ مفاجات'' کے مصداق اپنی بیٹیوں کو بادل نخواستہ مدرسہ میں داخل کروادیا۔مؤرخین نے ان کی تعداد تقریباً ۴۰۰۰ لکھی ہے۔انہیں فن پارہ گری کی تعلیم دی جاتی۔عموماً بھی زابلستان کی خواتین فطرتاً جنگجو اور شجاع ہوتی ہیں جب انہیں فوجی تعلیم دی گئی تو وہ خوب چاق و چوبند اور جری سپاہی بن گئیں۔

رحم دل، غریب پرور اور وفاء پرست شہزادی نے اپنی زنانہ فوج کے لئے سامان حرب اور باتمی صفت گھوڑے خریدے اور یوں اس کام میں خزانہ نصف سے زائد خالی ہو گیا۔شہزادی کے زنانہ فوج کی تعداد بڑھتے بڑھتے بارہ ہزار تک پہنچ گئی۔اسے اپنی فوج پر بہت ناز تھا اور پختہ یقین تھا کہ روز جنگ اس کی فوج مرد سپاہیوں کے چھکے چھڑا دے گی۔اور اپنی شجاعت کا لوہا منوالے گی۔وہ ہفتے میں ایک دن فوج کا معائنہ کرتی اور انہیں خطاب کرتی۔

اسی اثناء تقدیر نے ناگہاں ایک تیر چھوڑا۔علی مروان شہزادی کو روتا چھوڑ کر عدم کا سفر کر گیا اور چرخ نیلگوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ شہزادی کی آزمائش کے لئے ارکان سلطنت اور مردانہ فوج کو اس سے باغی بنا دیا۔انہوں نے ایک خاتون کے سامنے سرخم کرنے سے انکار کر دیا اور

شہزادی سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنے چچا کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے۔ لیکن شہزادی نے ہمت نہ ہاری اور اپنے حق سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔

صلح جو اور معاملہ فہم خاتون نے وزیر سلطنت کو رقعہ بھیجا، جس کا متن کچھ اس طرح سے تھا:

''وزیر سلطنت کے نام!

قبل اس کے کہ میں تمہیں تمہاری غداری کی قرار واقعی سزا دینے کے لئے شمشیر آبدار بے نیام کروں، تمہاری حرکتیں آئین ملک کے خلاف ہیں۔ جب تک میں بقید حیات ہوں کسی کا بھی سلطنت پر کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تم اب بھی غداری اور باغیانہ خیالات سے تائب نہ ہوئے تو ہمارے پاس بھی بڑی تعداد میں جانثار موجود ہیں۔ اگر چہ وہ تمام خواتین ہی ہیں لیکن روز جنگ مرد بھی ان کی تیغ آبدار کی تاب نہ لاسکیں گے، میں نے یہ رقعہ اتمام حجت کے لئے لکھ دیا ہے آگے تمہیں اختیار ہے۔

فقط

شہزادی گیتی آراء''

وزیر سلطنت نے اس خط کا جواب کچھ ان الفاظ میں دیا:

''تمہارے پاس کافی تعداد میں موجود فوج کا ہمیں کوئی ڈر نہیں ہم نے جو قدم اٹھایا ہے وہ بے حد سوچ و بچار کے بعد اٹھایا۔ ملک زابلستان پر کبھی کسی عورت نے حکمرانی نہیں کی اور نہ کبھی ایسا ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم حکومت کے خیال خام کو اپنے ذہن سے نکال دو اور اپنی ویمن آرمی کے بھروسے پر اپنی عاقبت نہ خراب کرو''۔

شہزادی وزیر کا جواب پڑھ کر آگ بگولہ ہوگئی۔ مارے غصے کے اس کا برا حال تھا۔ اس نے فوری طور پر جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور اپنی فوج کو طلب کر لیا۔ جب تمام جانثار آ موجود ہوئیں تو شہزادی نے انہیں ان الفاظ میں خطاب کیا:

''آج تمہاری جانثاری اور وفاداری کی آزمائش ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ تم اس امتحان میں نیک نامی اور شہرت حاصل کرو گی۔ مردوں کو اپنی قوت پر ناز ہے اور ان کی نظر میں ہماری کچھ وقعت نہیں۔ لیکن انشاء اللہ! ہم انہیں جلد دکھا دیں گے کہ وقت پڑنے پر ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ نادان لوگ ہمارا پیدائشی حق چھین لینے پر تلے ہوئے ہیں لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں نے جس قدر

تمہاری خدمت کی ہے اسی بنا پر مجھے یقین ہے کہ اس نازک وقت میں تم پر بھروسہ کر سکتی ہوں"۔

حاضرات نے بیک زبان اس کا ساتھ دینے اور اس کی خاطر اپنی عزیز جان تک فدا کرنے کا عہد کیا۔ اس پر شہزادی نے انہیں پانچ پانچ سو کے دستے میں منقسم کیا اور پھر ایک دستے پر ایک الگ سردار مقرر کیا۔ انہیں قلعہ پر حملہ کرنے اور بغیر فتح کئے واپس نہ آنے کا حکم دیا۔

دو دستے خزانہ پر قبضہ کے لئے روانہ کئے اور باقی دستوں کو شہر کا محاصرہ کرنے کے لئے کہا۔ شہزادی کی فوج نے زیر قلعہ پہنچ کر کمندیں لگائیں اور دیواروں پر چڑھ گئیں اور اس طرح پہلے برج کو فتح کر لیا اتنے میں قلعہ کی فوج بھی سامان حرب سے لیس ہو کر مقابلہ کے لئے آ پہنچی۔ میدان کارزار گرم ہو گیا۔ حریف سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک دوسرے پر پل پڑے۔ اس زور کی جنگ ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخ و پکار نے وہ شور بے ہنگام بلند کیا کہ قیامت کا نمونہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔

خواتین اس قدر شجاعت اور مردانگی سے جنگ کر رہی تھیں کہ مردوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ادھر جب شہزادی نے دیکھا کہ اس کی فوج نے خودداد شجاعت دی ہے لیکن ان کی تعداد کم ہونے کے سبب ان کا پلہ ہلکا ہے تو اس نے دو تازہ دم دستے ان کی مدد کے لئے بھیجے۔ اب تو اس زور کا معرکہ پڑا کہ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ مردوں نے ہزار کوشش کی کہ ویمن آرمی کو درہم برہم کریں مگر خواتین نے ان کے ہر ریلے کو پسپا کر دیا۔ تین گھنٹے کی خون ریز جنگ کے بعد مردوں کو مجبوراً راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ اس پر خواتین نے تعاقب کر کے بے شمار فوجیوں کو قتل کیا اور ہزاروں کی تعداد میں گرفتار کیا۔

مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں شہزادی کی تیرہ سو خواتین کام آئیں اور حریف کے مقتولین کا تو کچھ شمار نہیں تھا۔ جنگ کے دوسرے دن شہزادی نہایت پروٹوکول کے ساتھ تخت پر جلوہ افروز ہوئی اور غداروں کو بلا کر خوب پشیمان کیا اور پھر شاہانہ عفو وکرم سے کام لے کر انہیں رہا کر دیا۔

امیر تیمور صاحب قرآن کی وفات کے بعد اس کا بیٹا میران شاہ مسند نشین ہوا تو اسے ناگہاں گیتی آراء کا خیال آیا۔ وہ پہلے ہی شہزادی کے حسن و جمال اور شجاعت کی داستانیں سن چکا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شہزادی آزادی پرست خاتون ہے اس لئے جنگ و جدل سے اس پر قبضہ کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ شاہ نے شہزادی کو صلح و امن سے راضی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک قاصد کو بے پناہ مال

وزراء اور خط دے کر شہزادی کی خدمت میں بھیجا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

''اے پیکر عصمت وشجاعت!

الفاظ میرے دل کا حال بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ مجھے تم سے ملاقات کرنے کا جس قدر شوق ہے اسے بیان کرنا اور عیاں کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ گو تم میرے مفتوحہ ملک پر حکمران ہو لیکن مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ تم آزادی پرست واقع ہوئی ہو اور تمہاری رعایا دل و جان سے تمہاری مطیع وفرمانبردار ہے۔ لیکن تمہاری طبیعت کی وسعت اور عالی حوصلگی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تم ایسی محدود سلطنت پر حکمرانی کی بجائے ایسی وسیع سلطنت پر حکمرانی کرو جیسی خالق کائنات نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ تم خود معاملہ فہم اور دوراندیش ہو اس لئے زیادہ لکھنا بے سود ہے تم میرے مطلب کو باآسانی سمجھ سکتی ہو۔

فقط

میران شاہ''

جب میران شاہ کا قاصد خط لے کر پہنچا تو شہزادی نے اپنی تمام مشیروں اور سہیلیوں کو بلایا اور انہیں بادشاہ کے مضمون سے آگاہ کر کے مشورہ طلب کیا۔ سب نے اتفاق رائے سے یہ عرض کیا کہ گویا کام ہمارے آئین کے منافی ہے لیکن اس وقت کیونکہ بادشاہ خود خواہش مند ہے اس لئے آپ کو اس موقع سے ضرور مستفید ہونا چاہئے۔ اس کے بعد شہزادی نے بادشاہ کے خط کا جواب تحریر کیا اور چند شرائط پیش کیں جن کے پورا ہو جانے پر بادشاہ کی درخواست قبول کیے جانے کا وعدہ کیا۔ میران شاہ نے شہزادی کی شرائط کو بخوشی قبول کیا اور یوں بڑی دھوم دھام اور شان وشوکت سے شہزادی ملکہ سمرقند بن گئی۔ میران شاہ کے عقد میں آجانے کے بعد اس نے ملک اور رعیت کی جوز بردست خدمات سرانجام دیں اس کا اظہار اس سے ہوسکتا ہے کہ بادشاہ میران شاہ بار بار کہتا کہ اگر ملکہ گیتی نہ ہوتی تو شاید میرا نام ونشان مٹ چکا ہوتا۔ میرا دین وایمان اور ملک وسلطنت لٹ چکا ہوتا۔

بعض اوقات ملکی سلطنت میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتیں کہ وزراء بلکہ بادشاہ بھی ان کو حل کرنے سے قاصر رہتے لیکن گیتی آراء اپنی خداداد قابلیت اور دینی بصیرت کی بنا پر ان کو منٹوں میں حل کیا کرتی۔ اس نے تعلیمات کا خوب اہتمام کرایا۔ خواتین کی باقاعدہ تعلیم ہوتی۔ حکومت کی

حدود میں اگرچہ اسلامی قانون نافذ تھا مگر حکام کی بے اعتدالیوں سے اس میں خاصا تغیر وتبدل واقع ہوگیا تھا۔ اس چیز کی طرف اس نے سب سے پہلے توجہ دلائی اور بادشاہ سے فرمان جاری کروایا کہ اسلامی قوانین کی شدت سے پابندی کی جائے۔ حکام خود اسلام کے سچے خادم بن کر رہیں اور دوسروں کو اس کی ترغیب دیں۔ عدل ومساوات جو اسلام کے خصوصی امتیازات ہیں ان کو ہر معاملہ میں پیش پیش رکھا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں ایک بار پھر شرعی احکام کی لہر دوڑ گئی اور بچہ بچہ اسلامی احکام اور عوام سب واقف ہو گئے۔ اس نے خود اپنی جیب خاص سے کئی عمدہ اور بڑے بڑے عربی مدارس کھولے جن میں سینکڑوں طلبہ علم دین حاصل کرتے۔ رفاہ عام کے بھی بہت سے کام سرانجام دیئے۔ کئی پل بنوائے، کئی سڑکیں تعمیر کروائیں۔ وسط سلطنت میں ہسپتال تعمیر کروایا، کئی لنگر خانے جاری کرائے جہاں معذوروں اور فقراء کو مفت کھانا تقسیم ہوتا۔

نیز ان کی ضروریات خانگی کا خیال رکھا جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہ بھی کیا کہ بے روزگاروں کو روزگار فراہم کیا اور خزانہ شاہی کو امن وامان، غرباء کی پرورش اور رعیت کے سکون کی خاطر وقف کر دیا کہ اسلام میں حکومت اور نظام حکومت کا یہی مقصد ہے نہ یہ کہ حکام اور امراء مزے اڑائیں اور بچارے غریب فاقے سے مریں اور نان جویں کے بھی محتاج رہیں۔

وہ اس قدر جری اور فرائض منصبی کی ادا کرنے والی خاتون تھی کہ اکثر بادشاہ کو اس کے فرائض منصبی سے آگاہ کرتی رہتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کرتا تھا کہ بادشاہ نصف شب کو جب سردیوں کے موسم میں آسمان ژالہ باری کا کام کر رہا ہوتا یہ لباس بدل کر رعیت کی فکر میں سمرقند کے بازاروں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطنت کا نظام اس قدر ترقی کر گیا کہ آس پاس کی بڑی بڑی حکومتیں مرعوب تھیں اور رعایا کا یہ حال تھا کہ پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار تھی۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ پھر ہم میں ایسی باکمال عورتیں پیدا کرے تاکہ ہمارا کھویا ہوا وقار پھر واپس آ جائے۔

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کہ پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھا ہے

(ماخوذ از بنات عائشہؓ)

اماں زرغونہ کے غصے سے سرخ چہرے کی بیٹا تاب نہ لا سکا اور نظریں جھکا کھڑا ہو گیا۔
احمد شاہ نے حیران و پریشان ہو کر اماں سے پوچھا:
"خیر باشد؟ آپ کس بات پر خفا ہو رہی ہیں؟"
اماں نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:
"کاش میں تجھ جیسے بیٹے کو جنم نہ دیتی، کاش میں تجھے اپنا دودھ نہ پلاتی۔ کیا اسی روز کے لئے تجھے پالا پوسا کہ ہندوستان سے مرہٹوں کی آمد کے خوف سے یہاں قندھار میں ایک قلعہ تعمیر کرنے کی بات کر رہے ہو۔ تاکہ تم اس قلعے میں مرہٹوں سے چھپ سکو۔ تم کو تو چاہئے تھا کہ یہاں سے اس مہم کی خاطر ہندوستان جاتے اور مرہٹوں کی کمر توڑ کر واپس آتے نہ کہ تم یہاں بیٹھ کر پیش بندیاں کرو"۔
احمد شاہ نے سر جھکا کر کہا:
"اماں میں معذرت خواہ ہوں۔ انشاءاللہ آپ کی خواہش پوری کر کے رہوں گا"۔
اور پھر احمد شاہ ابدالی افغانستان سے نکلا۔ اپنے لشکر کو پہاڑوں، دریاؤں اور تنگ وادیوں سے گزارتا ہوا صوبہ سرحد سے ہوتا پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مشہور اور تاریخی میدان مرہٹوں کے سامنے صف آراء ہوا۔ مرہٹوں کا لشکر دو لاکھ ستر ہزار سے زیادہ تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی کی طرف تمام مسلمان مل جل کر بھی نوے ہزار سے کم تھے۔

......☆......

اماں زرغونہ (والدۂ احمد شاہ ابدالی)

امتیاز احمد انجم

ہندوستان میں کمزور بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھا ہے۔ مگر ملک کے حالات اس کے کنٹرول میں نہیں، دکن کی ایک علیحدہ اور آزاد ریاست بن چکی ہے، مالوہ گجرات، کل راجپوتانہ اور پنجاب دہلی کی مرکزیت کو ماننے سے صاف انکار کر چکے ہیں۔

بنگال، بہار، اڑیسہ اور پنجاب بھی دہلی کی مرکزیت اور خودمختار شہنشاہیت کے جوئے سے آزاد ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کی مرکزیت اس درجہ تباہ و برباد ہو چکی ہے کہ ہر گورنر اپنے صوبہ کا مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھا ہے۔

مرہٹوں کی سرکشی اور بغاوت بڑھتی ہی جا رہی ہے اور جنوب کی جانب مرہٹوں کا سیلاب اُمڈتا آ رہا ہے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔

مرہٹوں نے اپنے دلوں میں چھپے ہوئے بغض و عناد کا اعلانیہ پرچار شروع کر دیا اور اپنے تعصب اور انتہا پسندانہ عزائم کا کھلم کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ وہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کریں گے یا ہندو شہنشاہیت قائم کر کے دم لیں گے۔

ہندوستان میں حکومت صرف ہندوؤں کی ہوگی۔ مرہٹے مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ مسلمان مرکزیت کمزور اور ٹکڑوں میں ہونے کے باعث متفرق اور منتشر ہیں۔ مرہٹے دہلی پر

حملہ کر چکے ہیں۔ مسلمان بہت ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں مگر کچھ بن نہیں پڑتا۔

حتیٰ کہ مرہٹے بڑھتے ہوئے جنوبی سرحدوں کے قریب اٹک تک جا پہنچے ہیں۔ اور ان کی اس یلغار سے افغانستان کے غیور افغان بھی ایک مرتبہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جبکہ ہندوستان کے لوگوں کی نظریں اب صرف افغانستان کی طرف لگی ہوتی ہیں کہ یہیں سے غیرت ایمانی سے سرشار کوئی نجات دہندہ آئے گا اور ہمیں پنجۂ ظلم سے نجات دلائے گا۔ مگر افغانستان کے افغان اس بات پر سوچ رہے تھے کہ دشمن سے مدافعت کیسے کی جائے جبکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے مسلسل افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی جا رہی ہے۔

قندھار کی سرزمین پر افغانوں کا جرگہ سر جوڑ کر بیٹھا ہوا ہے اور کئی دن سے مشورے جاری ہیں۔

غیور اور دانشمند افغان ہر قیمت پر اپنی سرزمین کے تحفظ کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے آج تک کسی بیرونی قوت کو اپنے وطن میں قدم جمانے کی اجازت نہیں دی اور آج بھی اس بات پر عہد کر رہے ہیں کہ اپنی جانوں پر کھیل کر اپنے وطن کا دفاع کریں گے۔

جنگوں کے آزمودہ اور منجھے ہوئے کمانڈر دفاع کے لئے اپنے تجربات کی روشنی میں آراء و تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہا۔ کئی جہاندیدہ اور زیرک کمانڈروں نے مشورہ دیا کہ دشمن سے مدافعت کیلئے قندھار میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا جائے۔

قلعے کی تعمیر پر بحث و تمحیص جاری ہے۔

کئی دن سے جاری جرگہ گویا اپنے اختتام کو پہنچنے والا ہے۔ اور شاید قلعہ تعمیر کرنے کا حتمی فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس جرگہ کی لحہ بہ لحہ رپورٹ ایک خاتون کو پہنچائی جا رہی ہے۔

……☆……

یہ خاتون کون ہے؟ اندرون خانہ مستور یہ خاتون افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کی والدہ محترمہ ہے۔

یہ بہادر، غیور اور دیندار خاتون اماں زرغونہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور یہ خاتون دنیا میں مسلمانوں کو باعزت وباوقار دیکھنا چاہتی ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا سن کر یہ خاتون بے تاب اور بے چین ہے اور اس جری خاتون نے اپنے بیٹے کی پرورش انتہائی سلیقہ اور دانشمندی سے کی ہے، اس نے بچپن سے ہی بیٹے کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد منتقل کر دیا۔ چنانچہ جہاں اس نے بیٹے کو دینی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ہے وہیں اس کو تمام مروجہ فنون حرب اور فنون سپاہ گری بھی سکھائے ہیں۔

اس عظیم ماں نے اپنے بیٹے کو انداز جہاں بانی اور انداز حکمرانی سے روشناس کروایا۔ اماں زرغونہ نے اپنے بیٹے کی تربیت ان خطوط پر کی کہ وہ افغانستان کا حکمران احمد شاہ ابدالی بن گیا۔

......☆......

جرگہ میں قلعہ تعمیر کرنے کی بات پایۂ اختتام کو پہنچنے والی ہے۔ اماں زرغونہ کو اندرونِ خانہ جب قلعہ تعمیر کرنے کی اطلاع ملی تو اماں زرغونہ غصہ سے تلملا اٹھی۔

جرگہ کا یہ فیصلہ اماں زرغونہ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ گویا اماں زرغونہ کی غیرت ایمانی اور جرأت وبہادری اس بات پر تیار نہ تھی۔ اماں زرغونہ نے بچپن سے لے کر اب تک ہر ہر قدم پر احمد شاہ کی رہنمائی کی تھی اور احمد شاہ کے ہر فیصلے پر کڑی نظر رکھتی تھی۔ چنانچہ آج جرگے کے اس بزدلانہ مشورے پر سیخ پا ہو گئی اور جرگے میں بیٹھے احمد شاہ کو پیغام بھیجا اور اندر بلایا۔

احمد شاہ اٹھ کر اندر زنان خانے میں جاتا ہے تو سامنے اماں زرغونہ غصے سے بھری کھڑی ہیں اور احمد شاہ کو دیکھ کر ناراضگی کا اظہار کرتی ہیں۔

اماں زرغونہ کے غصے سے سرخ چہرے کی بیٹا تاب نہ لا سکا اور نظریں جھکا کھڑا ہو گیا۔

احمد شاہ نے حیران و پریشان ہو کر اماں سے پوچھا:

''خیر باشد؟ آپ کس بات پر خفا ہو رہی ہیں؟''

اماں نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

''کاش میں تجھ جیسے بیٹے کو جنم نہ دیتی، کاش میں تجھے اپنا دودھ نہ پلاتی۔ کیا اسی روز کے لئے تجھے پالا پوسا کہ ہندوستان سے مرہٹوں کی آمد کے خوف سے یہاں قندھار میں ایک قلعہ تعمیر

کرنے کی بات کر رہے ہو۔ تاکہ تم اس قلعے میں مرہٹوں سے چھپ سکو۔ تم کو تو چاہئے تھا کہ یہاں سے اس مہم کی خاطر ہندوستان جاتے اور مرہٹوں کی کمر توڑ کر واپس آتے نہ کہ تم یہاں بیٹھ کر پیش بندیاں کرو"۔

احمد شاہ نے سر جھکا کر کہا:

"اماں میں معذرت خواہ ہوں۔ انشاءاللہ آپ کی خواہش پوری کر کے رہوں گا"۔

اور پھر احمد شاہ ابدالی افغانستان سے نکلا۔ اپنے لشکر کو پہاڑوں، دریاؤں اور تنگ وادیوں سے گزارتا ہوا صوبہ سرحد سے ہوتا پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے مشہور اور تاریخی میدان مرہٹوں کے سامنے صف آراء ہوا۔ مرہٹوں کا لشکر دو لاکھ ستر ہزار سے زیادہ تھا جبکہ احمد شاہ ابدالی کی طرف تمام مسلمان مل جل کر بھی نوے ہزار سے کم تھے۔

مسلمانوں نے مرہٹوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے بعض نامی گرامی سرداروں کو قتل کر دیا۔ احمد شاہ کی فوج کے زوردار حملے سے مرہٹوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمانوں کی تلواروں سے ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ مرہٹوں کی بڑی تعداد قتل ہوگئی جو بچ گئے جان بچا کر بھاگ گئے۔

اس طرح پانی پت کی جنگ میں احمد شاہ ابدالی نے ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کا حوصلہ توڑ دیا اور ان کا ہندو راج قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ مرہٹوں کی اجتماعی طاقت کو توڑنا اور مسلمانوں کے خلاف مختلف حکومتوں کی دھڑے بندیوں کو ختم کرنا احمد شاہ ابدالی کا عظیم کارنامہ ہے۔

احمد شاہ ابدالی بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نجات دہندہ اور مسیحا تھا اس نے فتح کے بعد ہندوستان کی حکومت شاہ عالم، شجاع الدولہ، امیر الامرائی اور نجیب الدولہ کے سپرد کر کے واپس قندھار کا رخ کیا۔ اور اپنی عظیم ماں کی قدم بوسی کی......۔

عینو بی بی

حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمیؒ

ایک افغان سپاہی جسے اپنے اہل وعیال سے بچھڑے مدت گزر چکی تھی عین وطن کے قریب پہنچ کر توقف و تاخیر کے حکم کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ ایک مجاہد کی حیثیت سے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ ہندوستان گیا مرہٹوں کے خلاف جہاد میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد واپس آیا اور اب وہ یہاں تین دن کیوں ٹھہرے۔ یہ سوچ کر وہ لشکر سے نکل کر خاموشی سے اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ دو دن اپنے گھر ٹھہرنے کے بعد شاہی لشکر کے قندھار میں داخل ہونے سے پہلے اس سے جا ملے گا۔

سپاہی گھر پہنچا تو بچے موجود تھے مگر بیوی پانی لانے کے لئے قریب کی ندی پر گئی ہوئی تھی۔ اس سپاہی نے بچوں کو گلے لگا لگا کر پیار کیا۔ اتنے میں اس کی بیوی بھی آ گئی۔ وہ شوہر کو گھر میں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کو نہ تو پانی پت کی لڑائی اور اس کے نتیجے کا کچھ علم تھا اور نہ شاہی لشکر کے قندھار کے قریب پہنچنے کی اطلاع تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس کا شوہر بادشاہ کے ساتھ اللہ کی راہ میں لڑنے گیا ہوا ہے اور کافروں کے خلاف لڑتے ہوئے یا تو اس نے اپنی جان قربان کر دی ہوگی یا فتح و کامرانی کے بعد شاہی لشکر کے ساتھ گھر واپس آئے گا لیکن اس کے اس طرح تنہا وطن آنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے مسرت اور شادمانی کا اظہار کرنے کی بجائے غصے کے ساتھ شوہر سے سوال کیا کہ احمد شاہ بابا اور شاہی لشکر کہاں ہے؟ اور جس مقصد کے لئے تم ہندوستان گئے تھے اس کا

کیا بنا؟ شوہر نے جواب دیا کہ "کافروں کو شکست فاش ہوئی، شاہی لشکر فتح کے پھریرے اڑاتا وطن واپس پہنچ چکا ہے اور قندھار سے صرف دو منزل کے فاصلے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ میں اہل وعیال کی محبت سے مجبور ہو کر یہاں آ گیا"۔ لیکن غیر مند بیوی کہنے لگی کہ مجھے کیسے یقین آئے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست ہے۔ لوگ تمہیں دیکھیں گے تو یہی کہیں گے کہ تو جہاد فی سبیل اللہ سے جی چرا کر بھاگ آیا ہے۔ شوہر کہنے لگا کہ "یہ شبہ کا کون سا موقع ہے، شاہی لشکر دو دن کے بعد قندھار پہنچ جائے گا"۔

لیکن بیوی کہنے لگی کہ اگر یہ سچ ہے تو تم اسی وقت واپس چلے جاؤ جب تک احمد شاہ بابا کا لشکر قندھار نہ پہنچے گا میں تمہاری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔ میں عورتوں سے یہ طعنہ نہیں سن سکتی کہ میرا شوہر میدان جہاد سے بھاگ آیا ہے۔ شوہر نے ہر چند یقین دلانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ ایک دن ٹھہر کر چلا جائے گا مگر غیور اور باہمت بیوی نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی تمہیں گھر میں نہیں بٹھا سکتی۔ مجبور ہو کر شوہر اٹھا اور شاہی لشکر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لشکر میں پہنچا تو بلا اجازت لشکر سے نکلنے کے جرم میں اسے گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ احمد شاہ نے اس سے لشکر چھوڑنے کا سبب پوچھا تو اس نے ساری کہانی شروع سے آخر تک اس کے سامنے سچ سچ بیان کر دی۔ احمد شاہ اپنی قوم کی ایک بیٹی کی قومی حمیت کا حال سن کر بہت خوش ہوا۔ سپاہی کو سچ بولنے کی بنا پر رہا کر دیا۔

احمد شاہ جب قندھار پہنچا تو اس سپاہی کی بیوی کو جس کا نام عینو تھا ایک کاریز (زمین دوز نہر جس میں چشموں سے پانی آتا ہے) انعام کے طور پر دی۔ افغانستان کے سنگلاخ علاقوں میں کاریز کی بے انتہا قدر و قیمت ہے۔ اس کاریز کا نام اب تک اس غیور خاتون کے نام پر "کاریز عینو" مشہور ہے۔ یہ کاریز قندھار سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں واقع ہے۔

آج کی ہماری خواتین بھی عینو خاتون کی طرح غیور اور باہمت بن جائیں تو بھارت کیا چیز ہے، امریکہ جو فرعون کی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس زمانے کی خواتین تو خود اپنے بیٹوں، شوہروں کو جہاد میں بھیجنے کی بجائے اگر زبردستی کر کے وہ میدان جہاد پہنچ بھی جائیں تو پیچھے پیچھے محاذ پر جا پہنچتی ہیں اور دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے کر بیٹوں کو واپس لے آتی ہیں۔ کاش کہ یہ خواتین اس بات پر غور کر لیں کہ کسی قوم کو بام عروج تک پہنچانے والی چیز

قربانی ہے۔ہم مسلمان ہی اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے قربانی نہیں دیں گے تو کون دے گا۔ ہمارے نبی ﷺ تو ہم مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند قرار دے کر گئے ہیں جس کے کسی ایک حصے میں تکلیف ہوگی تو پورا جسم بیداری اور درد سے بے چین، بے سکون ہوگا۔لیکن آج نبی ﷺ کی تعلیمات پر ہم نے عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔اس لئے ان بے بس و مجبور مسلمانوں کی تکلیف پر ہمارے دل نہیں تڑپتے اور ہم مزے سے اپنی زندگی میں گم ہیں۔ کاش کہ ہم اس خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور اپنے رب کو راضی کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہ کریں، اور ان باتوں کو سوچیں کہ دنیاوی بادشاہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو کر کس قدر انعامات سے نوازتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جو تمام زمین و آسمانوں کے حقیقی بادشاہ ہیں وہ ہمارے تھوڑے لیکن اخلاص سے کیے گئے عمل پر خوش ہو کر اپنے لطف و کرم اور انعامات کی کتنی بارش ہم پر برسائیں گے۔ وہ خواتین جو موت سے ڈر کر اپنے بیٹوں اور شوہروں کو جہاد جیسے مقدس فریضے سے روکتی ہیں اور ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی ہیں تو وہ یہ سوچ لیں کہ ان سے بڑا بدقسمت کوئی نہیں ہوگا۔وہ کسی اور کا کوئی نقصان نہیں کر رہی ہیں بلکہ اپنا ہی نقصان کر رہی ہیں اور دنیا و آخرت کی برکات سے محرومی حاصل کر رہی ہیں۔

آخر میں میری تمام مسلمان بہنوں سے التجا ہے کہ اپنے شوہروں اور بیٹوں کو جہاد کے مقدس فریضے کی ادائیگی سے نہ روکیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے انہیں میدان کارزار میں اتاریں۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو عمل کرنے اور اس مردار دنیا کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

حمیدہ بانو

......طلحہ علی......

تاریخ شاید لمۃ الجیب کے ذکر سے بے نیاز ہو کر گزر جاتی لیکن حمیدہ بانو بیگم کے ذکر اور کارناموں سے روگردانی کرنا تاریخ کے بس کی بات نہ تھی ایک حادثہ نے اسے لمۃ الجیب کی راہ سے حمیدہ بانو کی منزل تک پہنچا دیا اور اس منزل سے ایک نئے سفر حیات کا آغاز ہوا جس میں تیمور میر کارواں کی حیثیت رکھتا تھا۔

وہ زندگی کے ہر مرحلہ میں تیمور کے ساتھ دل و جان سے شریک رہی، وہ انفرادیت پسند لڑکی ازدواجی زندگی کی کسوٹی پر سونا ثابت ہوئی دوسری بیگمات کے رشک وحسد سے کوسوں دور اور سوتیا ڈاہ سے قطعاً نابلد تھی شاہی محلات کی ریشہ دوانیوں سازشوں اور سیاسی پیچ سے دامن بچائے رہتی تھی تیمور کی اور بیگمات اور خواجہ سراؤں کے نصائح کو توجہ سے سنتی تھی اور ان کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی اور فراخ دلی سے پیش آتی، تیمور کے لشکر اور حرم میں اس کی ملکہ کی نیک نیتی وسیع النظر، منکسر المزاجی، فہم وفراست، جرات وشجاعت، استعداد اور جنگی لیاقت کی دھوم تھی، امن کے زمانے میں اس کے وقت کا بیشتر حصہ امور خانہ داری کے انتظام، شوہر کی خدمت اور کتب بینی میں صرف ہوتا تھا۔ سینے پرونے سے ناواقف تھی مگر زرہ بکتر بنانے میں بڑی ماہر تھی اور تیمور لڑائیوں میں اس کے بنائے ہوئے زرہ بکتر استعمال کرتا تھا۔ امیر تیمور اس کے جذبۂ شوہر پرستی اور ایثار پسندی کا سچا قدر دان تھا۔ ایک بار تیمور کو ایک مہم کے سلسلے میں روپے کی ضرورت پڑی تو حمیدہ بانو نے اپنے صرف

خاص کا تین سال کا اندوختہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حمیدہ بانو کے اسی نوع کے مخلصانہ جذبات رفاقت کی بناء پر تیمور نہ صرف اس سے بے پناہ محبت کرتا بلکہ اسے قدر و وقعت کی نگاہ سے بھی دیکھتا تھا۔

حمیدہ بانو اور تیمور پلنگ میں کبھی نا چاقی یا کشیدگی نہیں ہوئی۔ صرف ایک مرتبہ بادشاہ اپنی ایک ملکہ امپریل (مسیحی بانو بیگم) کی غلط بیانی کی وجہ سے کچھ دنوں تک برہم رہا لیکن اس دوران بھی حمیدہ نے بڑے ضبط و تحمل کا ثبوت دیا۔

ایک روز تیمور کی موجودگی میں اس نے دوتارہ اٹھا کر چھیڑ دیا تار مرتعش ہوئے اور ساز کی آغوش سے موسیقی کا آبشار پھوٹ نکلا ملکہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک وجد آفریں لے میں سمو دیا۔

حسن اور وہ حسن محبوب پھر ساز و آہنگ کے ہتھیاروں سے لیس:

یہ قیامت میں بھی ایک اور قیامت آئی

تیمور جیسے مستقل مزاج عظیم فاتح کے برہمی سے مزید نباہ کی تاب و توانائی باقی نہ رہی بے اختیار ہو کر وجہ برہمی بتادی اور جواب سنے بغیر اعلان عفو کر دیا۔

ملکہ فرد جرم سن کر انگشت بہ دندان ہو کر رہ گئی بڑی دل سوزی سے صرف اتنا کہا کہ مجھے اپنی محبت سے اس درجہ نواز نے اور مجھے اس قدر قریب سے دیکھنے کے باوجود صاحب قرآن میرے مزاج کی کیفیت اور افتاد طبع سے ہنوز بے خبر ہیں اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے ہندوستان کے فتوحات کو میں نے کبھی اپنے کارناموں سے منسلک نہیں کیا مجھ پر یہ سراسر بہتان ہے۔

امپریل کی فوراً طلبی ہوئی اور اس کے اظہار ندامت سے تیمور پر اصل حقیقت روشن ہو گئی بادشاہ کی آتش غیظ و غضب جوش میں آ گئی، لیکن حمیدہ بانو نے اپنی کریم النفسی اور فطری نیک خوئی و عالی ظرفی سے کام لے کر مسیحی بانو بیگم کی پرزور سفارش کر کے غصہ کی آگ کو فرو کر دیا، حمیدہ بانو تیمور کے مزاج کی درستی اور تلخی کو اپنی شیرینی گفتار اور نرمی سے کم کرنے کی سعی کرتی تھی۔

ہندوستان کی لڑائیوں میں وہ تیمور کے ساتھ رہی اور دوبدوش لڑی وہ ہر مہم میں تیمور کیلئے سپر بن جاتی تھی۔ فتوحات ہند میں اس کی شجاعت، جنگی سوجھ بوجھ اور اصابت رائے کو بھی بڑا دخل تھا۔ ایشائی حکم رانوں اور سلاطین کی بیگمات میں ایسی خواتین گزری ہوں گی۔ جو حمیدہ بانو کی طرح

رزم و بزم دونوں کی مرد میدان رہی ہوں اور جن کے سیف و قلم کے کارنامے علم و عمل کے تذکرے استقلال و پامردی کی داستانیں تاریخ نے اپنے میں محفوظ کرلی ہوں۔ حمیدہ کی سرکردگی میں قلعہ استخرہ کے محاصرہ اور حاکم قلعہ کی گھاتوں سے بچ نکلنے کے بعد اس فتح حاصل کرنے کا غیر معمولی واقعہ تاریخ مغول میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے یہ مضبوط قلعہ جس کے دروازے پر ایک عورت اور مرد کی تصویر تھی جمشید کے ذوق تعمیر کا شاہد بن کر سینۂ ارض پر بڑی شان سے ابھارے ہوئے ماضی کی سطوت شاہی اور اپنے معماروں کی صناعی کی یاد دلا رہا تھا اور ہر دور میں جنگی اعتبار سے نہایت اہم سمجھا جاتا تھا۔

قلعہ استخرہ تیمور کے زیر نگیں تھا۔ اور شریف حسن تیمور کی طرف سے اس قلعہ کا حاکم۔ تیمور کو قلعہ استخرہ کی اہمیت کا پورا احساس تھا اور وہاں کے گورنر پر مکمل اعتماد ۱۳۸۴ء میں تیمور سلطنت اور مہمات میں الجھا ہوا تھا کہ اسے قلعہ استخرہ کے حاکم شریف حسن کی سرکشی و بغاوت کی اطلاع ملی۔ غصہ نے اس کے چہرہ کا رنگ دگرگوں کر دیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ایک قلعہ کے حاکم کی اور یہ جرأت کہ وہ تیمور لنگ کی زندگی میں خود سری پر آمادہ ہو جائے حکم ہوا فوراً جنگ کی تیاری ہو۔ اور استخرہ کو فتح کر کے شریف حسن کی گوش مالی کی جائے، فوجی دربار میں جہاں سناٹا چھایا ہوا تھا حاکم قلعہ کے خلاف اشتعال کی لہر دوڑ گئی، بہادری کے ولولے بیدار ہو گئے۔

حمیدہ بانو بڑے عزم اور اعتماد سے آگے بڑھ کر امیر کے سامنے آئی اور قلعہ استخرہ کو فتح کر کے شریف حسن کو قرار واقعی سزا دینے کی اجازت طلب کی بادشاہ کی محبت ملکہ کی شجاعت پر یقین کے باوجود اجازت دینے میں آڑے آئی ایک طرف اندیشوں کی وجہ سے انکار اور دوسری طرف ملکہ کو فوراً خود اعتمادی کے سبب اصرار۔ بالآخر مغل بادشاہ نے ملکہ کے جذبہ کی لاج رکھ لی اور اس کی اہلیت پر بھروسہ رکھ کر اجازت دے دی۔

حمیدہ بانو کی سرکردگی میں دس ہزار سوار اور دو ہزار پیادے بڑے جوش سے استخرہ کی طرف روانہ ہوئے اولوالعزم ملکہ اپنی بارہ ہزار سپاہ کے ساتھ شمشیر بہ کف و کماں بر دوش قلعہ استخرہ تک جلد از جلد پہنچنے کی تمنا میں منزلیں طے کرتی چلی جا رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت، موسم کی سختی، اور راہ کی تھکان سے بے پرواہ ہو کر، اس سرعت اور ہوشیاری سے یہ سفر طے کیا کہ شریف حسن کانپ اٹھا، مگر

مقابلہ کی تیاری ضروری تھی اپنے اوسان درست کئے اور فوج کو تیغ و سناں، تیر و ترکش سے آراستہ ہونے کا حکم دے دیا۔

ملکہ نے پڑاؤ ڈالتے ہی اتمام حجت کے طور پر حاکم کو خط لکھا جس میں اس کی خودسری پر ناخوشی کا اظہار کیا گیا اور تنبیہہ کی گئی، ساتھ ساتھ یہ بھی یقین دلایا کہ اگر غلطی تسلیم کر کے شریف حسن سرکشی سے باز آ جائے گا تو ملکہ اسے تیمور معافی دلا کر بدستور اس کے عہدے پر فائز رہنے دے گی۔ ملکہ کی شجاعت و مردانگی سے مجال انکار نہیں مگر وہ پھر عورت تھی، سیاست اور جنگی ابلہ فریبیوں سے ناآشنا شریف حسن ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ اس وقت اور موقعہ سے فائدہ اٹھانے کی سعی کی اور ملکہ کو دھوکہ دے کر اپنی جنگی چال اور پروگرام سے غافل و بے خبر رکھنے کی ٹھان لی۔

اور ملکہ کے جواب میں یہ لجاجت آمیز درخواست گزاری کہ:۔

''غلام کا سر حاضر ہے میں بدستور وفادار ہوں، بغاوت و سرکشی کے متعلق سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں خدا گواہ کہ بعض الجھے ہوئے حالات کی بنا پر میری بغاوت کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ حکم عدولی کی تاب کہاں۔ کل حضور کے لئے اس قلعہ کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور خود بھی شرف قدم بوسی حاصل کروں گا۔''

شریف حسن کے جواب سے تیموری فوج اور ملکہ مطمئن ہو گئی۔ رات کے دو بجے تھے سناٹا چھایا ہوا تھا، تاریکی کا ہر طرف تسلط تھا کہ شریف حسن اپنی فوج کے ساتھ قلعہ سے نکل پڑا اور ملکہ کے پڑاؤ کو محاصرہ میں لے کر سوئے ہوئے سپاہیوں کو تلواروں کی زد پر لے لیا۔ حمیدہ بانو اتفاق سے تیمور کو خط لکھنے میں مشغول ہونے کی وجہ سے بیدار تھی، اس کا دل حاکم قلعہ کی اس چال پر کھول کر رہ گیا، جلدی جلدی زرہ بکتر پہنا اور ہتھیاروں سے لیس باہر نکلی تو پتہ چلا کہ دشمن نے اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا ہے، جان کا بچنا بھی محال ہے پہرہ دار دشمن کو روک رہے تھے، ملکہ کے محافظ سپاہی تتر بتر ہو چکے تھے، ملکہ نے اس نازک موقعہ پر بڑے استقلال اور حوصلہ سے کام لیا۔ شریف حسن کے نوجوان بیٹے نے انتہائی گستاخی سے کہا:

''اگر آپ مجھے اپنا شوہر تسلیم کریں تو محاصرہ ابھی اٹھا لیا جائے گا'' ملکہ کی آتش غیرت بھڑک اٹھی، اس کی عزت نفس نے اس کی شجاعت کے ولولوں کو بیدار کر دیا۔ کمان دوش پر سے

اتاری، ترکش سے تیر جدا کیا، اور کمان سے متصل کر کے نشانہ باندھا، تیر کمان سے جدا ہوتے ہی شریف حسن کے بیٹے کے حق میں پیام اجل بن گیا۔ اب ملکہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح غنیم کی فوج سے نبرد آزما تھی۔ ایک شان تہور اور صبر و استقلال کے ساتھ میدان میں زخم کھا کر ڈٹی رہی شریف حسن نے زندہ گرفتار کئے جانے کا حکم دے دیا تھا مگر کس کی مجال تھی کہ اس کی تلوار سے بچ سکتا ادھ خوابیدہ سپاہی بیدار ہو کر آتے رہے، شریف حسن کو اندیشہ ہوا کہ وہ گھیرے میں لیا جا رہا ہے، ملکہ نے اسے تنبیہ کی کہ کمک آ چکی ہے ہتھیار ڈال دے، اس آواز سے باغی سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ دفاعی جنگ کرنے لگے، رات بھر لڑائی ہوتی رہی، صبح کو دشمن کی فوج قلعہ بند ہو کر بیٹھ رہی۔

ملکہ کے بڑے گہرے زخم آئے تھے، جاں بری کی توقع نہ رہی تھی، اس نے سر دست محاصرہ اٹھا لیا اور استخرہ سے تیس میل کے فاصلہ پر موضع سلطانہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس کے ساڑھے تین ہزار بہادر سپاہیوں کی جانیں ضائع ہو چکی تھیں، ادھر وہ زخموں سے بے حال اور نڈھال تھی ادھر حاکم قلعہ کی چالاکی اور اس بزدلانہ شب خون پر غم و غصہ۔

وہ بہت دنوں تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی علاج ہوتا رہا۔ اس کے دل میں قلعہ استخرہ پر حملہ کر کے فتح کرنے کا جوش اسے مضطرب کئے رہا۔ صحت یاب ہو کر وہ قلعہ کی طرف روانہ ہو گئی اور محاصرہ کر لیا۔ وہ دشمن کی ہر گھات اور ہر چال سے واقف بھی ہو چکی تھی۔ یہ حملہ بڑا سخت تھا جس مردانگی اور شجاعت سے ملکہ نے یہ حملہ کیا تھا۔ وہ آپ اپنی مثال ہے، خود شمشیر بہ کف، زخم خوردہ شیرنی کی طرح جنگ آزما رہی، آخر جولائی ۱۳۸۴ء میں گیارہ دن کی خون ریز جنگ کے بعد ملکہ کی سرکردگی میں یہ قلعہ فتح ہوا۔ شریف حسن میدان جنگ میں کام آیا۔

اس قلعہ کی فتح اور محاصرہ ملکہ کی ذاتی رقابت، مستقل مزاجی استقلال اور دلاوری کی دلیل ہے، قلعہ فتح کر کے انتظام اپنے ایک معتمد کے سپرد کیا، شریف کے اہل و عیال کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا اور بغداد میں تیمور سے جا ملی۔ تیموری افواج اور خود تیمور ملکہ کو اپنی اقبال مندی کا سبب سمجھنے لگے۔

تیمور کے چین فتح کرنے کی تمنا پوری نہ ہو پائی تھی وہ مختلف مہمات میں الجھا رہا، آخر اس نے جلد از جلد چین پر حملہ کرنے کی ٹھان لی اور چین کی طرف پیش قدمی کی، قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا، بیمار پڑا اور ایسا سخت کہ زندگی کی امید نہ رہی، اسی عالم میں ملکہ کو بلایا، نزع کی کیفیت میں

مبتلا تھا، حمیدہ بانو کی آواز پر چونکا ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر گم ہو گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد آنکھ کھلی لب مرجھا گئے اور وصیت کی کہ میرے بعد حمیدہ بانو بیگم میرے تخت وتاج کی مالک ہو گی، یہ وصیت کر کے اس کے چہرے پر سکون چھا گیا، اور اس نے ۱۴۱۰ء داعی اجل کو لبیک کہا:

تیمور لنگ کے انتقال کے بعد تخت کے لئے بڑی خون ریزی ہوئی، اور ایک عرصہ کے قتل وخون کے بعد تیمور کا لڑکا مردان شاہ تخت نشین ہوا۔ حمید بانو بیگم کے کوئی اولاد نہ تھی سات لڑکے ہوئے لیکن تمام عالم شیر خوارگی ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مردان شاہ نے ملکہ کے احترام کو ہمیشہ مدنظر رکھا لیکن ملکہ کا دل تیمور کی موت کے بعد اچاٹ ہو گیا وہ تمام سرمائے کے ساتھ طفلس روانہ ہو گئی۔ مردان شاہ ہر چند کہ سوتیلا بیٹا تھا مگر حمیدہ بانو کی بڑی عزت ومحبت کرتا تھا، اس نے ملکہ کو روکنے لئے بڑی منت سماجت کی لیکن ملکہ کا جی اوبھ چکا تھا۔ بعض خود غرض لوگوں نے تیمور کی وصیت یاد دلا کر ملکہ کو دام تحریص میں پھنسانا چاہا اور مردان شاہ کو قتل کر کے حمیدہ بانو بیگم کو اس کی جگہ تخت نشین کرانے کا ارادہ کیا لیکن ملکہ اس سطح سے بہت بلند تھی۔ اس نے سب کو بڑی سختی سے جواب دیا اور مردان شاہ کا وفادار رہنے کی تلقین کی۔ ضرورت پڑنے پر مردان شاہ، ملکہ سے جنگی معاملات میں مشورہ کرتا تھا اور ملکہ سے اپنی نیک رائے سے مستفید کرتی طفلس میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرتی تھی۔ یا پھر مطالعہ میں مصروف رہتی۔ کبھی ایک ۲۱ سالہ لڑکا مرزا سلیمان گورگانی بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ اس پر لوگوں نے چہ مگوئیاں شروع کر دی اور یہ پاک دامن خاتون وہاں سے دل برداشتہ ہو کر باطوم روانہ ہو گئی۔ یہاں بھی اسے سکون نہ ملا۔ سلطینہ میں ایک درسگاہ قائم کی جس میں ہندوستان اور ایتھنز سے استاد بلا کر رکھے گئے تھے۔ ۸۰۰ طالب علم یہاں علم کی پیاس بجھاتے تھے۔ ایک روز اس مدرسہ پر بجلی گر پڑی اور بہت سے طلباء کی جانیں ضائع ہو گئیں لیکن سلسلہ تعلیم جاری رہا۔ آخر کو جنگ کے دوران یہ مدرسہ ختم ہو گیا اور ملکہ قسطنطنیہ آ ٹھہری۔

آخر عمر میں اس کا مشغلہ، تصنیف وتالیف، کتب بینی یا گھڑ سواری تھا۔ اس نے دو کتابیں بڑی محنت وجاں کاہی سے لکھیں ایک کتاب کا نام ''ترکی خواتین'' اور دوسری کا نام ''امیر تیمور کی فتوحات ہند'' ہے دونوں کتابیں تاریخی سوانحی کتابوں میں بہترین اضافہ ہیں۔

یہ دونوں کتابیں اس کے سفری مشاہدات، زندگی کے واقعات تاریخی حالات اور کتب

بنی کی تحقیقات کا نچوڑ ہیں۔ یہ کتابیں پہلے فرانسیسی زبان میں پھر فرانسیسی زبان سے دوسری زبانوں میں منتقل ہوئیں۔ اور آج بھی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دو شفا خانے چار مدرسے، تین مسافر خانے عربستان میں اب تک اس کی یادگار ہیں روم میں ایک مسجد بنوائی جس میں ایک مسافر خانہ ایک کتب خانہ اور ایک مدرسہ تھا یہ مسجد بیس لاکھ روپے کی لاگت سے بنی تھی۔

۴۳۸ میں ۶۱ سال کی عمر میں اس شیر دل خاتون، اس مصنفہ، شاعرہ اور شجاع و بہادر فاتح عورت پر بخار نے قابو پالیا یہ سہ روزہ بخار دراصل اس کی موت کا پیغام تھا اور تین روز کے شدید بخار کے بعد اس تاریخی شخصیت نے جان جان آفریں کے سپرد کی اس وقت اس کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا۔ صرف ایک کتب خانہ اس کی ملکیت تھا جس میں پونے دو لاکھ کتابوں کا قیمتی سرمایہ تھا۔

آج بھی تاریخ خواتین عالم اور فتح و شکست بہادری اور شجاعت کے صحیفوں کے اوراق میں امۃ الحبیب ''حمیدہ بانو'' کا ''نام اور تذکرہ'' ایک صدائے حیات بن کر کہہ رہا ہے کہ:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

(نامور مغل شہزادیاں)

❁❁❁❁

قلق نگار بیگم

......طلحہ علی......

۱۴۷۸ء میں چنگیزی نسل کا جری مغل یونس خاں بظاہر اپنی لڑکی مہر نگار سے توتلی زبان میں مصروف گفتگو تھا مگر اس کا دل قبیلہ ساغرجی کے سربرآوردہ ودلیر میدان مرد شیر حاجی بیگ کی لڑکی دولت بیگم کی عافیت معلوم کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کی نگاہ دروازہ کی طرف اور کان کسی خوشخبری دینے والی آہٹ کے منتظر تھے کہ یکا یک اسے ایک چاندی بیٹی کی ولادت اور دولت کے یہ خیریت ہونے کی خبر دی گئی اس اطلاع نے اس کے چہرے کا سارا اضطراب دھویا اور وہ خوشی خوشی حرم میں دوڑ گیا۔ لڑکی حسن کا شاہکار تھی۔ مہر نگاہ سے بھی زیادہ حسین وتندمند، ماں باپ نے قلق نگار نام تجویز کیا اور دونوں نے مہر نگار اور قلق نگار کی بڑھتی ہوئی عمروں کے مطابق ان کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ دی قلق نگار اپنی بڑی بہن سے زیادہ ذہین ثابت ہوئی، اور بہت جلد اپنے والدین کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گئی صغیرسنی کے زمانے ہی میں اس کے دل میں فنون جنگی میں مہارت حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اور اس نے دیگر علوم وفنون سے زیادہ اپنی توجہ اسی طرف مبذول کر دی۔ نیزہ بازی میں طاق ہوگئی تو شمشیر زنی کا نمبر آیا تلوار چلانے میں بھی اس نے جنگ جو سپاہیوں سے لوہا منوالیا۔ بلا کی شہ سوار تھی، سرکش سے سرکش گھوڑا رام کر لینا اس کے لئے معمولی بات تھی خطرات سے الجھنا اس کا مزاج تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ وہ منتظر رہتی تھی کہ اسے کوئی بہادری کا کارنامہ دکھانے کا موقعہ میسر آئے۔

۱۴۷۸ء میں جب کہ وہ پندرہ برس کی تھی سلطان ابوسعید نے اپنی مرحوم چہیتی بیوی سعیدہ بانوی یادگار عمر شیخ مرزا کے لئے قلق نگار بیگم کا انتخاب کیا۔اور یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

شادی کے بعد قلق نگار عمر شیخ مرزا پر چھا گئی،اور عمر شیخ مرزا اس کے چشم وابرو کے اشاروں پر دلدادہ بن چکا تھا،لیکن سلطان ابوسعید کے انتقال کے بعد قلق نگار کے اشارے پر اس نے فرغانہ کا خودمختار حاکم بننا پسند کیا مزاج کے اعتبار سے دونوں میاں بیوی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔عمر شیخ مرزا اگر طبعتاً صلح پسند اور نرم مزاج تھا تو قلق نگار بیگم عادتاً جنگ جو اور درشت خو تھی۔وہ اگر عفو ودرگزر سے کام لیتا تو خطا کار کے لئے یہ قہر وسزا بن جاتی۔وہ لڑائی سے دامن بچاتا تو یہ لڑائی کی آگ میں کود پڑنا پسند کرتی۔وہ غصہ ضبط کرنے کی سعی کرتا تو یہ مغلوب الغضب ہو جاتی۔طباع کا یہ بعد المشر قین کی خدا کی پناہ دونوں مزاج کے اعتبار سے دو متوازی خطوط کی طرح تھے۔جو آپس میں کبھی نہیں ملتے لیکن اسلامی اقدار مشر قیت کے انداز اور گداز محبت نے دونوں کے دلوں کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔دونوں کے دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے تھے۔یہ مغلوب الغضب اور غصہ در ملکہ شوہر کے سامنے آتے ہی انتہائی نرم مزاج شیریں گفتار بردبار اور باحیا بن جاتی اور شوہر کے سامنے نگاہ اٹھا کر بات کرنے کی بھی جسارت نہ کرتی۔

قلق نگار کی سیاسی بصیرت اور جوان مردی کی وجہ سے ہی عمر شیخ مرزا فرغانہ پر حکومت نہ کر سکا۔ورنہ دشمن ہر گھڑی گھات میں رہتے تھے۔اپنوں نے بیگانہ وحشی اور عزیزوں نے غیرت کا سلوک روا رکھا۔دوستوں نے دشمنی کے انداز اختیار کیے۔فرغانہ پر کئی بار حملہ کیا لیکن قلق نگار بیگم کی جرأت وبہادری نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے اور فرغانہ کی ایک انچ زمین پر بھی کوئی قابض نہ ہو سکا اس کے نندوئی احمد مرزا والی سمرقند اور بھائی محمود مرزا نے ساز باز کر کے فرغانہ پر حملہ کیا تو نصف فوج کی کمان قلق نگار بیگم نے سنبھالی۔

بابر اس وقت تین چار سال کا تھا۔اور باپ کے ہمراہ لڑائی میں شریک تھا۔قلق نگار بیگم نے پہلے تو بھائی کو سخت سست کہا۔اور جب وہ نہ مانا تو اس کے لشکر پر جا پڑی،اس بے جگری سے لڑی کہ بھائی کی فوج کے حوصلے پست کر دیئے اور دشمن کو فرغانہ چھوڑنا پڑا۔

قلق نگار کو مصوری کا بہت شوق تھا۔کئی بہترین چینی مصور اس کے ملازم تھے۔اپنے صرفہ

خاص سے یہ مصوروں کو ماہانہ مشاہرہ دیا کرتی۔ ایک چینی مصور "چن چاؤ" سے اس نے یہ فن سیکھا اور یدطولی حاصل کیا جس نشان کو یہ میدان جنگ میں لے کر نکلتی اس پر ایک مہیب شیر کی صورت بنی ہوئی تھی۔ جو اس کے فن مصوری کا نمونہ تھا۔ کسی بھی آدمی یا جانور کو صرف ایک نظر دیکھ کر اس کے خدوخال کو کاغذ پر منتقل کر لینا اس کے لئے کوئی مشکل نہ تھا۔ اس کے محل پر گزشتہ زمانے کے بادشاہوں اور جاں باز دلیروں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ اس کی بنائی ہوئی یہ تصویریں سمرقند و ہرات، بخارا اور ایران میں بڑی بڑی قیمتوں پر فروخت ہوئیں۔ جب اس کے دیوروں نے فرغانہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا تو قلق نگار نے بارہ گز لمبے کاغذ پر اپنی فوج کا نقشہ کھینچ کر روانہ کیا۔ اور سپاہیوں کی صورتیں ڈراؤنی بنا کر نیچے لکھ دیا کہ:

"جو شخص جنگ کا ارادہ کرے ان خون خوار دلاوروں کی صورتیں دیکھ لے"

نہایت سادہ طریقے سے رہتی، زیورات اور جواہرات کے استعمال سے گریز کرتی۔ کپڑے عموماً چمڑے کے پہنتی، صد ہا قسم کی پوستینیں جن پر بہادر فوجیوں کی صورتیں ہوئیں محل میں لٹکتی رہتی تھیں۔

یہ بیگم جتنی حسین تنومند اور دلیر تھی۔ اتنی ہی شعلہ خو اور آتش مزاج تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر کڑی سے کڑی سزا دیتی۔ لیکن کسی کو قتل کبھی نہیں کرایا۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ جس پر جتنا خفا ہوتی اور جتنی کڑی سزا دیتی بعد میں اسی قدر انعام واکرام سے نوازتی اسے یہ ناز تھا کہ اس کی رگوں میں چنگیزی لہو موجزن ہے۔

کئی بار ایسا بھی ہوا کہ دوران جنگ غصہ میں دشمنوں کی صفوں کو چیرتی ہوئی گھس گئی اور دشمنوں میں گھر گئی مگر بغیر کوئی زخم کھائے صحیح وسالم نکل آئی۔

ایک بار فرغانہ کے خوفناک جنگلوں میں شکار کی غرض سے گئی ہوئی تھی۔ پہاڑی ہرنوں کا تعاقب کرتے کرتے شام ہوگئی۔ ہر طرف سناٹا اور تاریکی کا دور دورہ تھا۔ آبادی کا میلوں نشان نہ تھا کہ قلق نگار نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آہٹ سنی اور چوکنی ہو کر بے جھجک آنے والوں کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں چند سوار آتے ہوئے دکھائی دیئے اور یہ اجنبی جتھا ادھر ہی حملہ آور ہوا تھا جدھر سے محل کی طرف جانے کا راستہ تھا جو بہت تنگ تھا۔ سوار تعداد میں سات تھے۔ صرف عورتوں کو دیکھ

کران کی ہمت بڑھ گئی۔ اور مقابل آ کر کہا:

''کہ اگر جان کی خیر چاہتی ہو تو اپنے گھوڑے اور تمام ساز و سامان ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ ہم تمہیں انتہائی اذیت دے کر پہاڑی گھپاؤں میں ڈال دیں گے۔ ہم تعداد میں چالیس ہیں۔ ہمارے ساتھی پیچھے آ رہے ہیں''۔

یہ سن کر خواصوں کے ہوش اڑ گئے۔

لیکن قلق نگار ذرا بھی ہراساں نہ ہوئی۔ بلکہ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ قزاقوں کی یورش اس کے سمند شجاعت کے لئے تازیانہ بن گئی۔ اور اس نے بھرا ہوا طمنچہ سر کر دیا جس سے ایک قزاق نے وہیں دم توڑ دیا اور گولی دوسرے قزاق کا شانہ توڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ یہ ماجرا جو دیکھا تو قزاقوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ راہ فرار اختیار کرنے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑی، اس اندھیری رات اور ایسی بھیانک جنگ میں اس کی آتش مزاجی نے مصلحت اندیشی کو بالائے طاق رکھ کر اسے قزاقوں کا پیچھا کرنے پر اکسایا، اس نے ایک میل تک ان درندہ صفت راہ زنوں کا پیچھا کیا۔ لیکن وہ ہاتھ نہ آئے۔ اور گھنے جنگل میں کسی سمت اوجھل ہو گئے۔

وہ اپنی شجاعت اور دلیری کی وجہ سے محلات سے لے کر جھونپڑوں تک بڑی عقیدت و احترام کی نگاہ سے جانی تھی اور اس کے کارنامے دہرائے جاتے تھے۔

اس نے اپنی سواری کے گھوڑے کو عجیب انداز سے تربیت دی تھی۔ اس کا نام رستم تھا۔ وہ بجائے گھاس کے گوشت کھانے کا عادی ہو چکا تھا اور خون پیتا تھا۔ ایک خاص کمرہ میں بند رہتا تھا یہ گھوڑا پہلے دشمن پر حملہ آور ہوتا پھر اس کی ہڈیاں چبا ڈالتا۔ تمام فرغانہ میں اس کی دھوم تھی۔ اور لوگ اس کے نام سے تھراتے تھے۔ یہ قلق نگار کے بعد صرف بابر کو قریب آنے اور سوار ہونے کی اجازت دیتا۔ قلق نگار کے بعد صرف بابر کو قریب آنے اور سوار ہونے کی اجازت دیتا۔ قلق نگار کے انتقال کے بعد یہ عرصہ تک بابر کے ساتھ رہا اور انتہائی وفاداری سے اس نے بابر کا ساتھ دیا۔

بابر ابھی گیارہ برس ہی کا تھا۔ ۱۴۹۶ء میں شیخ عمر مرزا کا انتقال ہو گیا، اس صغیر سنی کے زمانے میں بابر ایسے وقت میں فرغانہ کا حکمراں ہوا جب اس کے ماموں اور چچا اور شیبان جیسا قوی دشمن فرغانہ پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ بابر نے شجاعت، عالی حوصلگی، جوان مردی اور بلند ہمتی

کے جوہر ماں سے پائے تھے۔ قتلق نگار جیسی بیوی نے اگر ایک طرف شوہر کی ریاست کو دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھا تو دوسری طرف اسی جیسی ماں نے بابر جیسے اولوالعزم اور بہادر کو جنم دے کر تاریخ کو ایک نئے باب سے روشناس کرایا۔

یہ جب تک زندہ رہی برابر بابر کو دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھنے کیلئے نہ صرف مشورے دیتی رہی بلکہ عملی جوہر بھی دکھاتی رہی۔

۹۱۱ھ میں یکا یک بیمار ہوئی فصد کھلوائی گئی مگر حاصل نہ نکلا۔ سید طبیب نامی خراسانی حکیم نے خراسانی طریقہ سے ہندوانہ دیا۔ مگر افاقہ نہ ہوا۔ بابر کے تمام جتن کے باوجود دوا کارگر نہ ہوئی آخر کو وہ وقت آ گیا۔ جب مریضہ کے حق میں دعائیں بھی بے اثر ہو کر رہ گئیں اور اس علالت کے چھ دن بعد دوشنبہ کے روز وہ جہان فانی سے عالم جاودانی کو کوچ کر گئی۔

بابر نے فرغانہ ہی میں اپنے باپ کی طرح اپنی ماں کا مقبرہ بھی بنوایا اور جب تک وہ فرغانہ رہا۔ بلا ناغہ آٹھویں دن قتلق نگار کے مقبرہ پر فاتحہ خوانی کے لئے جاتا رہا۔

(نامور مغل شہزادیاں)

ماہم بیگم

......طلحہ علی......

سلطنت مغلیہ کے دور میں میر عاشق جیسے معمولی شہر کی کوئی اہمیت نہ تھی، اس شہر میں نہ تو کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس کی بدولت یہ شہر تاریخ کے سینے کی امانت بن جاتا۔ اور نہ محل وقوع حدود اربعہ اور آب وہوا کے اعتبار سے اسے کوئی جغرافیائی اہمیت میسر تھی لیکن ۱۴۹۰ء میں میر عاشق دھرتی پر جیسے آکاش کی دھنک اتر آئی ایک اجنبی خوشبو سے سارا شہر مہک اٹھا۔ ایک نئی کلی کی دل آویزی نے سارے شہر کو چونکا دیا اور حسین کلی پھول بن کر مہکی تو میر عاشق جو دنیا کی نگاہوں میں بے وقعت تھا، تاریخ جس کے ذکر سے دامن بچا کر گزر جاتی تھی تاریخ کیلئے وجہ کشش بن گیا۔ ایک مغل گھرانے میں ایک ننھی سی معصوم وحسین بچی کی ولادت نے اس غیر اہم اور معمولی شہر کی قسمت ہی بدل دی۔ یہ بچی جوں جوں بڑھتی گئی اس کی طباعی اور ذہانت کے جوہر کھلتے گئے اور رنگ نکھرتا گیا۔ اس کے جمال کی تابانی سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔

ماں باپ نے اس کا نام ماہم بیگم تجویز کیا، اور سولہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ مجسم قیامت بن گئی۔ اس کے حسن کی جوت سے فضا جگمگا اٹھی۔ اور ۱۵۰۷ء میں بابر جیسے اولوالعزم بادشاہ اور بہادر جنگجو کی نگاہ انتخاب پڑی اور خراسان میں ظہیر الدین بابر سے اس کی شادی ہوگئی۔

بابر سے شادی ہونا تو خیر کوئی ایسی اہم اور توجہ طلب بات نہ تھی، لیکن شادی کے بعد، بابر کی زندگی کے ہر مرحلہ اور حیات کے ہر موڑ اور راہ کے ہر پیچ وخم میں اس کا ہم سفر اور ساتھی بنا رہنا

جان جوکھوں کا کام تھا۔ جو اسلامی شعار کی ڈگر پر گامزن ہو سکے اور جسے مشرقی عورت کے صحیح کردار اور خدوخال میسر آئے ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ظہیر الدین بابر کی زندگی کا بیشتر حصہ، مصائب، تکالیف، لڑائیوں اور صلحوں، شکستوں اور فتوحات میں گزرا، کبھی اس کے ماموں اور چچا اس کی جان کے دشمن ہیں تو کبھی شیبانی خاں جیسا بہادر اسے برباد کرنے کے درپے، کبھی خود اس کا ماں جایا اس کے خلاف صف آراء، کبھی خود اس کی قوم کے دلاور اس کی خانماں ویرانی پر آمادہ کبھی اس کے دوست عزیز اس کے دشمن اور بیگانے، اس کی زندگی جدوجہد سے عبارت تھی۔ کہیں وہ کامیاب، شادکام اور فاتح کی حیثیت سے دیوقامت بن کے ابھرا ہے تو کہیں ناکام وشکستہ دل مفتوح کے روپ میں انتہائی بونا بن کرنا قابل التفات بن گیا ہے۔ ایسے شخص کی شریک حیات بن کر ماہیم بیگم نے زندگی کے ہر مرحلے اور ہر آڑے وقت میں قدم قدم پر جس ہمدردی و غمگساری، دم سازی و دل نوازی دل ہی و دل داری کا ثبوت دیا وہ نسوانی تاریخ میں قابل تقلید کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے اگر بابر غازی بادشاہ کا نام ایک عظیم جرنیل، ایک حوصلہ مند جنگجو اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے بانی کی حیثیت سے ناقابل فراموش ہے تو ماہیم بیگم کی سچی رفاقت اور تن دہی اور دل سوزی سے بابر کی ہم سفری بھی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے۔

بابر شکست کھا کر حوصلہ ہار بیٹھا ہے تو ماہم نے اسے عزم و عمل اور حوصلہ مندی کی راہ پر لگایا ہے، بابر اگر اداس ہے تو ماہم نے اس کے چہرے سے گرد ملال کو دھویا ہے، بابر کا جب سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے، تو ماہم اس کے لئے رفیق دومساز رہی ہے، بابر اگر ڈوبا ہے تو ماہم نے اپنی جان کی پروا کئے بغیر اسے ابھارا ہے اور پار لگایا ہے۔

ایک بار بابر کو افغانوں اور ازبکوں کو پامال کرنے کی کوشش میں شکست کھا کر بھاگنا پڑا جان بچانے کے لئے ہزارہ کی گھاٹیوں کی طرف پناہ لینے کے لئے بے سروسامانی کے عالم میں رخ کرنا پڑا۔ اس وقت صرف ماہم اس کے ساتھ تھی اسمٰعیل نامی ایک گھاٹی میں پناہ لینے کے لئے یہ دونوں اتر پڑے اور چھپ رہے۔ مشکل سے دو گھنٹے گزرے ہوں کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں نے انہیں چوکنا کر دیا اور بابر نے سمجھ لیا کہ خطرہ سر پر ہے۔ دشمن تعاقب میں آئے ہیں۔ ایک آواز نے اس اندیشے کی تصدیق کر دی جو نہایت وثوق سے بلند ہوئی کہ:

''بابر یقیناً اسی گھاٹی میں پوشیدہ ہے''

بابر کے ذہن میں ابھی اپنی مدافعت یا فرار کی کوئی تدبیر نہ آ پائی تھی کہ ماہم بیگم نے انتہائی حوصلہ مندی اور دانشمندی سے کام لے کر اپنا لباس اور ہیئت تبدیل کی اور جان کو خطرے میں ڈال کر دشمنوں کی سمت چل دی جب دشمن کے قریب پہنچی تو اس نے ایک عجیب انداز اور لہجے میں کہا:

''بابر چلا، دیکھو، وہ دیکھو، ادھر کی طرف بھاگا گیا ہے''

یہ سن کر دو فوجی استفسار حال کے لئے آگے بڑھے اور پوچھا کہ:

''بابر کہاں ہے؟ کس طرف گیا ہے؟''

ماہم نے اسی گھبرائے ہوئے لہجے میں غلط سمت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ:

''جلد پیچھا کرو ورنہ وہ چھلاوا ہے ہاتھ نہ آئے گا''

تمام سوار انتہائی عجلت اور گھبراہٹ میں اسی طرف چل دیئے اور جب وہ لوگ بہت دور چلے گئے تو بابر مع ماہم کے وہ جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ چھپ رہا۔

دوسرا واقعہ اور بھی حیرت انگیز اور دلچسپ ہے بابر نے بنگال پر حملہ کیا تو گھاگرہ ندی کو عبور کرتے وقت اس کا گھوڑا بدک گیا اور دریا میں لے کر چل دیا۔ بابر یہ دیکھ کر گھوڑے سے اتر کر پانی میں کود پڑا اور تیرنے لگا لیکن رانوں میں اس قدر شدید چوٹ آئی تھی کہ دریا عبور کرنا ناممکن نظر آتا تھا اور تیرنا دوبھر ہو گیا تھا۔ ماہم نے جو یہ دیکھا تو فوراً خود بھی گھوڑے پر سے دریا میں کود پڑی۔ اور تیرتی ہوئی بابر کے قریب پہنچی، نہایت ہوشیاری سے بابر کو اس وقت دریا کے منجدھار سے نکال لائی جب دریا کی موجیں بابر کو ڈوبنے کے قریب تھیں۔

ماہم بیگم انتہائی دلیر اور شجاع تھی، غضب کی تیرانداز اور نشانہ کی سچی تھی اور صرف آواز پر گولی مارتی تھی اور نشانہ خطا نہ ہوتا تھا۔ عموماً جنگی لباس میں بابر کے ہمراہ رہتی جتنی عمر اس نے بابر کے ساتھ سفر کیا اور لڑائیوں میں ساتھ دیا، کم عورتوں کے حصہ میں یہ جرأت اور شوہر سے درمندی آئی ہوگی۔ اس کی شجاعت اور رفاقت بابر کے لئے حصار عافیت کی حیثیت رکھتی تھی بابر کو ماہم بیگم سے غیر معمولی محبت تھی اور ماہم تھی بابر کی والہ وشیدا تھی۔ یہ حرم کی سب سے بڑی خاتون تھی اور بابر کے سب سے بڑے لڑکے ہمایوں کی ماں ہونے کی وجہ سے اسے خاص اہمیت وامتیاز حاصل تھا۔ ہمایوں

اور عسکری کے علاوہ بچے ہوئے مگر کوئی بچپن کی سرحدوں کو عبور نہ کر سکا۔

ماہم بچوں کی پرورش اور تربیت میں خاصا وقت صرف کرتی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں ہی ہمایوں اور کامران کو جنگ پر روانہ کر دیا اور چھ سات برس کے سن میں حکمرانی کے اطوار و انداز سکھا دیئے تھے۔ اسے مذہب سے بڑا لگاؤ تھا اور شراب سے نفرت تھی اور بابر بلا کا مے نوش، لیکن ماہم نے اس سلسلے میں کبھی بابر کا ساتھ نہ دیا۔ بابر کو جب یہ محسوس ہوا کہ ماہم اس کی مے کشی سے آزردہ ہوتی تو علیحدہ جنگل کے کسی گوشے میں جا کر شراب پی لیتا۔

بابر نے ۱۵۲۵ء میں ہندوستان کا رخ کیا۔ روانہ ہونے سے قبل جو ضروری انتظامات کابل میں کئے ان میں یہ بھی تھا کہ دلدار بیگم زوجہ بابر کے دو بچوں گلبدن بیگم اور ابوالناصر ہنداں کو پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے ماہم بیگم زوجہ بابر کے دو بچوں گلبدن بیگم اور ابوالناصر ہنداں کو پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے ماہم بیگم کے حوالے کر دیا تھا۔

گلبدن بیگم کی عمر اس وقت دو برس ہوگی۔ ماہم بیگم نے بہ رضا و رغبت شوہر کے اس حکم کی تکمیل کی، اور اس محبت و توجہ سے اپنی سوت کے بچوں کی پرورش کی بابر نے اس جذبہ ایثار کو سراہا اور بیان کیا کہ:

> "ماہم بیگم نے اس کی خاطر دلدار بیگم کے بچوں کی پرورش اس طرح کی جیسے کوئی لونڈی یا ملازمہ پرورش یا تربیت کرتی ہو۔ یہ اسی کی تربیت کا فیض تھا کہ گلبدن بیگم جیسی ہونہار لڑکی مورخ کی حیثیت مشہور ہوئی اور ہنداں بابر کے تمام لڑکوں سے زیادہ جری اور مہذب ثابت ہوا خود گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ میں ماہم بیگم کا انتہائی محبت و احترام سے ذکر کیا ہے"

ماہم انتہائی خوش مذاق اور سلیقہ مند تھی چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتی بڑی سے بڑی مصیبت میں دل شکستہ اور ہراساں نہ ہوتی۔ مصحف پاک ہر وقت اس کے پاس رہتا اور آواخر عمر میں اس نے کلام پاک حفظ بھی کر لیا تھا۔ انتہائی فصیح و بلیغ شیریں گفتار نرم مزاج حلیم الطبع اور بربار، مخیر، اور رحم دل تھی بابر ماہم کی وجہ سے ہمایوں کے تساہل اور غلطیوں سے چشم پوشی کرتا اور اس کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتا۔

۱۵۲۸ء میں بابر کو جب ذرا فراغ میسر ہوا تو اس نے کابل سے اپنے اہل و عیال اور دیگر اعزہ کو ہندوستان بلایا۔ اس سلسلہ میں کابل میں ریشہ دوانیوں کی وجہ سے تاخیر ہوتی رہی۔ جنوری ۱۵۲۹ء میں ماہم سب سے پہلے روانہ ہوئی۔ یہ ایک خاص دستے کی حفاظت میں آئی جو بہت تھوڑے آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اس دستے نے مسافت کو تیزی سے طے کیا اور بہت جلد آگرہ پہنچ گیا جس روز ماہم آگرہ پہنچی ہے اسی روز مدت کے بچھڑے ہوئے سپر ملے۔ گلبدن آگرہ پہنچنے کے بعد عیش و عشرت سے زندگی بسر کرنے لگیں۔

۱۵۳۰ء میں بابر عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارا، ماہم بیگم کا جیون ساتھی ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا وہ بابر کے انتقال کے بعد کبھی نہ ہنسی، اپنے صرفہ خاص سے کافی خیرات کی اور بابر کا مقبرہ تیار کرایا۔

ہمایوں کو تخت و تاج سے محروم رکھنے کے لئے اور مہدی خواجہ کو وارث بنانے کیلئے بڑی کوششیں کی گئیں لیکن ماہم کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ گئی۔ ہمایوں کے زمانے میں ماہم کی زندگی کچھ خوشگوار نہ گزری، ہمایوں دشمنوں سے گھرا رہا، اور خود مصائب میں مبتلا رہا۔ ایک تو شوہر کی دائمی مفارقت کا غم دوسرے بیٹے کی پریشانیوں نے اسے گھلا کر رکھ دیا۔ آخر ۱۵۳۴ء میں ماہم بیگم نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔

(نامور مغل شہزادیاں)

ملکہ پونجی خاتون

محمد قاسم فرشتہ

بیجاپور کے پہلے عادل شاہی فرمانروا یوسف عادل شاہ (۸۹۵ھ ۱۴۸۹ء تا ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء) کی بیوی تھی۔ وہ بڑی بیدار مغز باہمت اور دوراندیش خاتون تھی۔ ۹۱۶ھ ۱۵۱۰ء میں یوسف عادل شاہ نے وفات پائی تو اس کا نابالغ بیٹا اسماعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا اور کمال خان دکنی نائب السلطنت مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد کمال خان کے دل میں خود بادشاہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی اور اس نے اپنے نابالغ آقا کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسماعیل عادل شاہ کی والدہ ملکہ پونجی خاتون کو کمال خان کے منصوبے کا علم ہوا تو اس نے اس کا منصوبہ ناکام بنانے کا تہیہ کرلیا مگر مشکل یہ تھی کہ دربار اور فوج کے پیشتر امراء کمال خان کے حامی تھے۔ اس نے اس صورت حال سے اسماعیل کی دایہ کے خاوند یوسف ترک آگاہ کیا تو وہ اپنے آقا کی خاطر جان قربان کرنے پر تیار ہوگیا۔ چنانچہ اس نے ایک دن کمال خان کو قتل کردیا اور خود بھی کمال خان کے حامیوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔

کمال خان کی بیوی نے اپنے لڑکے صفدر خان کو باپ کے خون کا بدلہ لینے پر ابھارا اور اس سے کہا کہ اسماعیل عادل شاہ اور اس پونجی خاتون کو قتل کر کے تخت و تاج پر قبضہ کرلو۔ صفدر خان نے فوراً فوج کو قلعے پر حملہ کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ اُدھر قلعے میں پونجی خاتون کے پاس صرف چھ سو مغل دکنی اور حبشی سپاہی تھے۔ اس نے ان کو جمع کر کے کہا، اسماعیل ابھی بچہ ہے دشمن چاہتا ہے کہ اس کو قتل کر کے خود تاج وتخت پر قبضہ کرلے تم میں سے جو ہمارے وفادار اور نمک حلال ہوں وہ قلعہ کے

اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کریں اور جن کو اپنی جان پیاری ہے وہ قلعہ سے نکل جائیں۔ کفرانِ نعمت کرنے والوں کو ایک نہ ایک دن ضرور سزا ملے گی۔

پونجی خاتون کی تقریر سن کر تقریباً تین سو جانبازوں نے اس کا ساتھ دینے کا عہد کرلیا باقی سب قلعہ سے نکل کر صفدر خان سے جاملے۔ اب پونجی خاتون نے قلعے کے دروازے بند کر لئے اور اپنے جانثاروں کو محل کی چھت پر کھڑا کر دیا پھر وہ خود، دل شاد آغا (اسماعیل عادل کی پھوپھی) چند دوسری خواتین اور اسماعیل عادل شاہ کو ساتھ لے کر محل کی سب سے اونچی جگہ پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ ان خواتین نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا اور سب تیر و کمان سے لیس تھیں۔ اسی اثنا میں صفدر خان فوجِ گراں کے ساتھ قلعہ کے قریب پہنچ گیا اور اپنے سپاہیوں کو حملے کا حکم دیا۔ پونجی خاتون، دل شاد آغا اور ان کے جانثاروں نے حملہ آوروں پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی لیکن صفدر خان اپنا دباؤ برابر بڑھاتا جارہا تھا۔ عین اس وقت عادل شاہی خاندان کا ایک قدیم نمک خوار مصطفیٰ آقا رومی پچاس تو بچیوں کو لے کر پونجی خاتون کی مدد کو پہنچ گیا۔

بہادر خواتین نے اس کو دعائیں دیں اور رسے نیچے لٹکا کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو اوپر کھینچ لیا۔ انہوں نے قلعے میں موجود توپوں سے حملہ آوروں پر گولے برسانا شروع کر دیئے۔ اب صفدر خان نے اپنی ماں کے مشورے سے جنگی تدبیر بدل دی اور بڑی توپیں لگا کر قلعے کی دیواریں گرانے کی فکر میں لگ گیا۔ یہ دیکھ کر ملکہ پونجی خاتون نے اپنے تمام سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سب اِدھر اُدھر چھپ جائیں۔ جب وہ لڑائی چھوڑ کر چھپ گئے تو عورتیں اپنے اصل (زنانہ) لباس میں قلعے کی چھت پر کھڑی ہوگئیں۔ صفدر خان نے سمجھا کہ قلعہ کے لشکری پونجی خاتون کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور اب قلعے پر قبضہ کرنا معمولی بات ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو قلعے پر دوبارہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کی فوج بڑے جوش سے آگے بڑھی اور قلعے کا ایک دروازہ توڑ ڈالا۔ پھر وہ دوسرے دروازے پر حملہ آور ہوئی۔ اس وقت پونجی خاتون نے اپنے جانثاروں کو اشارہ کیا۔ وہ اللہ اللہ کے نعرے لگائے حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے، اوپر سے خواتین نے بھی ان پر تیروں اور پتھروں کی بارش شروع کردی۔

صفدر خان کی آنکھ میں ایک تیر لگا اور اس نے گھبرا کر قلعہ کی دیوار کے نیچے پناہ لی۔ پونجی

خاتون للکار للکار کر اپنے جانثاروں کا دل بڑھا رہی تھی۔ اس نے صفدر خان کو قلعہ کی دیوار کے نیچے دیکھا تو اپنے بیٹے اسماعیل عادل شاہ کو اس پر ایک بڑا پتھر پھینکنے کا اشارہ کیا، اس نے ماں کے حکم کی تعمیل کی۔ صفدر خان پتھر لگتے ہی مر گیا۔ فوج نے اپنے سردار کو مرتے دیکھا تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس فتح کے بعد اسماعیل عادل شاہ بلا کھٹکے حکومت کرنے لگا۔

اس نے یوسف ترک کا جنازہ نہایت تزک و احتشام سے اٹھوایا اور اس کی قبر پر ایک شاندار مقبرہ بنوایا۔ پونجی خاتون نے صفدر خان کی والدہ کے ساتھ بڑا فراخدلانہ برتاؤ کیا اور اسے عزت و احترام کے ساتھ ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔

یہ پونجی خاتون کی شجاعت اور تدبیر و ہمت ہی کا نتیجہ تھا کہ یوسف عادل شاہ نے پچیس سال تک حکومت کی اور اس کے بعد بھی عادل شاہی خاندان بیجاپور پر ڈیڑھ صدی سے زیادہ عرصے تک حکمران رہا۔ (تاریخ فرشتہ جلد دوم)

چاند بی بی

طالب الہاشمی

یہ شیر دل خاتون حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر (دکن) کی بیٹی تھی۔ ماں کا نام خونزہ ہمایوں تھا۔ والدین نے اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور نہایت لائق اور قابل استادوں کو اس کی تعلیم پر مامور کیا۔ چنانچہ چند سال کے اندر شہزادی جملہ علوم و فنون میں ماہر ہوگئی۔ خود بادشاہ چاند بی بی کو سپہ گری، شہسواری، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی تعلیم دیا کرتا تھا اور ملکی نظم و نسق سے متعلق امور بھی سمجھاتا۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کے اوصاف حمیدہ کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اس کے علم و دانش اور لیاقت کا حال بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ (۹۶۵ھ، ۱۸۵۸ء تا ۹۸۷ھ، ۱۵۸۰ء) نے سنا تو اس نے حسین نظام شاہ کو چاند بی بی کے لیے پیغام بھیجا جسے اس نے منظور کر لیا اور چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے ہوگئی۔

بیجاپور (سسرال) پہنچ کر چاند بی بی نے اپنی سلیقہ شعاری اور حسنِ لیاقت سے سسرال والوں کے دل اپنی مٹھی میں کر لیے، ساتھ ہی اپنی رعایا اور زیردستوں سے ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ سب اس کے گن گانے لگے۔ ایک دفعہ علی عادل کو خبر ملی کہ دربار کے کچھ امیر اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور اس کی جان لینے کے درپے ہیں۔ اس نے ان امیروں کے نام معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اب وہ ہر وقت اپنی جان کے خوف سے متفکر رہنے لگا۔ چاند بی بی نے شوہر کی بدلی ہوئی حالت دیکھی تو اس نے بڑا اصرار کر کے بادشاہ سے اس کا سبب دریافت کیا، جب

اس نے بتایا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے تو بہادر چاند بی بی نے شوہر کو تسلی دی اور کہا کہ میرے جیتے جی آپ کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ آج سے رات کو میں آپ کی حفاظت کیا کروں گی، آپ اطمینان سے سویا کیجئے۔

چنانچہ اس دن سے چاند بی بی بذاتِ خود شاہی خواب گاہ کی نگہبانی کرنے لگی۔ ایک رات کو یکا یک کسی کے بالا خانے پر کودنے کی آواز آئی۔ وہ پہرے داروں کو آواز دینے یا شوہر کو جگانے کے بجائے تنِ تنہا تلوار سونت کر بالا خانے پر چڑھ گئی۔ وہاں دو نقاب پوش ہاتھوں میں برہنہ تلواریں لیے کھڑے تھے۔ وہ دونوں چاند بی بی پر جھپٹے مگر وہ پھرتی سے پیچھے ہٹی اور پینترا بدل کر تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ ایک تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا آگے بڑھا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا۔ شور سن کر علی عادل شاہ بھی جاگ اٹھا اور دوڑتا ہوا اوپر آیا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو اپنی بہادر ملکہ کی تلوار چوم لی اور بولا:

''چاند بیگم! اگر تمام دنیا بھی میری دشمن ہو جائے تو تیرے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں۔''

ایک مرتبہ وہ پالکی میں سوار میکہ (احمد نگر) سے سسرال (بیجاپور) آ رہی تھی۔ چند مسلح سپاہی بھی ساتھ تھے۔ راستے میں ایک ویران مقام پر ڈاکوؤں کے ایک بڑے جتھے نے اس چھوٹے سے قافلے پر حملہ کر دیا۔ محافظ سپاہیوں نے جی توڑ کر ان کا مقابلہ کیا لیکن سب ایک ایک کر کے مارے گئے اور ملکہ چاند اکیلی رہ گئی۔ وہ گھبرانے یا خوفزدہ ہونے کے بجائے تلوار سونت کر پالکی سے اتری اور ڈاکوؤں کا اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ بہت سے اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے اور باقی بھاگ گئے۔

۹۸۷ھ، ۱۵۸۰ء میں علی عادل شاہ کی وفات پر اس کا نابالغ بھتیجا ابراہیم عادل شاہ اس کا جانشین ہوا اور ملکہ چاند سلطانہ شوہر کی وصیت کے مطابق اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ وہ کئی سال تک یہ فرض نہایت حسن وخوبی سے انجام دیتی رہی لیکن پھر کچھ وزیروں امیروں نے اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ چاند بی بی تنگ آ کر احمد نگر چلی گئی۔ اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد سازشی وزیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ ابراہیم عادل شاہ نے ان کی نااتفاقی کا فائدہ اٹھا کر سب کو ایک

ایک کر کے ختم کر دیا اور چاند بی بی کو واپس بلا بھیجا۔ وہ بیجا نگر آ تو گئی لیکن اب اس کا دل مردہ ہو چکا تھا اور وہ سیاسی جھمیلوں سے الگ رہ کر پُر سکون زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

چاند بی بی کے والد حسین نظام شاہ نے ۹۷۲ھ، ۱۵۶۵ء میں وفات پائی تو مرتضیٰ نظام شاہ اپنی ماں خونزہ ہمایوں کی سرپرستی میں باپ کی جگہ مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ چھ سال تک تو ماں کاروبارِ حکومت چلاتی رہی اس کے بعد وزیروں نے اقتدار اس سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مرتضیٰ نظام شاہ محض نام کا بادشاہ تھا اور دیوانہ کہلاتا تھا۔ ۹۹۶ھ، ۱۵۸۸ء میں اس کی وفات کے بعد میراں حسین، اسمٰعیل اور برہان شاہ (ثانی) یکے بعد دیگرے تختِ حکومت پر بیٹھے۔

مؤخر الذکر نے ۹۹۹ھ، ۱۵۹۰ء سے ۱۰۰۳ھ، ۱۵۹۴ء تک حکومت کی۔ اس کے عہدِ حکومت میں اکبر بادشاہ نے شہزادہ مراد اور خانخاناں کو تسخیرِ دکن کے لیے روانہ کیا۔ برہان شاہ نے ان کو اپنی مملکت کے ایک صوبے برار کی پیشکش کر دی لیکن ابھی یہ معاملہ پوری طرح طے نہیں ہوا تھا کہ برہان شاہ فوت ہو گیا اور ۱۰۰۳ھ، ۱۵۹۴ء میں اس کی جگہ ابراہیم شاہ تخت نشین ہوا وہ جلد ہی باغی امراء کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اب منجھو خان وکیل سلطنت، آہنگ خان اور اخلاص خان تین سر برآوردہ امراء میں تخت نشینی کے لیے کشمکش شروع ہو گئی اور مملکت کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ چاند بی بی کو اس صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بیجاپور سے احمد نگر آ گئی۔ اس اثناء میں شہزادہ مراد اور خانخاناں یلغار کرتے ہوئے احمد نگر کے قریب آ پہنچے۔

چاند بی بی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ہر صورت میں اپنی آبائی حکومت کو بچائے گی۔ اس نے پہلے تو مخالف امراء کو قلعہ سے باہر نکال دیا اور باقی کو حسنِ تدبیر سے اپنے ساتھ ملا لیا۔ پھر اس نے محمد قلی قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ اور ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور سے امداد طلب کی اور قلعہ کے حفاظتی انتظامات کو مستحکم کر کے شہزادہ مراد کو خط لکھا کہ اگر آپ دوست کی حیثیت سے احمد نگر آنا چاہتے ہیں تو بڑی خوشی سے تشریف لائیے آپ ہمیں حد سے زیادہ مہمان نواز پائیں گے لیکن اگر آپ کا ارادہ احمد نگر پر بزورِ شمشیر قبضہ کرنے کا ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ احمد نگر کا بچہ بچہ اپنے وطن کی حرمت پر قربان ہو جائے گا اور اپنے جیتے جی کسی کو اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔

شہزادہ مراد نے اس تنبیہ کی کچھ پروانہ کی اور ۲۳ ربیع الثانی ۱۰۰۴ھ ۱۵۹۵ء کو اپنے لشکر

کے ساتھ قلعہ احمد نگر کی طرف بڑھا۔ چاند بی بی کی فوج نے اس کی ذاتی نگرانی میں مغل فوج پر اپنی توپوں سے ایسی شدید گولہ باری کی کہ حملہ آور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے۔ دوسرے دن مراد نے خانخاناں اور دوسرے سردارانِ فوج سے مشورہ کرنے کے بعد چاروں طرف سے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں مغل فوج نے کئی بار بڑے جوش وخروش سے قلعے پر حملے کیے لیکن ہر بار منہ کی کھائی۔

اُدھر چاند بی بی کی درخواست پر ابراہیم عادل شاہ نے پچیس ہزار سوار اور قطب شاہ نے پانچ چھ ہزار سوار اور کچھ پیادے چاند بی بی کی مدد کے لیے روانہ کیے۔ شہزادہ مراد کو اس لشکر کے روانہ ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ امدادی لشکر کے پہنچنے سے پہلے قلعہ پر ہر صورت قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ چنانچہ قلعہ کے برج تک پانچ سرنگیں کھودی گئیں اور ان میں بارود بھر دی گئی تا کہ اسے آگ لگا کر قلعہ کو اڑا دیا جائے۔ مگر چاند بی بی غافل نہیں بیٹھی تھی بلکہ دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھ رہی تھی اسے ان بارودی سرنگوں کا علم ہوا تو راتوں رات سرنگوں میں پانی بھروانا شروع کر دیا۔ ابھی دو یا تین سرنگیں بیکار ہوئی تھیں کہ شہزادہ مراد نے سرنگوں کو آگ لگانے کا حکم دے دیا۔ اس زور کا دھماکا ہوا کہ کانوں کے پردے پھٹ گئے اور قلعے کی دیوار میں پچاس گز چوڑا شگاف پڑ گیا۔ قلعے میں محصور سپاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے لیکن بہادر چاند بی بی ذرا نہ گھبرائی اور گھوڑے پر سوار ہاتھ میں تلوار علَم کیے سراپردہ سے باہر نکل آئی اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ زیادہ سے زیادہ توپوں کو گھسیٹ کر شگاف میں کھڑی کر دو۔ فوج نے اسی کے مطابق عمل کیا اور پھر مغل فوج پر بے پناہ گولہ باری شروع کر دی۔ حملہ آور فوج نے آگے بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کی اور بار بار قلعے پر خوفناک حملے کیے لیکن چاند بی بی نے اسے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ وہ اس ہمت اور استقلال سے اپنی فوج کو لڑاتی رہی کہ شام تک قلعہ کی خندق حملہ آور سپاہیوں کی لاشوں سے پٹ گئی اور شہزادہ مراد کو مایوس ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔

(کہا جاتا ہے کہ ایک موقع پر چاند بی بی کی فوج کے پاس سیسہ کی گولیاں ختم ہو گئیں، اس نے فوراً تانبے کی گولیاں ڈھالنے کا حکم دیا۔ جب وہ بھی ختم ہو گئیں تو سونے چاندی کی گولیاں تیار کرائیں اور اس مقصد کے لیے شاہی حرم سرا کے طلائی ونقرئی برتن، زیورات اور ہزاروں طلائی اور

نقرئی روپے فوج کے حوالے کر دیئے لیکن شکست قبول نہ کی۔)

رات کو چاند بی بی نے اپنی نگرانی میں گری ہوئی دیوار کو دوبارہ بنوا دیا بلکہ اس کو پہلے سے تین گز بلند کر دیا۔ صبح کو شہزادہ مراد نے دیکھا تو شگاف کی جگہ پہلے سے بھی بلند دیوار اس کے راستے میں حائل تھی۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ اس موقع کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موافق اور مخالف دونوں کے منہ سے چاند خاتون کی اس اولوالعزمی، استقلال اور بہادری پر صدائے تحسین بلند ہوگئی اور اسی وقت سے چاند خاتون کا لقب چاند سلطان ہو گیا۔ اس ناکامیابی سے شہزادہ مراد کا دل چھوٹ گیا۔ امرائے اکبری میں مقابلہ کی قوت نہ رہی۔ ناچار صلح کرنی چاہی۔ اول تو چاند سلطان نے انکار کیا کہ غنیم بے دل ہو چکے ہیں، تھوڑی سی کوشش سے ان کو ہزیمت ہو سکتی ہے لیکن چونکہ لوگ قلعہ بند رہ کر گھبرا گئے تھے اس لیے چاند سلطان نے بھی آخر صلح منظور کر لی اور حسب قرار برار کا صوبہ شہزادہ مراد کے حوالے کر دیا۔'' (خواتین اسلام کی بہادری)

شہزادہ مراد کی واپسی کے بعد چار سال تک احمد نگر کے لوگ امن چین سے زندگی بسر کرتے رہے لیکن پھر امراء میں خود غرضی اور نا اتفاقی نے سر ابھارا۔ اکبر اسی موقع کی تاک میں تھا اس نے ۱۰۰۸ھ، ۱۵۹۹ء میں شہزادہ دانیال کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر احمد نگر کی تسخیر کے لیے بھیج دیا۔

اب کی بار شاہی فوج کا پلہ بھاری تھا کیونکہ احمد نگر کی طاقت کو خانہ جنگیوں نے کمزور کر دیا تھا تاہم چاند سلطانہ اپنے جاں نثاروں کو لے کر مقابلہ کے لیے کمر بستہ ہوگئی۔ اس نازک گھڑی میں چیتہ خان خواجہ سرا اور بعض دوسرے امیروں نے غداری کی۔ انہوں نے فوج کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ملکہ کے خلاف بھڑکا دیا کہ وہ تم سے دغا کر رہی ہے اور قلعہ کو دشمنوں کے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ مشتعل سپاہی ان غدار امیروں کے ساتھ چاند سلطانہ کے کمرے میں گھس گئے اور اس کو قتل کر ڈالا۔ یوں اس بہادر خاتون کی زندگی کا افسوسناک طریقے سے خاتمہ ہوگیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ (نواب صدر یار جنگ) کے نام اپنے ایک خط (مورخہ ۱۰ اراگست ۱۹۴۲ء) میں قلعہ احمد نگر اور چاند بی بی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن[1] چاند بی بی نے اپنے عزم وشجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں......اور جنہیں تاریخ نے پتھر کی سِلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔

بیفشاں جُرعہ بر خاک و حالِ اہلِ شوکت
کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

(تاریخ فرشتہ، مشاہیر نسواں۔ خواتینِ اسلام کی بہادری)

❁❁❁❁

---

[1] چاند بی بی برہان نظام شاہ کی بہن نہیں بلکہ پوتی تھی۔ مولانا کو یہ تسامح شاید اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے یہ خط قلعہ احمد نگر میں اپنی نظر بندی کے دوران میں لکھا تھا اور دکن کی تاریخ ان کے پاس نہیں تھی۔

ملکہ نور جہاں

طالب ہاشمی

اعتماد الدولہ میرزا غیاث بیگ کی بیٹی اور نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ کی چہیتی ملکہ تھی۔ میرزا غیاث بیگ کا تعلق ایران کے ایک معزز خاندان سے تھا اور اس نے بڑی اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس کا والد میرزا محمد شریف پہلے محمد خان تکلو حاکمِ خراسان کا وزیر اور بعد میں شاہ طہماسپ صفوی اوّل (۹۳۰ھ تا ۱۵۲۴ء تا ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء) کی طرف سے حاکم مرو (MERV) مقرر ہوا۔ اس خاندان پر کسی وقت ایسی افتاد آپڑی کہ میرزا غیاث بیگ کو اہل و عیال سمیت بحالِ خستہ تلاش روزگار کیلئے ایران سے نکلنا پڑا۔ دسویں صدی ہجری کے اواخر میں اس نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اثنائے سفر میں قندھار کے نزدیک اس کی اہلیہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا جس کا نام مہر النساء رکھا گیا۔[1]

---

[1] اس سلسلے میں بعض تذکرہ نگاروں نے ایک عجیب کہانی لکھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مہر النساء ایک جنگل میں پیدا ہوئی۔ ماں باپ سفر کی صعوبتوں اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں اس ننھی سی جان کو اپنے ساتھ لے جانا انہیں بہت مشکل نظر آیا اس لئے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر بچی کو ایک درخت کے سائے میں لٹادیا اور خود آگے بڑھ گئے۔ کرنا خدا کا ان کے پیچھے ایک اور قافلہ وہاں پہنچا۔ قافلے کے سردار نے سنسان جنگل میں ایک نومولود بچی کو بے کسی کی حالت میں پڑا دیکھا تو اس کو ترس آگیا اور اس نے اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ جب اگلا پڑاؤ آیا تو اس نے ادھر اُدھر آدمی بھیجے کہ کسی انا کی تلاش کریں جو اس بچی کو دودھ پلا سکے۔ حسن اتفاق سے اسی پڑاؤ پر میرزا غیاث ٹھہرا ہوا تھا۔ سردار کے آدمی اس کے پاس پہنچے تو اس نے بیوی کی خدمات پیش کیں۔ بیوی نے جا کر دیکھا تو وہ اس کی اپنی بچی تھی بے تاب ہو کر سینے سے لگایا۔ سردار کو واقعہ کا علم ہوا تو اس نے بچی کو ماں کے سپرد کر دیا اور ان لوگوں کو ہندوستان پہنچنے میں مدد دی۔

میرزا غیاث بیگ ہندوستان پہنچا تو اس کی اکبر بادشاہ کے دربار میں رسائی ہوگئی اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی قابلیت کی بدولت دیوانِ بیوتات مقرر ہوگیا اور بادشاہ سے اعتماد الدولہ کا خطاب پایا۔ میرزا غیاث بیگ معاملہ فہمی کے علاوہ ایک اچھا خوشنویس، انشاء پرداز اور نغز گوشاعر بھی تھا اور اس کا دست سخاوت بھی بہت کشادہ تھا۔ (مگر جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنی تمام خوبیوں کے باوصف میرزا غیاث بیگ رشوت لئے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ جہانگیر کا اپنا تجربہ تھا یا اس نے سنی سنائی باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا)

میرزا غیاث بیگ نے مہر النساء کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت ذہین و فطین لڑکی تھی۔ اس نے قرآن مجید ختم کرنے کے بعد چند ہی سال میں مختلف علوم میں دسترس حاصل کرلی اور فارسی جو اس کی مادری زبان تھی اس کے شعراء ادب میں بھی ماہرانہ دستگاہ پیدا کرلی۔ اس کے علاوہ وہ امورِ خانہ داری میں بھی طاق ہوگئی اور اپنی والدہ کے ساتھ شاہی محل میں بکثرت آمد و رفت سے ادب، تمیز اور سلیقہ کے اعتبار سے بھی شہزادیوں کے ہم پلہ نظر آنے لگی۔ جب شادی کی عمر کو پہنچی تو والدین نے اسے شاہی دربار سے وابستہ ایک لائق ایرانی نوجوان علی قلی خان سے بیاہ دیا۔ بادشاہ نے علی قلی خان کی خدمات سے خوش ہوکر (یا غیر معمولی بہادری دکھانے پر) اس کو شیر افگن کا خطاب دیا تھا) شیر افگن اور مہر النساء کی ازدواجی زندگی بہت خوشگوار رہی۔ ان کو اللہ نے ایک بیٹی دی جس کا نام انہوں نے لاڈلی بیگم رکھا۔ جہانگیر اپنی ''تزک'' میں لکھتا ہے:۔

> ''میرے والد مجھ سے بے التفاتی ظاہر کرتے تھے اس لئے ان کی یہ بے رُخی دیکھ کر میرے اکثر ہمراہی مجھ سے جدا ہوگئے۔ ان میں علی قلی خان بھی تھا۔ حالانکہ میں نے اس پر بڑی بڑی عنایات کی تھیں۔ اس پر بھی میں نے بادشاہ ہوکر اس کی تقصیرات معاف کردیں اور اس بنگلہ میں جاگیر عطا کی لیکن وہاں اس نے بادشاہی آدمیوں سے فساد شروع کردیا۔ میں نے اپنے دودھ شریک بھائی (کوکا) قطب الدین کے ساتھی ایک کشمیری رئیس زادہ انبہ خان نے جو والیان کشمیر کی اولاد سے تھا اور جو ایک ہزاروی ذات اور تین سو سوار کے منصب سے سرفراز تھا، علی قلی کے ساتھ دست بدست لڑائی کی اس لڑائی میں دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ سے

مارے گئے۔"

شیر افگن کے قتل کے بعد اعتماد الدولہ (میرزا غیاث بیگ) نے اپنی بیوہ بیٹی کو اکبر کی بیوہ اور جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی خدمت گزاری کیلئے اس کے محل میں بھیج دیا۔ وہیں ۱۰۲۰ھ ۱۶۱۱ء کے جشنِ نوروز میں جہانگیر نے اس کو دیکھا اور اس کے حُسنِ خداداد اور عادات و اطوار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اپنی سوتیلی والدہ کی معرفت اس سے شادی کی خواہش ظاہر کیں۔ مہر النساء رضامند ہوگئی اور دو ماہ بعد اس کی جہانگیر سے شادی ہوگئی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ جہانگیر مہر النساء کو اپنی شہزادگی کے زمانے سے چاہتا تھا اور اس نے شیر افگن کو اسی لئے مروایا تھا کہ وہ مہر النساء سے شادی کر سکے۔ لیکن یہ سب من گھڑت اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ کسی مستند تاریخ سے ان کا ثبوت نہیں ملتا۔

حرم شاہی میں داخل ہونے کے بعد مہر النساء کا ستارۂ اقبال روز بلند ہوتا گیا۔ اپنی لیاقت، سلیقہ شعاری اور دانش مندی کی بدولت وہ جہانگیر کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہوگئی۔ بادشاہ نے اسے پہلے نور محل اور پھر نور جہاں کا خطاب دیا۔ یہ خطاب ایسا مشہور اور مقبول ہوا کہ بقول مولانا محمد حسین آزاد مرحوم "حرم سرائے میں ایک سے ایک بڑھ کر رانیاں موجود تھیں لیکن نور جہاں نے سب کے چراغ بے نور کر دیئے۔ صرف خطبہ میں اس کا نام نہیں پڑھا جاتا تھا باقی تمام لوازمِ سلطنت میں اس کا دخل تھا۔" جہانگیر کے حکم سے نور جہاں کے نام کا یہ سکہ بھی جاری ہوا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زد

جہانگیر اسے سفر و حضر میں ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ شکار پر بھی اس کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ۱۰۲۸ھ ۱۶۱۹ء میں وہ فتح پور سیکری کے قریب شکار کھیل رہا تھا کہ نور جہاں نے بندوق کی پہلی ہی گولی سے شیر کو مار ڈالا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور اس کی بہادری کی بہت تعریف کی۔ کہا جاتا ہے کہ نور جہاں نے ایک اور موقع پر چار شیر مارے۔ ۱۰۲۹ھ ۱۶۲۰ء میں جہانگیر نے اپنے بیٹے شہر یار کی منگنی نور جہاں کی بیٹی لاڈلی سے کر دی۔ لاڈلی بیگم شیر افگن کی صلب سے تھی اور شہر یار جہانگیر کی ایک دوسری بیوی (یا کنیز) کے بطن سے تھا۔ جہانگیر یہ رسم ادا کرنے کیلئے خود اعتماد الدولہ (نور جہاں

کے باپ اور لاڈلی بیگم کے نانا) کے گھر گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ تزک جہانگیری میں لکھتا ہے:

"میں نے اس مسرت بخش موقع پر سعادت مند فرزند شہریار کو آٹھ ہزار پیادوں اور چار ہزار سواروں کا منصب عطا کیا اور اسے درازئ عمر اور اقبال مندی کی دعا دی۔" (ص ۶۷۰)

منگنی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جہانگیر نے شہریار اور لاڈلی بیگم کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس کے بعد نور جہاں نے درباری سیاست میں پس پردہ رہ کر بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا مقصد اپنے داماد شہریار کیلئے جہانگیر کی جانشینی کا راستہ ہموار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جہانگیر کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ اس کی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی۔ جہانگیر خوش تھا مگر نور جہاں کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ حدِ اعتدال کے اندر ہے۔

رفتہ رفتہ وہ جہانگیر کے مزاج میں اس قدر دخیل ہوگئی کہ بادشاہ کے اپنے الفاظ میں:

"میں نے سلطنت نور جہاں بیگم کو بخش دی کہ مجھے ایک سیر شراب اور نصف سیر گوشت کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔"[1] (اقبال نامۂ جہانگیری ص ۶۴)

نوبت یہاں تک پہنچنے کے باوجود جہانگیر نے عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس معاملے میں وہ نور جہاں کی بھی رو رعایت کرنے کا روادار نہ تھا۔ اس نے نور جہاں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "بیگم سلطنت بیشک تمہاری ہے۔ خبردار کسی سے بے انصافی نہ کرنا۔"

ایک دو موقعوں پر بعض لوگ نور جہاں کی زیادتی کا شکار ہوئے تو جہانگیر نے اس کا سختی سے محاسبہ کیا اور جب تک اس نے مظلوموں کو کچھ دے دلا کر راضی کر لیا۔ جہانگیر نے اس کو معاف نہ کیا۔

شہزادہ خرم (شاہجہاں) جہانگیر کا سب سے لائق بیٹا تھا۔ وہ نور جہاں کے بھائی میرزا

---

[1] ۱۰۳۰ھ ۱۶۲۱ء میں جہانگیر شدید بیمار ہوگیا۔ اس بیماری میں نور جہاں نے بڑی تندہی سے اس کی تیمارداری کی۔ شوہر کی بحالی صحت کیلئے اس نے جو خدمات انجام دیں اور جو تدابیر اختیار کیں ان سے جہانگیر بہت ہی خوش ہوا اور نور جہاں کو اپنی محسنہ قرار دیا۔ اس نے برملا نور جہاں کی خدمات کا اعتراف کیا اور دل کھول کر اس کی تعریف و توصیف کی۔ اس حسن خدمت کی وجہ سے وہ جہانگیر کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا گئی اور عملاً وہی حکمران بن گئی۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ آئندہ شاہی نوبت کے بعد اس کیلئے بھی نوبت بجا کرے۔ اس سے پہلے نوبت کا بجنا صرف بادشاہ کیلئے مخصوص تھا۔

ابوالحسن آصف جاہ کا داماد تھا۔ نور جہاں نے شہر یار کو آگے بڑھانے اور شہزادہ خرم کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کیلئے ایسی چالیں چلیں کہ جہانگیر اور شہزادہ خرم کی آپس میں ٹھن گئی۔ جہانگیر نے مہابت خان کی مدد سے شہزادہ خرم کی بغاوت کو فرو کیا اور اس خدمت کے صلے میں مہابت خان کو خانِ خاناں سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دواسپہ وسہ اسپہ سواروں کے منصب پر ترقی دی اور اس کے بیٹے خانہ زاد خان کو پانچ ہزاری ذات وسعادت کے منصب پر ترقی دی۔ بعد میں نور جہاں نے اپنی سیاسی حکمتِ عملی کے تحت بادشاہ کو مہابت خاں کے خلاف کر دیا۔ پہلے اسے صوبہ بنگال کا صوبہ دار مقرر کرایا۔ اس کے بعد اس کو حکم ہوا کہ وہ ہاتھی جو بنگال میں اس کے ہاتھ آئے تھے وہ دربار میں بھیج دے۔

اس کے علاوہ شاہی محاصل اور واجبات کا حساب خود دربار میں حاضر ہو کر دے۔ مہابت خاں نے سارے ہاتھی فوراً بھیج دیئے اور خود دربار میں حاضری دینے کیلئے روانہ ہوا لیکن ایک طرف اس کی حاضری میں رکاوٹ پیدا کی گئی اور دوسری طرف اس کے داماد خواجہ برخوردار نقشبندی (ابن خواجہ عمر نقشبندی) کو اس جرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ اس نے بادشاہ کی اجازت کے بغیر ایک سرکردہ شاہی عہدیدار (مہابت خان) کی لڑکی سے شادی کیوں کی؟ صرف گرفتاری پر ہی اکتفانہ کیا گیا بلکہ اس کو بید لگوائے گئے، اور جو کچھ اس کی بیوی کو جہیز میں ملا تھا اسے بحقِ سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اس واقعہ نے مہابت خاں کو مشتعل کر دیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد جہانگیر اور نور جہاں کابل جا رہے تھے مہابت خان نے دریائے جہلم کے کنارے جہانگیر اور نور جہاں دونوں کو حراست میں لے لیا۔ یہ بڑا نازک موقع تھا مگر نور جہاں نے ایسی عقلمندی اور ہوشیاری دکھائی کہ مہابت خان کا زور ٹوٹ گیا اور اس نے راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔

نور جہاں کی سیاسی زندگی کے حالات بڑی تفصیل کے متقاضی ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء میں نور جہاں، جہانگیر کے ساتھ کشمیر گئی۔ وہاں جہانگیر سخت بیمار ہو گیا۔ نور جہاں نے اس کی تیمارداری کی اور خدمت میں دن رات ایک کر دیئے مگر جہانگیر کا وقت آخر آ چکا تھا۔ اس نے ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ (مطابق ۷/ نومبر ۱۶۲۷ء) کو پیر پنجال کے قریب وفات پائی۔ نعش لاہور لائی گئی اور نور جہاں کے "باغ دلکشا" میں دفن کی گئی۔ قبر شاہجہاں کے حکم سے ایک

عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا گیا جس پر دس لاکھ روپے لاگت آئی۔ نور جہاں نے اس کی تعمیر میں ذاتی دلچسپی لی اور جب تک یہ تیار نہ ہو گیا برابر تعمیر کے کام کی نگرانی کرتی رہی۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد تخت نشینی کے سلسلے میں نور جہاں کی اپنے بھائی آصف جاہ کے ساتھ کچھ عرصہ کشمکش رہی۔ وہ اپنے داماد شہریار کو بادشاہ بنانا چاہتی تھی جب کہ آصف جاہ اپنے داماد شہزادہ خرم کو تخت نشین کرنا چاہتا تھا دونوں نے سیاسی داؤ پیچ لڑائے۔ ان میں آصف جاہ غالب آیا اور شہزادہ خرم شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تاج و تخت کا مالک بن گیا۔ شہریار کی آنکھوں میں پہلے سلائی پھرا دی گئی اور پھر چند دن بعد کچھ دوسرے شہزادوں کے ساتھ اسے قتل کرا دیا گیا۔ اب نور جہاں نے سیاست میں حصہ لینا بالکل چھوڑ دیا اور ملکی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگی۔

جہانگیر کے انتقال کے بعد وہ اٹھارہ سال زندہ رہی۔ یہ سارا عرصہ اس نے لاہور میں گزارا۔ شاہجہاں نے اس کا دو لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جہانگیر کی زندگی میں وہ بڑی پرتکلف زندگی گزارتی تھی۔ اس نے زیور، پوشاک، بناؤ سنگار اور دیگر آرائش کی چیزوں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ گلاب کا عطر بھی اس کی ایجاد ہے۔ مگر جہانگیر کی موت کے بعد اس نے بہت سادہ زندگی اختیار کر لی۔ اپنے وظیفے کا بیشتر حصہ علم کی اشاعت، صدقہ و خیرات اور یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش پر صَرف کر دیتی تھی۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس نے پانچ سو سے زیادہ غریب لڑکیوں کی شادیاں اپنی گرہ سے کرائیں اور جہیز وغیرہ کے تمام اخراجات اپنے پاس سے ادا کئے۔ اس نے جہانگیر کی زندگی ہی میں اپنے باپ اعتماد الدولہ (وفات ۱۰۳۱ھ ۱۶۲۲ء) کا مقبرہ آگرہ میں اعلیٰ پیمانہ پر تعمیر کرایا۔

ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب۔ بھارت) میں ایک خوش وضع خوش منظر پختہ اور سنگین سرائے تعمیر کرائی جو نور محل کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی نام سے ایک قصبہ وہاں آباد ہو گیا۔ لاہور میں بھی کچھ عمارات بنوائیں۔ نور جہاں نے بہ اختلافات روایت ۲۹ شوال ۱۰۵۵ھ یا یکم ربیع الثانی ۱۰۵۵ھ مطابق ۲۷ مئی ۱۶۴۵ء کو لاہور میں وفات پائی۔ اس کا مقبرہ شاہدرہ (لاہور) میں مقبرۂ جہانگیر کے قریب واقع ہے۔ لاڈلی بیگم بھی وفات کے بعد وہیں دفن ہوئی۔

نور جہاں کی زندگی کا ایک خاص پہلو شعر و ادب سے اس کی دلچسپی ہے۔ وہ ایک خوش فکر اور نازک خیال شاعرہ تھی اور نہایت علم دوست، بذلہ سنج اور حاضر جواب خاتون تھی۔ تاریخ اور تذکروں میں اس کی معارف پروری، علمی استعداد، سخن فہمی اور سخن سنجی کی بہت تعریف کی گئی ہے۔

صاحب "مراۃ الخیال" نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"در بذلہ سنجی و سخن گوئی و شعر فہمی و حاضر جوابی از نسائے زماں ممتاز بود"

آزاد بلگرامی "ید بیضا" میں کہتے ہیں:

"در وادی شعر بسیار خوش سلیقہ بود"

شاہنواز خان نے "مآثر الامراء" میں لکھا ہے کہ نور جہاں مخفی تخلص کرتی تھی مگر مولانا عبدالباری آسی نے "تذکرۃ الخواتین" میں اس کا تخلص نور بیان کیا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

نور جہاں کی بذلہ سنجی، برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں:۔

ایک دفعہ جہانگیر کئی روز تک نور جہاں سے نہ مل سکا۔ جب وہ ملا تو فرط مسرت سے نور جہاں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ جہانگیر نے اس کیفیت سے متاثر ہو کر یہ مصرعہ پڑھا۔ ع

گوہر ز اشک چشم تو غلطیدہ می رود

نور جہاں نے برجستہ دوسرا مصرعہ کہا: ع

آبے کہ بے تو خوردہ ام از دیدہ رود

ایک مرتبہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہوا اور عید کا چاند دکھائی دیا۔ جہانگیر اور نور جہاں دونوں نے بالا خانہ شاہی سے چاند دیکھا۔ اس وقت جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ع

ہلال عید براوج فلک ہویدا شد

نور جہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ کہا: ع

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

محرم ۱۰۲۸ ہجری میں ایک دُمدار ستارہ نظر آیا۔ نور جہاں نے اسے دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا۔

ستارہ نیست بدیں طول سر بر آوردہ

فلک بشاطریٔ شہ کمر بر آوردہ

ایک مرتبہ جہانگیر کی نظر ایک بوڑھے پر پڑی جس کی کمر بڑھاپے کی وجہ سے جھک گئی تھی۔ جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ع

چراخم پشت می کردند پیرانِ جہاں دیدہ

نور جہاں نے فی البدیہہ دوسرا مصرعہ یہ کہا: ع

بزیرِ خاک می جویند ایام جوانی را !!

ایک مرتبہ جہانگیر نے لباس تبدیل کیا۔ اس کی قبا پر لعلِ بے بہا کا تکملہ تھا۔
نور جہاں کی نظر پڑی تو فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

ترانہ تکملۂ لعل است برقبائے حریر

شدہ است قطرۂ خوں منت گریباں گیر !!

ایک دن جہانگیر نے یہ مصرعہ پڑھا: ع

از برائے سوزِ دل آتش زِ طور آوردہ است

نور جہاں نے فوراً کہا: ع

تاجرِ ما جنسِ درداز راہِ دور آوردہ است

(۴۰۰ باکمال خواتین)

یہ حضرت محل تھی۔ اس نے وہ کام کر دکھایا، جو اس کے بااختیار شوہر سے نو سال کی شاہانہ زندگی میں نہ ہو سکا۔ کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں لیکن مجاہدین آزادی کے لیے حضرت محل نے عمل کا ایک نہایت قابلِ قدر نمونہ تو پیش کر دیا۔ یہ تو بتا دیا کہ عورت کی زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کیا ہوتے ہیں۔ وہ عورت تھی، پردہ دار عورت، رزم و پیکار کے آداب و فنون سیکھنے کا اُسے کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ لیکن خدا نے اس کے پہلو میں ایک غیرت مند دل رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ حریت و حمیت کے تقاضے کیا ہیں؟ آزادی تو ایسی شے ہے کہ تہمت کے طور پر بھی اس سے کسی کا انتساب ہو تو اس پر رشک ہی آنا چاہیے۔ عرفی کیا خوب کہہ گیا ہے:

حسد تہمت آزادی سردم بگداخت!

ایں مرادے است کہ بر تہمت آں ہم حسد است

حضرت محل نے تو واقعی آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ مشہور ہے کہ:

زنے از پردہ بروں آید و کارے بہ کند!

لیکن حضرت محل نے پردے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ کارنامہ انجام دیا، جس کی توفیق مردوں میں سے بھی بہت کم کو ملی۔

......☆......

حضرت محل

(وفات ۱۸۷۹ء)

مولانا غلام رسول مہر

واجد علی شاہ کے حرم میں

نواب حضرت محل کے ابتدائی حالات کی نسبت اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ان کا نام "امراؤ" تھا۔ ۱۳ر رجب ۱۲۶۱ھ (۱۵ر دسمبر ۱۸۴۸ء) کو حضرت علیؓ کے میلاد کی مجلس میں، واجد علی شاہ نے کہ ابھی ولی عہد تھے امراؤ کو دیکھا اور داخل محل کر لیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ:

"امراؤ امن و امان کے ذریعے سے .... پسند خاطر ہو کر میرے گھر پڑ گئی۔ حسبِ معمول "مہک پری" خطاب دے کر تعلیم رقص و سرود میں مشغول کر دی گئی ہے"۔

واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ایک "پری خانہ" قائم کیا تھا جس میں خوبصورت عورتیں داخل کی جاتی تھیں اور وہ رقص و سرود کی تعلیم پاتی تھیں۔ امراؤ بھی پہلے اسی پری خانے میں پہنچی۔

برجیس قدر کی پیدائش

شعبان ۱۲۶۲ھ میں امراؤ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا۔ واجد علی شاہ کا بیان ہے:

"مہک پری کے حاملہ ہونے کا مژدہ میں نے سنا۔ ہزار ہزار سجدۂ شکر قاضی

الحاجات کی درگاہ میں ادا کیے اور مہک پری کو پردے میں بٹھا کر ''افتخار النسا خانم صاحبہ'' خطاب عنایت فرمایا۔

بعد انقضائے ایام مقررہ، فرزندِار جمند لختِ جگر اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ لڑکے کے دادا (امجد علی شاہ) نے بہ صد ہزار خوشی وخرمی گیارہ ضرب توپ سلامی اور مبارکباد کی چھٹروائیں اور لڑکے کو مرزا برجیس قدر بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔''

اس سے واضح ہے کہ ''مہک پری'' امراؤ ہی کا پہلا لقب تھا۔ اسی کو افتخار النسا کا خطاب ملا اور وہی برجیس قدر کی والدہ تھیں۔ مولوی نجم الغنی رام پوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہک پری افتخار النسا کوئی اور خاتون تھی، جس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اور دو چار ہی دن زندہ رہ کر مر گیا۔

برجیس قدر کی تاریخ پیدائش کہیں نظر سے نہیں گزری، چونکہ شعبان ۱۲۷۳ھ میں اس کی گیارھویں سالگرہ منائی گئی، لہٰذا میں نے اس کی تاریخ پیدائش شعبان ۱۲۶۲ھ (جولائی واگست ۱۸۴۶ء) قرار دی۔ امجد علی شاہ اس وقت زندہ تھے۔ وہ صفر ۱۲۶۳ھ (فروری ۱۸۴۷ء) میں فوت ہوئے اور برجیس قدر خطاب انہی کا تجویز کردہ تھا۔ لہٰذا میری قرار دادہ تاریخ عین قرینِ صواب ہے۔ برجیس قدر کا اصل نام رمضان علی تھا۔ واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو بعض دوسرے محلات کے علاوہ افتخار النسا خانم امراؤ، والدۂ برجیس قدر کو بھی ''محل'' کا درجہ عطا کیا اور ''حضرت محل'' کا خطاب تجویز ہوا۔

قدرت کے عجائبات

ظاہر ہے کہ حضرت محل کے ان حالات میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کی آئندہ عظمت وعزت کی کوئی کرن یا کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔ وہ بالکل معمولی ماحول میں پیدا ہوئی۔ وقت کے عام اوضاع واطوار کی رو میں بہتی ہوئی شاہی محل کے اندر پہنچی۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حسن ظاہری سے اُسے حصۂ وافر ملا ہوگا۔ شاہی محل میں داخلے کے لیے اس کے پاس یہی ایک دستاویز تھی۔ پھر اس زمانے کے لکھنؤ، خصوصاً شاہی محل کے احوال وظروف میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو حضرت محل کے خداداد عملی اور اخلاقی محاسن کے لئے مہمیز بن سکتی۔ ان احوال وظروف میں

عشرت آرائیوں اور کامجوئیوں کے سوا کیا رکھا تھا؟ ''ناسزا'' کاموں کے کرنے کا بھی ایک ''سزاوارانہ'' طریقہ ہوتا ہے۔ وہاں کی تو عشرت آرائیاں بھی عام روایتوں کے مطابق ''ناسزا'' انداز میں کی جاتی تھیں۔ نہ احوال روزگار سے آگاہی، نہ حکمرانی کی ذمہ داریوں کا احساس، نہ یہ خیال کہ خدا نے جو بلند ترین منصب عطا کیا ہے، اس کے فرائض وواجبات ٹھیک ادا نہ کیے گئے تو مآل و انجام کیا ہوگا۔ حضرت محل کے قلب وجگر کی حرارت بڑی ہی بے پناہ ہوگی، جو اس برفستان میں پہنچ کر بھی مائل بہ افسردگی نہ ہوئی اور بارہ سال تک برابر ملتہب وشعلہ زن رہی۔ جب سازگار وقت آیا تو حضرت محل نے عورت ذات اور پردہ دار ہونے کے باوجود اس گرمجوشی اور بلند ہمتی سے میدان عمل میں قدم رکھا کہ جوانمردوں کو بھی اس پر رشک آنا چاہئے۔ پھر بڑی بڑی ترغیبات کی باوجود وہ رجعت پر آمادہ نہ ہوئی اور محکومی کی فارغ البال زندگی کے بجائے غربت وبے وطنی کی تنگ حالی خوشی خوشی قبول کرلی۔ یہ قدرت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھا۔ جو لکھنؤ کے شاہی محل کی اس خاتون کے پردے میں حیرت افزائے عالم ہوا۔

جنگ آزادی

حضرت محل نے قصر شاہی مین زندگی کے دس بارہ سال چُپ چاپ گزار دیئے۔ واجد علی شاہ نے تخت نشینی کے بعد خاص محل کے لئے پانچ ہزار، بعض محلات کے لئے تین تین ہزار اور باقی کے لیے دودو ہزار روپے مقرر کردیے تھے۔ حضرت محل آخری گروہ میں شامل تھی۔ گویا اُسے دو ہزار ماہوار ملتے تھے۔ ۲۹ جمادی الاولی ۱۲۷۲ھ (۷رفروری ۱۸۵۶ء) کو واجد علی شاہ معزول ہوئے اور کلکتہ کا سفر اختیار کیا، حضرت محل ان بیگمات میں شامل نہ تھی جنہیں شاہ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ بدستور قیصر باغ میں رہی محلات کے لئے جو وظیفے مقرر ہوئے تھے، ان مین سے حضرت محل کا حصہ اسے مل جاتا۔ علی محمد خاں، عرف ممو خاں اس کا داروغہ اور منتظم امور تھا۔

۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں جنگِ آزادی کا پہلا شعلہ نمودار ہوا۔ پھر پے در پے جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی اور لکھنؤ تک بھی اس کی لپٹ جا پہنچی۔ اس کی ابتدا فوج سے ہوئی تھی، پھر عوام شامل ہوئے۔ حضرت محل بے چاری محل نشین اور پردہ دار، اس کے لیے بہ طور خود کیونکر ممکن تھا کہ باہر

نکل کر سپاہ کی تنظیم کرتی یا کسی جیش کی قیادت سنبھال لیتی؟

نظامت امور کا مسئلہ

چند روز تک فوج کے مختلف دستے اور ان کے ساتھی عوام یا مختلف رؤسا و امراء ہنگامہ آرائی میں مشغول رہے۔ پھر خیال آیا کہ نظم امور کا کوئی بندوبست ہونا چاہئے۔ بعد غور و مشورہ قرار پایا کہ نواب سعادت علی خاں کی اولاد میں سے کسی کو مسندِ حکومت پر بٹھایا جائے، لیکن کوئی موزوں شخص نہ ملا۔ ایک رکن الدولہ نواب محمد حسن خاں تھے جو سب کچھ چھوڑ کر بیلی گارد میں محصور انگریزوں کے پاس جا بیٹھے تھے۔ پھر امجد علی شاہ کے فرزند میرزا رضا علی بہادر ''دارالسطوت'' کا نام تجویز ہوا۔ انہوں نے جواب دیا کہ انگریزوں سے تو نواب شجاع الدولہ بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے، ہم اپنی عافیت کیوں تنگ کریں؟ آخر سوچا گیا کہ واجد علی شاہ کے فرزند اکبر میرزا محمد علی حیدر بہادر ''نوشیرواں قدر'' کو بادشاہ بنا لیا جائے، لیکن وہ معذور و مصروع تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی جگہ واجد علی شاہ میرزا محمد حامد علی خاں بہادر ''کیوں قدر'' کی ولی عہدی کا اعلان کیوں کرتے؟

برجیس قدر کا انتخاب

جب ہر طرف سے ناکامی کا سامنا ہوا تو موخاں اور شیخ احمد حسین نے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ سے کہا کہ میرزا رمضان علی بہادر برجیس قدر کو کیوں نہ مسند نشین کر لیا جائے؟ راجا نے جواب دیا کہ فوج تو برجیس قدر کو بھی منظور کر لے گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ شاہی محل کی تمام بیگمات اس پر رضامندی کی مہر ثبت کر دیں۔ چنانچہ بیگمات کو جمع کیا گیا۔ گفتگو چلی تو کوئی بیگم واضح بات نہ کرتی تھی۔ حضرت محل نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ دیا کہ یہ تمہارا لڑکا ہے، جیسا تم سب مناسب جانو، کرو۔ نواب خورد محل نے کہا کہ ہمیں تو راضی نامے پر مہر کر دینے میں تامل نہیں، لیکن اگر کلکتہ میں انگریز واجد علی شاہ کو اس بنا پر موت کی سزا دے دیں تو کیا ہوگا؟ ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ برجیس قدر نہ ہو۔ جیسا مناسب جانو خود کرو، دوسری بیگمات کو اس میں نہ الجھاؤ۔

غرض یہ مشورہ بیچ میں رہ گیا۔ ادھر موخان نے تجویز سوچ لی کہ ہم فوج کے افسروں کو جمع کرتے ہیں۔ اگر وہ بہ طور خود اتفاق کر لیں تو بیگمات سے راضی نامہ حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ

رہے گی۔

شاید خیال ہو کہ حضرت محل اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے مضطرب تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بیگمات کا اتفاق اصل مقصد کے لیے کام کے بہترین مواقع پیدا کر سکتا تھا، ورنہ اندیشہ تھا کہ قدم قدم پر تفرقہ رونما ہو جائے گا۔ گویا اتفاق اصل کام کے احسن سرانجام کا وسیلہ تھا۔

شرائط اور مسند نشینی

۱۲رذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (۵رجولائی ۱۸۵۷ء) کو اتوار کا دن تھا۔ سارا دن شدت کی بارش ہوتی رہی۔ شام کے چھ بجے راجا جے لال سنگھ فوجی افسروں کے ہمراہ قصر خاقانی میں آئے اور میرزا برجیس قدر کو دیکھا۔ اس وقت میرزا کی عمر دس سال کچھ مہینے کی تھی۔ بعض افسروں نے کہا کہ بچہ بہت چھوٹا ہے، فوجوں کی قیادت کیا کرے گا؟ بعض نے کہا کہ بہت خوب صورت ہے، رزم و پیکار کی سختیاں برداشت نہیں کر سکے گا۔ آخر انہوں نے مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ برجیس قدر کی مسند نشینی منظور کر لی۔

۱۔ شاہ دہلی کے پاس عرضداشت بھیجی جائے، وہ منظور کر لیں تو یہ رئیس رہیں گے، خواہ ان کے لیے بادشاہی تجویز کریں یا وزارت۔
۲۔ فوجیوں کو تنخواہ ڈگنی ملے گی یعنی چھ روپے کی جگہ بارہ روپے۔
۳۔ ہر پلٹن کے افسر فوجی تجویز کریں گے۔
۴۔ نائب و دیوان کے تقرر و برطرفی کا معاملہ بھی فوجیوں کے صواب دید پر موقوف رہے گا۔
۵۔ فوجیوں کی جو تنخواہ انگریزوں کے ذمے رہ گئی ہے، وہ بھی ادا کی جائے گی۔

یہ شرطیں منظور کر لی گئیں۔ شہاب الدین خاں اور سید برکات احمد نے مندیل میرزا برجیس قدر کے سر پر رکھی اور مبارکباد دی۔ فوجی افسروں نے تلوار نذر دکھائی۔ فیض آبادی توپ خانے کے صوبے دار جہاں گیر بخش نے اکیس توپ سلامی کی سر کیں۔ شرف الدولہ کو وزیر اعظم، ممو خاں کو نائب ریاست بنایا گیا اور ناصر الدولہ خطاب دیا۔ حقیقت میں حضرت محل تمام امور کے متعلق خود مشورے کرتیں اور سب احکام ان کی منظوری سے

جاری ہوتے۔ شہر میں منادی کرادی گئی، خلق خدا کی، ملک بادشاہ دہلی کا اور حکم میرزا برجیس قدر بہادر کا۔

دوسرا بیان

مولوی نجم الغنی فرماتے ہیں کہ شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ ہزاروں رئیسوں کے گھر بار ویران ہو چکے تھے، راجا جے لال سنگھ نے ان بے اعتدالیوں کو روکنے کی غرض سے حکومت کا انتظام ضروری سمجھا۔ جب وہ حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور میرزا کی مسند نشینی کی استدعا کی تو حضرت محل بہت مضطرب ہوئیں اور سوچا کہ جس فوج نے آقائے قدیم کے متعلقین کو اذیت پہنچانے میں تامل نہ کیا، وہ خدا جانے ہمارے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ نیز برجیس قدر کی نوعمری کا ذکر کیا۔ ممو خاں اور حسام الدولہ کی رائے بھی یہی تھی۔ جب دیکھا کہ سپاہ فتنے کی طرف مائل ہے تو مناسب یہی سمجھا گیا کہ استدعا قبول کر لی جائے ورنہ جس امر کا اندیشہ ہے، وہ اسی وقت ظہور میں آ جائے گا۔ یعنی فوج ہنگامہ بپا کردے گی اور جبراً برجیس قدر کو حاکم بنالے گی۔

اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محل نے مجبوری کی حالت میں برجیس قدر کا حاکم بننا منظور کیا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ مانتی۔

اگر یہ درست تھا تو انگریزی فوج کے آتے ہی حضرت محل کیوں حوالگی پر آمادہ نہ ہوئی؟ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہو گئے اور حضرت محل نے باہر نکل کر جنگ شروع کی یا نیپال جانا چاہا تو انگریزوں نے بار بار پیغام بھیجے تھے کہ واپس آ جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ باقاعدہ وظیفہ ملے گا۔ ان پیغامات کو کیوں قبول نہ کر لیا؟ میرے نزدیک یہ بیان حالات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔

دہلی دربار سے تعلق

برجیس قدر کی حکومت ۵۔ جولائی ۱۸۵۷ء سے ۱۶۔ مارچ ۱۸۵۸ء تک رہی۔ یعنی آٹھ مہینے اور گیارہ دن۔ اس اثنا میں جو کچھ ہوا اُن میں پہلا قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مرکز دہلی سے رشتہ تعلق استوار کرنے کی کوشش کی گئی اور فوج کے ساتھ بھی یہی عہد ہوا تھا کہ دہلی سے برجیس قدر کے لیے منظوری حاصل کی جائے گی۔ چنانچہ میر احمد کے فرزند عباس میرزا سفارت کے لئے تجویز

ہوئے۔ وہ حضرت محل کی مقربہ خاص میرزائی بیگم کے داماد تھے۔

ایک عرضداشت لکھی گئی اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل تحائف سفیر کے حوالے کیے:

ایک تاج مرصع کیسۂ زریں میں، ایک مرواریدی مالا، ایک جوڑی نورتن، گلے کا ایک زیور، جسے دھکدھکی کہتے ہیں۔ دست بند مرواریدی، ایک سو اکیس اشرفی، ایک ہاتھی جس کا حوضہ نقرئی اور جھول کارچوبی تھی، دو گھوڑے مع ساز نقرہ، دو ہزار روپے سفیر کو خرچ راہ کے لیے دیئے گئے، ساتھیوں میں سوا سو پیادے تھے، پچیس سوار، دو چوبدار تھے، آٹھ ہرکارے، دو شتر سوار، سولہ کہار، چار فراش مع خیمہ وغیرہ۔

سفیر ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ (۱۴ اگست ۱۸۵۷ء) کو براہ خیر آباد روانہ ہوا۔ مراد آباد میں ڈپٹی ولایت حسین خاں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ انگریز جرنیل سے بھی مل لینا چاہئے۔ عباس میرزا نے جواب دیا کہ یہ خیانت مجھ سے نہ ہوگی۔

سفیر پہلے شاہدرہ میں اترا اور شہر میں خبر بھیجی۔ وہاں استقبال کا انتظام ہوا۔ مظفر الدولہ نواب سیف الدین حیدر خاں کے مکان میں قیام کیا، اس لیے کہ ان سے دوستانہ تعلق تھا۔

دربار میں حاضری

دہلی کا نظم و نسق اس وقت ابتر تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ سفیر اس کے توسط سے پیش ہو۔ پہلے نواب حامد علی خاں اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔ سفیر کو یہ منظور نہ تھا لہٰذا خستگی راہ کا عذر پیش کر دیا۔ پھر نواب احمد قلی خاں اور زینت محل کے توسط سے سفیر پیش ہوا۔ مظفر الدولہ بھی ہمراہ تھے۔ بادشاہ نے عرضداشت پر اپنے قلم سے لکھا کہ آفرین ہے برجیس قدر بہادر، تم نے چھوٹے سے سن میں بڑا کام کیا اودھ تمہارا ملک قدیم ہے، آئندہ اور عطا ہوگا۔

سفیر نے تحائف پیش کیے، جن کی تفصیل سے واضح ہے کہ بعض بادشاہ کے لیے تھے اور بعض زینت محل کے لیے۔ دست بند مرصع خود حضرت محل نے زینت محل کے لئے بھیجے تھے۔

یہ وہی زمانہ ہے، جب دہلی پر انگریزوں کی گولہ باری شدت سے جاری تھی۔ سفیر ابھی رخصت نہ ہوا تھا کہ انگریزوں کا حملہ ہوا اور وہ شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ ملکی فوج اور اہل شہر باہر نکلنے

لگے۔اس افراتفری کی حالت میں سفیر دہلی سے نکلا اور بہ ہزار خرابی لکھنؤ پہنچا۔

رزم و پیکار

رزم و پیکار کی تفصیلی کیفیت پیش کرنے کا یہ محل نہیں۔ اس کا اصل مقام جنگ آزادی کی تاریخ ہے۔لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حضرت محل خود پردے سے نکل کر نہ فوجوں کی قیادت کرسکتی تھی اور نہ براہ راست انتظامات اپنے ہاتھ میں لے سکتی تھی۔ اس کا سارا کاروبار مشیروں کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ نازک سے نازک موقعے پر بھی حضرت محل کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا اور ایک موقع پر وہ پردہ داری کے باوجود میدان جنگ میں بھی پہنچی۔

برجیس قدر کی مسند نشینی کے وقت اس کے پاس چوبیس ہزار روپے نقد موجود تھے۔ وہ بے تامل مشیروں کے حوالے کردیے کہ ضروری خرچ چلائیں۔ پھر مختلف امراء اور دوسرے اصحاب سے روپے لیے گئے، لیکن سپاہ میں نظم بالکل ناپید تھا۔کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو سپہ گری میں ماہر ہوتا۔ احمد اللہ شاہ موجود تھے لیکن دربار لکھنؤ کے متوسلین کو کسی اجنبی کی قیادت پسند نہ تھی۔ خود اُن میں سے جو لوگ تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے تھے، وہ باہمی رقابتوں کے چکر میں پھنس کر بے بس ہو گئے تھے۔

تلنگوں کی یہ حالت تھی کہ باتیں بہت بناتے، کام کچھ نہ کرتے۔ جب سنتے کہ انگریز پیچھے ہٹ رہے ہیں تو پیش قدمی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ جب دیکھتے کہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مراجعت و پسپائی میں بھی سبقت کا دامن نہ چھوڑتے۔

بیگمات کی حالت

بیگمات کی حالت حد درجہ عجیب و غریب تھی۔تمام حالات سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں دل سے برجیس قدر کی مسند نشینی پسند نہ تھی، لیکن کھلم کھلا مخالفت بھی نہ کرسکتی تھیں، جب خطرے کی خبر سنتیں تو بعض نکل جانے کے لیے سواریاں منگوا لیتیں، بعض کو غش آ جاتا، بعض حضرت محل اور ممو خاں کو گالیاں اور کوسنے دینے لگتیں۔

ایک موقع پر فوج نے فیصلہ کیا کہ جو انگریز بیلی گارد میں محصور ہیں، ان پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا جائے۔ بیگمات میں سے فخر محل، سلیمان محل، فرخندہ محل، یاسمین محل، محبوب محل، خوز محل، سُلطان جہاں محل وغیرہ نے حضرت محل سے کہا:

''تم سب طرح سے اچھی رہیں۔ تمہارا بیٹا بادشاہ ہوا، مبارک ہو۔ مگر ہم سب بے وارث ہوئی جاتی ہیں۔ کل فوج کا یہ ارادہ سنا ہے، اَب تمہی انصاف کرو، پھر بادشاہ اور محلات وغیرہ جتنے کلکتہ میں ہیں، زندہ بچیں گے یا پھانسی دیے جائیں گے؟ ایسی سلطنت کو چولہے میں ڈالو۔ جناب عالیہ (حضرت محل) نے برہم ہو کر جواب دیا، معلوم ہوا تم سب ہمارا بُرا چاہتی ہو بلکہ اس سلطنت کے ہونے سے جلتی ہو۔ مختصر یہ کہ اس وقت آپس میں ایسی جلی کٹی ہوئی کہ جناب عالیہ برجیس قدر کو لے کر اندر کے دالان میں چلی گئیں''۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے احوال وظروف میں کسی زبردست مجاہدانہ اقدام کے لیے کیا گنجائش تھی۔ جو لوگ مخلص تھے، وہ بہت پریشان ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا جھگڑا ان کے کانوں تک پہنچا تو حضرت محل کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے سب بیگمات انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس میں ہماری تمہاری خرابی ہے۔ پھر کہیں ٹھکانا نہ ملے گا۔

بہترین فرصت

جنگ آزادی میں کسی بھی مقام کو اصلاح احوال، نظم امور، ترتیب عساکر اور استحکام وضعیت کے ایسے مواقع نہ مل سکے، جیسے لکھنؤ کو ملے۔ سرسری نقشہ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ آغاز میں انگریزی فوج بیلی گارد (ریزیڈنسی) کے اندر محصور ہو گئی تھی، اس وقت سرہنری لارنس تمام معاملات کا مالک ومختار تھا۔ وہ ۲/جولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر زخمی ہوا اور مر گیا۔ اس کے بعد محصورین سے بیلی گارد خالی کرالینا قطعاً مشکل نہ تھا، کیونکہ وہاں کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

۲۔ جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کان پور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی

شروع کی، لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳۔ ۴/اگست اور ۱۲/اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی شروع کی، لیکن دونوں مرتبہ مراجعت ہی پر مجبور ہوا۔

۴۔ ہیوے لاک کی جگہ آؤٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے، لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵۔ نومبر میں سر کالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہوا لیکن کان پور کے حالات اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس چلا گیا۔ ۶/فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہوا۔

گویا اہلِ لکھنؤ کو کم و بیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے سے اثر و رسوخ اور عزم و ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لئے موجود ہوتا۔

فوج کی دل دہی

مختلف لڑائیوں میں سب سے زیادہ بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اُسے بہت رنج ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا، توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمہیں اور دوں گی۔ ۲۳/ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہیوے لاک اور آؤٹرم کی پیش قدمی کے وقت تلنگے پیچھے ہٹے تو راجا مان سنگھ نے آٹھ نو ہزار سپاہی لے کر مقابلہ کیا۔ دست بدست لڑائی میں گورے بھی بہت مارے گئے اور راجا کی سپاہ میں سے بھی دو ہزار کھیت رہے۔ حضرت محل نے اس جانفشانی و جاں نثاری پر راجا کو "خطاب فرزندی" عطا کیا۔ خلعت، دوشالہ، رومال کے علاوہ ملبوس خاص میں سے دوپٹا تھا، جو سب سے بڑا اعزاز تھا۔ نیز اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: "بعد فتح روپیہ اور جاگیر دے کر خوش کروں گی"۔ فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ایک مرتبہ بیگم عالم باغ کے سامنے نمودار ہوئی جہاں انگریز بیٹھے تھے اور ان پر پے در پے یورشیں ہو رہی تھیں۔ افسوس، انتہائی

کوشش کے باوجود لڑائی کا رنگ بگڑتا گیا اور حالات ناساز گار ہوتے چلے گئے۔

انگریزوں کے پیغامات

آؤٹرم نے اس دوران بار بار حضرت محل کے پاس پیغامات بھیجے کہ لڑائی چھوڑ دیجئے:

۱۔ پہلے پیغام کا مفاد یہ تھا کہ ممالک محروسہ سرکار سے موافق عہد شجاع الدولہ ملے گا۔

۲۔ پھر کہلوا بھیجا کہ لڑائی چھوڑ دو، ملک حوالے کر دیا جائے گا۔

۳۔ آخری مرتبہ کہا کہ پچیس ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔

معلوم نہیں حضرت محل تک یہ پیغام پہنچے یا نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخری پیغام پر نواب ممو خاں اور ارکان دولت نے کہلوا بھیجا، ہمیں کیونکر یقین ہو کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ درست ہے اور فریب نہیں؟ معلوم ہے لڑائی میں دھوکا اور فریب جائز سمجھا جاتا ہے۔ اگر اپنا وعدہ انجیل پر لکھ کر مہر کر دو، نیز کسی مسلمان بادشاہ کی گواہی اس پر کرا دو تو ہم سمجھیں گے کہ قابلِ توجہ ہے۔ کسی نے کہا کہ مسلمان بادشاہ یہاں کہاں ہے، جس کی گواہی کرائی جا سکے؟ ممو خاں نے جواب دیا کہ رانا جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال، تو انگریزوں کے ساتھ فوج لیے لکھنؤ میں بیٹھا ہے۔ ہم اسی کی گواہی کو کافی سمجھ لیں گے۔ آخر یہ تجویز بھی بیچ ہی میں رہ گئی۔

لکھنؤ میں آخری اوقات

انگریزی توپوں کی گولہ باری بڑے زور سے جاری تھی لیکن حضرت محل نے مقابلہ جاری رکھا۔ ایک موقع پر اُن کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

> ''اگر گورے اس وقت سیدھے مکان فرحت افزا میں قریب چولکھی کے چلے آتے تو کیا عجب ہے کہ اس وقت جناب عالیہ، برجیس قدر مع صاحبات محل سب کو گرفتار کر لیتے''۔

خان علی خان نے زبردست مقابلہ کیا۔ گورے قیصر باغ میں داخل ہو چکے تھے۔ چمن پر نہر خون جاری تھی۔ ہر طرف لاشوں کا انبار تھا۔ گورے سمت کر سنگین بارہ دری میں ہو رہے تھے۔ پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آ کر باڑھ ماری۔ سیکڑوں گر پڑے۔ آخر سب بھاگے۔ خان بھی

زخمی ہوئے۔

قیصر باغ سے روانگی

آخر حضرت محل کو قیصر باغ چھوڑنا پڑا۔ اور کس حالت؟ ۱۴ / مارچ کو وہ دوسری بیگمات اور شاگرد پیشہ عورتوں کے ساتھ ملازمین باغ کے کوٹھوں پر سے ہوتی ہوئی گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے باہر نکلی۔

حلقہ عورات صف بستہ ان کے پیچھے، برجیس قدر ایک سید کی گود میں کندھے چمٹے ہوئی، اوپر غالیچہ اور چاندنی رفع احتمال کو ڈالے ہوئے۔ جس نے راہ میں قافلہ ناموس شاہی کو دیکھا بے اختیار پیٹنے اور رونے لگا...... بہر حال گلیوں میں گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی، ہر قدم پر الجھتی ہوئی ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کے پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ جواہر علی خاں نے اپنی پینس کہار آگے سے وہاں بھیج دیئے تھے۔ قریب زوال شمسی جناب عالیہ مع برجیس قدر اسی پینس میں سوار ہوئیں۔ باقی اور صاحبات محل وہاں سے متفرق ہو گئے۔

غربت کی پہلی منزل

یحییٰ گنج نخاس اور چوک ہو کر نعل دروازے میں غلام رضا خاں کے گھر اُتریں۔ اس نے مصلحت یہی سمجھی خود بھی خطرے سے محفوظ رہے اور حضرت محل کو بھی محفوظ رکھے۔ چنانچہ عرض کیا کہ گورے میرے مکان سے بہت قریب ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی خلاف امر پیش آئے تو میری روسیاہی کا باعث ہو۔ یہ سن کر حضرت محل وہاں سے نواب شرف الدولہ کے گھر گئی۔ وہاں وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید نواب اپنا رسوخ بڑھانے کے لیے گرفتار کرا دیے۔ یہ خیال آتے ہی محل سرائے حسین آباد میں پہنچی۔ اسی طرح دو راتیں مختلف مکانوں میں گزار دیں۔

لکھنؤ سے رخصت

غرض بتاریخ ۲۹ / رجب ۱۲۷۴ھ (۱۹ / مارچ ۱۸۵۸ء) شام کے وقت برجیس قدر کو ساتھ لے کر پینس میں سوار ہوئی۔ کچھ جواہرات لے لیے تھے کہ راستے میں ضرورت کے وقت کام

دیں۔ موسیٰ باغ کے ناکے سے سواری نکلی۔ سریندر ناتھ سین کا بیان ہے کہ جو فوج ۱۹ر مارچ تک موسیٰ باغ میں گرم پیکار رہی، اس میں زبردست جوش حمیت غالباً بیگم ہی نے پیدا کیا تھا۔

لکھنؤ میں ایسے بے فکر لوگ بھی موجود تھے جنہیں احوال کی حد درجہ غم افزائی سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو کچھ پیش آتا تھا، موقع محل کے مطابق تاریخیں کہتے رہے تھے۔ چنانچہ قومی قوت کی پسپائی کی تاریخ بھی، کسی نے کہہ دی جو صرف اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ یہ اصل واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے۔

مرزا رمضاں علی ناکام شد جانب کوہ چوں اسپک تاز
تاریخ روانگی بجستم "نیپال شتافت" آمد آواز

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسافت کیوں کر طے ہوئی۔ رات بھر کے سفر کے بعد صبح بھراؤں پہنچی۔ انگریزی دباؤ کے ماتحت لکھنؤ چھوڑ دینے کے بعد ان لوگوں سے اعانت کی کیا امید ہو سکتی تھی جو مرغ بادنما کی طرح صرف ہوا کے رُخ پر پھر جانے کے عادی تھے۔ بھراؤں کا زمیندار راجا مردان سنگھ بھی غالباً ایسا ہی شخص تھا۔ اس نے اچھا برتاؤ نہ کیا، چوپال میں ٹھہرایا جو عام مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ تھی۔ کھانا طلب کیا گیا تو کہا پکنے پر پہنچا دیا جائے گا۔ آخر میں کہلا بھیجا کہ تمہارا ساتھ کیوں کر دیں۔ ہر طرف مینڈک کی طرح چھپتی پھروگی، پیچھے پیچھے انگریز سانپ کی طرح لہرائیں گے۔

ایسی مصیبتیں ہر اُس شخص کو پیش آتی ہیں، جو راہ عزیمت میں قدم رکھے۔ مشکل کے وقت اپنے بیگانے بن جاتے ہیں جن کی نگاہیں پہلے گوشہ چشم التفات پر جمی رہتی تھیں، وہ طوطا چشمی اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت محل نے اس سلوک کو صبر سے برداشت کیا۔ پھر محمود آباد اور بسواں باڑی ہوتی ہوئی خیر آباد پہنچی۔ ہر پرشاد ناظم قسمت خیر آباد اور مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد، ناظم بسواں باڑی نے تین کوس باہر نکل کر استقبال کیا۔ بڑی دھوم دھام اور نقارہ و نشان کے ساتھ سواری کو شہر میں لے گئے اور مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اتارا۔ راستے میں دو ہزار روپے حضرت محل پر سے نچھاور کیے۔ سواری شہر میں داخل ہوئی تو سلامی کی توپیں سر کی گئیں۔

اس طرف جانے کی غرض یہ تھی کہ بریلی پہنچیں جہاں انگریزوں کے خلاف محاذ قائم تھا۔ شاہ جہان پور میں مولانا احمد اللہ شاہ کے لیے امداد کا انتظام کیا۔ جب اِدھر سے بھی ناسازگار خبریں

ملیں تو بیگم نے نیپال کا رخ کرلیا اور تلسی پور ہوتی ہوئی نیپال کے مقام نیا کوٹ میں چلی گئیں۔

غربت کی زندگی

نیا کوٹ میں قیام کی اجازت رانا جنگ بہادر نے پہلے دے دی تھی اور انگریزوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ بیگم کو حوالے نہ کروں گا۔ کچھ معلوم نہیں کہ گزارا کیوں کر ہوتا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ رانا جنگ بہادر نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نیپال سے جانا صرف آپ کی مرضی پر موقوف ہے، ہم اس میں کبھی دخل نہ دیں گے۔

انگریزوں نے ایک مرتبہ اپنے ایک ہم قوم کو برجیس قدر کی تصویر اُتارنے کے لیے نیپال بھیجا تھا۔ غالباً اس کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اندیشہ تھا کہیں کوئی شخص جعلی طور پر برجیس قدر بن کر ہنگامہ بپا نہ کردے یا ممکن ہے واجد علی شاہ نے اپنے جلاوطن بیٹے کی تصویر منگوائی ہو۔ بہر حال مصور نے تصویر اتارنے کے علاوہ بیگم کو یہ پیغام بھی دیا کہ فیض آباد یا لکھنؤ میں جو مقام پسند ہو وہاں قیام فرمارہیں مشاہرہ فراخور حال ملے گا اور تعظیم وتکریم میں فرق نہ آئے گا۔ البتہ زیادہ ملازم رکھنے کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت محل نے جواب دیا:

"جب کسی کو نوکر نہ رکھ سکیں گے تو وہ روپیہ کس مصرف میں آئے گا؟ مجھے یہاں رہنے میں کیا قباحت ہے؟ آئندہ خدا کو اختیار ہے"۔

لکھنؤ سے جو لوگ ساتھ گئے تھے، وہ آہستہ آہستہ واپس آتے گئے۔ بعض گرفتار ہو کر آئے۔ مرزائی بیگم برابر حضرت محل کے دامن سے وابستہ رہی اور نیا کوٹ ہی میں اس نے وفات پائی۔ خود حضرت محل کی وفات ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ گویا اکیس سال جلاوطنی میں گزارے۔

سبن نے لکھا ہے کہ حضرت محل کے لیے واجد علی شاہ سے الگ موزوں وظیفہ تجویز ہوا تھا اور کہا گیا تھا کہ بیگم کی حیثیت کے مطابق اعزاز قائم رہے گا، مگر وہ واپسی پر راضی نہ ہوئی۔ برجیس قدر غالباً آخری عمر میں کلکتہ آ گیا تھا۔ وہیں ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسے زہر دیا گیا۔

مولانا شرر کا بیان

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے:

''لوگ حضرت محل کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھی، مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتی۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا''۔

یہی مصیبت سلطانہ رضیہ کو بھی پیش آئی تھی۔ اس نے پردہ چھوڑا تو مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حضرت محل پردے سے نہ نکل سکی اور اصل کام معرض اختلال میں پڑ گیا۔

ضروری گذارش

مولانا شرر نے مشیروں اور سپاہیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بحث کا موقع نہیں۔ تاہم یہ کہہ دینا چاہئے کہ کہیں سپاہی اچھے تھے اور ان سے کام لینے والے اچھے نہ تھے، کہیں کارفرما اچھے تھے اور سپاہی ان کے برابر نہ پہنچ سکے۔ یہ مصیبت اس لیے پیش آئی کہ جنگ آزادی کی آگ اچانک بھڑک اٹھی۔ نہ سپاہ کو اصلح سالار چننے کا موقع مل سکا اور نہ اعلیٰ درجے کے کارفرماؤں کو سپاہ کی تربیت کے لیے فرصت میسر آئی۔ اس جنگ میں ناکامی کا اصلی اور بنیادی سبب یہی تھا۔ حضرت محل کے لیے اس سلسلے میں دوہری مشکلات تھیں۔ رفیقوں کی بے صلاحیتی کے علاوہ وہ مجبور تھی کہ اُنہی پر بھروسا کرے۔ اس لئے کہ خود باہر نکل کر صحیح کارکنوں کا انتخاب نہیں کر سکتی تھی۔

مولانا فضل حق کے تاثرات

مولانا فضل حق خیر آبادی نے بھی ''الثورۃ الہندیہ'' میں حضرت محل کے متعلق اپنے مشاہدات اور تاثرات درج کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

''جو لشکری پہلے سے لکھنؤ میں موجود تھے اور جو دہلی سے بھاگ کر آئے تھے، بیگم نے اُن سب کو اپنی پناہ میں لے لیا اور اُنہیں قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے نوازا''۔

۲۔ قومی مقاتلین کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ایسی بُری طرح بھاگے کہ سرحدوں پر

بھی نہ ٹھہر سکے۔ ملکہ اور اس کے لڑکے کو تنہا محل میں چھوڑ گئے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان اور اعیان سلطنت نے دغا کی۔

۳۔ نصاریٰ اور ان کی گوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا، جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو مصاحب عورتوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلے میں پیدل تیزی سے پہنچ گئی۔

۴۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس لانے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر دست گیری کو تیار نہ ہوا۔ آخر بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ہمراہ لیے چٹیل میدان کی طرف چل کھڑی ہوئی۔

۵۔ پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آ گیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور ندیوں سے گزری جن سے بغیر کشتی عبور دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اقامت گزریں ہوگئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار پیادے بٹھا دیے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کر لیں۔

۶۔ اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لیے شہروں، قصبوں اور دیہات میں عامل بھیج دیے۔ لشکروں کو آراستہ کر کے اپنے دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر بھیج دیا، اس لیے کہ دارالسلطنت پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا''۔

گویا حضرت محل نے آخری وقت تک انگریزوں کے مقابلے میں بلکہ ان کی سرکوبی میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وکٹوریہ کے منشور کا جواب

کمپنی کا راج ختم ہو گیا اور ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کی نگرانی میں لے لیا گیا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک منشور شائع کیا، جس میں مجرمین و معاونین قتل کے سوا سب

کے لیے عفو کا اعلان کیا گیا تھا نیز والیان ریاست کے حقوق واحترام کی حفاظت کا وعدہ درج تھا۔اس میں یہ بھی مرقوم تھا کہ سب کو قانون کی پناہ حاصل ہوگی۔

بعض طبقوں نے اس اعلان کی بڑی تعریف کی۔بیگم حضرت محل نے اپنے فرزند برجیس قدر کی جانب سے اس کا جواب شائع کیا،جس کے بعض مطالب کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱۔ انگریزوں کے وعدۂ عفو پر ہرگز اعتبار نہ کرو،ان کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کسی کا جرم معاف نہیں کرتے۔

۲۔ ملک کو کمپنی کی نگرانی سے نکال کر ملکہ کی نگرانی میں لے لینے سے اصل صورت حال میں کیا تبدیلی ہوئی جبکہ کمپنی کے قوانین اس کا بندوبست،اس کے ملازم اور اس کا عدالتی نظام بدستور باقی ہے۔

۳۔ ملکہ کہتی ہے کہ کمپنی کے تمام معاہدوں کو پورا کیا جائے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ لیا جا چکا ہے وہ بدستور انگریزوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔اسی سلسلے میں حضرت محل نے اودھ کے نقصانات،ضیاع سلطنت،انگریزوں کے تصرفات وغیرہ کی تفصیل بیان کی۔

۴۔ انگریزوں سے عفو جرم کی کوئی مثال کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔

۵۔ کہا گیا ہے کہ قیام امن کے بعد ہندوستانیوں کو رفاہ عامہ کے کاموں میں لگایا جائے گا۔سڑکیں بنیں گی،نہریں کھدیں گی۔گویا ہندوستانی صرف اسی کام کے لائق رہ گئے ہیں۔

ٹائمز کے نامہ نگار کا بیان

لندن ٹائمز کے نامہ نگار ڈبلیو،ایچ،رسل نے کہا کہ حضرت محل کو لکھنؤ کے دفاع میں روح ورواں کی حیثیت حاصل تھی۔اس نے پورے اودھ کو اپنے فرزند کی حمایت پر آمادہ کر لیا تھا۔تمام امراؤ ورؤسا اس کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھا چکے تھے۔ایسی سرگرمی عمل اور جوش وہمت کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔

بیگم نے انگریزوں کے خلاف لامتناہی جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور انگریزوں نے فرمانروایانِ اودھ سے کیا سلوک کیا تھا؟ کیا اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ یہ بادشاہ نہایت نازک مواقع پر انگریزوں کو مالی امداد اور قرض دیتے رہے؟ مگر اس احسان کو یک قلم پس پشت ڈال دیا گیا، لہٰذا بیگم کا غصہ بے جا نہیں سمجھا جا سکتا۔

بے شک بیگم جنگ میں ہار گئی۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اپنے شوہر دسر تاج کے مقابلے میں وہ مردانگی کے بدر جہا بہتر اوصاف سے مزین تھی۔

بصیرت وموعظمت

یہ حضرت محل تھی۔ اس نے وہ کام کر دکھایا، جو اس کے با اختیار شوہر سے نو سال کی شاہانہ زندگی میں نہ ہو سکا۔ کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں لیکن مجاہدین آزادی کے لیے حضرت محل نے عمل کا ایک نہایت قابلِ قدر نمونہ تو پیش کر دیا۔ یہ تو بتا دیا کہ عورت کی زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کیا ہوتے ہیں۔ وہ عورت تھی، پردہ دار عورت، رزم و پیکار کے آداب و فنون سیکھنے کا اُسے کوئی موقع نہیں مل سکا تھا۔ لیکن خدا نے اس کے پہلو میں ایک غیرت مند دل رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ حریت و حمیت کے تقاضے کیا ہیں؟ آزادی تو ایسی شے ہے کہ تہمت کے طور پر بھی اس سے کسی کا انتساب ہو تو اس پر رشک ہی آنا چاہیے۔ عرفی کیا خوب کہہ گیا ہے:

حسد تہمت آزادی سردم بگداخت!

ایں مرادے است کہ بر تہمت آں ہم حسد است

حضرت محل نے تو واقعی آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ مشہور ہے کہ:

زنے از پردہ بروں آید و کارے بہ کند!

لیکن حضرت محل نے پردے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ کارنامہ انجام دیا، جس کی توفیق مردوں میں سے بھی بہت کم کو ملی۔

❁❁❁❁

بیگم حضرت محل کا منشور

(من جانب برجیس قدر) بہ جواب منشور وکٹوریا

آج کل بعض ضعیف القلب اور سقیم العقل آدمی کہہ رہے ہیں کہ انگریزوں نے باشندگانِ ہند کے تمام قصور اور تمام جرم معاف کر دیے ہیں۔ یہ قول بڑا ہی حیرت افزا ہے۔ انگریزوں کا مسلمہ شیوہ یہی ہے کہ وہ کوئی قصور معاف نہیں کرتے، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا یہاں تک کہ اگر کوئی جرم ناواقفی اور غفلت سے بھی سرزد ہو جائے تو اسے فراموش نہیں کرتے۔

۱۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کا شائع کردہ جو منشور ہمارے سامنے آیا ہے، وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ بعض ضعیف العقل لوگ اس کے حقیقی مقصد کو سمجھے بغیر اس کی ستائش کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہم جو حکومت پائندہ کے مالک اور باشندگانِ اودھ کے سرپرست ہیں، یہ منشور شائع کرتے ہیں تاکہ زیر غور منشور کے اہم نکات کا حقیقی مقصد آشکار ہو جائے اور ہماری رعایا خبردار رہے۔

۱۔ منشور میں مرقوم ہے کہ ہندوستان پہلے کمپنی کی تحویل میں تھا، اب اس کا انتظام ملکہ نے سنبھال لیا ہے۔ اور آئندہ ملکہ کے قوانین کو ماننا چاہیے۔ ہماری مذہب دوست رعایا کو اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ کمپنی کے قوانین، اس کا بندوبست اس کے انگریز ملازم، اس کا گورنر جنرل اور اس کا عدالتی نظام، غرض ہر شے اپنے حال پر قائم ہے بھلا کون سی چیز نئی ہے، جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہو سکتا ہے یا جس پر وہ اعتماد کر سکتے ہیں؟

۲۔ منشور میں مرقوم ہے کہ کمپنی نے جو معاہدے اور میثاق کیے تھے، ملکہ ان سب کو منظور کرتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس فریب کی تہہ تک پہنچیں۔ کمپنی نے پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ اگر مذکورہ بالا وعدے کو قبول کرلیا جائے تو اس میں کون سی نئی بات ہوئی؟ کمپنی نے بھرت پور کے رئیس سے فرزند کا سا سلوک کرنے کا عہد کیا، پھر اس کی ریاست پر قبضہ کرلیا۔ رئیس لاہور کو کمپنی لندن لے گئی۔ پھر واپسی اس کے نصیب میں نہ ہوئی۔ نواب شمس الدین خاں کو ایک طرف پھانسی پر لٹکایا گیا، دوسری طرف وہ اس کے سامنے ٹوپیاں اتار اتار کر سلام کر رہے تھے۔ پیشوا کو کمپنی نے پونا ستارہ سے نکالا اور اسے بٹھور میں زندگی بھر کے لیے قید کر کے بٹھا دیا۔ میر سلطان کے ساتھ ان کی عہد شکنی سب پر آشکارا ہے۔ بنارس کے راجا کو انہوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔ رئیس گوالبار کے ملک کا انتظام بہتر بنانے کے پردے میں انہوں نے انگریزی طور طریقے جاری کر دیے۔ بہار، اڑیسہ اور بنگال کے رؤسا کا نام ونشان تک باقی نہیں چھوڑا۔ رئیس فرخ آباد کو ماہانہ وظیفہ دے کر اس کا ملک قبضے میں لے لیا۔ شاہ جہان پور بریلی، اعظم گڑھ، جون پور، گورکھ پور، اٹاوہ، الہ آباد، فتح پور وغیرہ ہمارے مقبوضات جو ادائے تنخواہ کے بہانے ہم سے لے لیے گئے اور اودھ کے ساتھ معاہدے کی ساتویں دفعہ میں انہوں نے لکھا کہ اور کوئی علاقہ نہ لیا جائے گا۔ اگر کمپنی کے ان تمام انتظامات کو قبول کرلیا گیا ہے تو سابقہ صورت حال اور موجودہ صورت حال میں کیا فرق ہوا؟

یہ پرانے واقعات ہیں، لیکن ماضی قریب میں انہوں نے تمام قسموں اور عہد ناموں کے برعکس بلاوجہ بدنظمی اور عوام کی بے چینی کا بہانہ پیش کر کے ہمارا ملک لے لیا اور ہماری کروڑوں کی جائیداد پر قبضہ جما لیا، حالانکہ وہ ہمارے کروڑوں روپے کے قرض دار تھے۔ اگر ہمارے عوام ہمارے سابق بادشاہ واجد علی شاہ پر مطمئن نہ تھے، ہماری حکومت پر کیوں مطمئن ہو گئے؟ کسی حکمران کو ایسی وفاداری اور اس پیمانے پر جان و مال کی قربانی پر آمادگی کا تجربہ نہیں ہوا، جیسا ہمیں ہوا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیا جاتا؟

منشور میں مزید بتایا گیا ہے کہ اب مزید توسیع مقبوضات مطلوب نہیں، باایں ہمہ وہ الحاق سے باز نہیں رہے۔ اگر ملکہ نے نظامِ حکومت سنبھال لیا ہے تو وہ ہمارا ملک ہمیں واپس کیوں نہیں دیتی۔ حالانکہ ہمارے عوام کی خواہش یہی ہے؟ سب پر واضح ہے کہ کسی بادشاہ یا ملکہ نے پوری فوج اور پوری رعایا کو بغاوت کی سزا کبھی نہیں دی سب کو معاف کر دیا جاتا تھا۔ عقل مند لوگ کبھی اس امر کو بجا قرار نہیں دے سکتے کہ پوری فوج اور رعایا کو سزا دی جائے۔ جب تک سزا کا لفظ باقی ہے، بدامنی ختم نہ ہوگی۔ مشہور مثل ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہزار کروڑوں پر حملہ کریں اور خود بچ نکلیں۔

۳۔ منشور میں بتایا گیا ہے کہ مسیحی مذہب سچا ہے۔ مگر کسی دوسرے مذہب کو دبایا نہ جائے گا اور سب کے تعلق میں قانون کی پابندی کی جائے گی۔ عدل کو کسی مذہب کے سچا یا جھوٹا ہونے سے کیا تعلق ہے؟ جو مذہب خدا کو ایک مانتا ہے اور اس کے سوا کسی کا قائل نہیں، وہ یقیناً سچا ہے۔ جس مذہب میں تین خدا ہوں، اسے مسلمان یا ہندو ہی نہیں یہودی، آفتاب پرست یا آتش پرست بھی سچا نہیں مان سکتے۔ سؤر کا گوشت کھانا، شراب پینا، چربی والے کارتوس دانتوں سے کٹوانا، سؤر کی چربی آٹے اور مٹھائی میں ملانا ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو سڑکیں بنانے کے بہانے ڈھانا، گرجے تعمیر کرنا، پادریوں کا گلیوں اور بازاروں میں مسیحی مذہب کی تبلیغ کے وعظ کہنا، انگریزی سکول جاری کرنا، انگریزی کے سیکھنے کے لئے ماہوار وظیفے دینا، حالانکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں اب تک بے توجہی کی نذر ہو رہی ہیں ان سب باتوں کے باوجود لوگ کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ مذہب میں مداخلت نہ کی جائے گی؟ بغاوت مذہب کی بنا پر شروع ہوئی اور اس میں لاکھوں مارے گئے۔ ہماری رعایا کو دھوکے میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ علاقہ شمال و غرب میں ہزاروں مذہب سے محروم ہو چکے ہیں اور ہزاروں ترک مذہب کے بجائے پھانسی پا چکے ہیں۔

۴۔ منشور میں مرقوم ہے کہ جن لوگوں نے باغیوں کو پناہ دی یا جو باغیوں کے لیڈر تھے یا جنہوں نے بغاوت پھیلائی، ان کی جانیں محفوظ رہیں گی اور سزا غور و فکر کے بعد دی

جائے گی، البتہ قاتلوں اور قتل کے معاونوں پر ہرگز رحم نہ ہوگا۔ باقی سب معاف کر دیے
جائیں گے۔ احمق بھی جان سکتا ہے کہ اس منشور کے مطابق کوئی سلامت نہ رہے گا۔ خواہ
وہ گنہگار ہو یا بے گناہ۔ سب کچھ لکھا دیا گیا پھر بھی کچھ نہیں لکھا گیا...... کم از کم یہ تو واضح کر
دیا گیا کہ جو ملوث ہوا، وہ بچ نہ سکے گا۔ اور کسی گاؤں یا جاگیر میں فوج ٹھہری ہوگی وہاں کا
کوئی آدمی محفوظ نہ سمجھا جائے گا۔

اس منشور کے پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے لوگوں کے بارے میں سخت تشویش پیدا ہوگئی
ہے۔ یہ منشور دشمنی سے لبریز ہے۔ ہم اب واضح حکم شائع کرتے ہیں، اس پر سب کو اعتماد کرنا
چاہئے۔ جو لوگ غلطی سے اپنے آپ کو انگریزوں کے روبرو گاؤں کے مقدم قرار دے چکے ہیں، وہ
یکم جنوری (۱۸۵۹ء) تک ہماری لشکر گاہ میں حاضر ہو جائیں۔ بے شبہ ان کے جرم معاف کر دیے
جائیں گے اور ان کی حیثیت کے مطابق سلوک ہوگا۔ اس منشور پر یقین رکھنا چاہئے اور معلوم ہے کہ
تمام ہندوستانی حکمران مہربان اور رحم دل ہیں۔ ہزاروں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا، لاکھوں نے
اسے سنا، اس کے برعکس کسی نے خواب میں بھی نہ سنا ہوگا کہ انگریزوں نے کسی کا جرم معاف کیا۔

۵۔ اصل منشور میں مرقوم ہے کہ جب امن قائم ہو جائے گا تو رفاہ عامہ کے کام شروع
ہوں گے، مثلاً سڑکیں بنیں گی، نہریں کھودی جائیں گی تاکہ عوام کی حالت سدھرے۔
سوچنے کے لائق یہ بات ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے جو وعدہ کیا جا سکتا ہے، یہی ہے کہ
وہ سڑکیں بنائیں گے اور نہریں کھودیں گے۔ جو لوگ اس حقیقت کو صاف صاف دیکھ نہیں
سکتے، ان کا کیا علاج ہے؟ غرض (وکٹوریا کے) منشور سے کسی کو دھوکا نہ کھانا چاہئے۔

(۱۸۵۷ء کے مجاہدینِ آزادی)

فاطمہ بنت عبداللہ طرابلسی

مولانا ابوالکلام آزادؒ

یورپ کے ملک اٹلی نے طرابلس لیبیا پر حملہ کیا ترکوں و عربوں نے مقابلہ کیا غزوہ طرابلس میں عربوں نے صدر اوّل اسلام کے غزوات و سرایا کے واقعات زندہ کر دیئے اور مدتوں کے بعد عرب بادیہ کو موقع ملا کہ ان کے اصل جوہر نمایاں ہوں۔ بدر، احد کے واقعات میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایسی عورتیں تھیں جو اپنے آٹھ آٹھ لڑکوں کو اللہ کی راہ میں زخمی کرا کر خود بھی زخمی ہو جاتی تھیں اور اللہ کے رسولِ محبوب کی محبت میں ایسی محو تھیں کہ تیروں پر تیر کھاتیں مگر اپنے جسم کو ان کے سامنے ڈھال کی طرح رکھتیں خاکِ طرابلس نے یہ تمام واقعات دہرا دیئے۔

عربی جنگ کی پہلی خصوصیت عورتوں کی شرکت ہے غزوہ طرابلس میں بھی اندرون صحرا کے قبائل مع اپنے پورے خاندانوں کے شریک ہوئے۔ عورتیں، نوجوان لڑکیاں، بوڑھی ضعیف عورتیں۔ بچوں کو گود میں لئے ہوئے میدان جہاد میں زخمیوں کو ڈھونڈ رہی ہیں۔

اندرونِ طرابلس کا ایک بڑا قبیلہ جس کے سردار شیخ عبداللہ تھے۔ اس قبیلہ اور ان کے سردار کے جانفروشانہ عزائم نے ہی کامیابی کی راہ پر ڈالا۔ اس مجاہد نے قبائل کو ابھار کر آمادہ کیا اور اپنا تمام مال و متاع ترک افسروں کے حوالے کر دیا۔ نفقۂ جنگ روزانہ جو سب کو ملتا تھا وہ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اپنے خاندان کے تمام عورتوں، مردوں کو دشمن کی توپوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا اور ان سب کے ساتھ شہید ہوا۔

لَنۡ تَنَالُوۡا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ
نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اس کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو لٹا نہ دو۔
ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوتیں انسان کی دنیوی محبوبات مال، اولاد اور جان ہے۔
ان بوجھل بیڑیوں کو اس فانی فی اللہ عاشقِ صادق نے ایک ہی وقت میں توڑ ڈالا۔ سب سے پہلے مال ترک کمانڈر کے حوالے کیا پھر اپنے عزیزوں کو قربان کرایا۔ آخر میں اپنی جان بھی خدا کے راستے میں دے ڈالی۔ عبداللہ کا تمام خاندان مصروف پیکار خدمات جہاد تھا۔ لیکن اولاد میں صرف ایک گیارہ برس کی لڑکی فاطمہ تھی جس کے جذبہ و استغراق کو دیکھ کر ترک افسران و سپاہی بھی حیران رہ جاتے تھے۔ ڈاکٹر اسمعیل ثباتی جنہوں نے اس معصوم بچی کی تصویر اتاری تھی عزادیہ سے زوارہ آیا جہاں لشکر میں عورتوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن فاطمہ میں کچھ باتیں ایسی نظر آئیں جس نے اسے ہزاروں مردوں عورتوں کے لشکر میں نمایاں کر دیا تھا۔
عمر بہت کم زیادہ سے زیادہ گیارہ برس کی ہوگی۔ میدان جنگ اور زخمیوں سے اسے ایسا انس ہو گیا تھا کہ سخت ترین بھیانک معرکوں میں بھی اس کی سبقت کو ہر سپاہی محسوس کرتا تھا جنگ خواہ حملہ کی ہو یا تلواروں اور سنگینوں کے سامنے صفیں ہوں مگر زخمی مسلمان کی آہ میں اس کے لئے ایسی کشش تھی جس کو سن لینے کے بعد محال ہو جاتا کہ اس کی چھوٹی سی مشک اپنا فرض بھول جاتے۔ وہ کم سن تھی لیکن مقصد کا عشق جوانوں اور بوڑھیوں سے بھی زیادہ نہ بچپن کے شوق نہ لہو ولعب صرف خون بہتا ہوا زخم کٹا ہوا انسانی جسم اسے جہاں نظر آتا ایک بادرفتار ہرنی کی طرح دوڑ کر وہاں پہنچ جاتی ایک مرتبہ دیکھا بارود کے دھوئیں سے تمام فضا تاریک ہو رہی ہے توپ کی سامعہ شکن صداؤں سے کانوں کے پردے پھٹ رہے ہیں گولوں کے پھٹنے سے ایک روشنی، مہیب گرجیں، انسانی چیخیں مل کر ایک ہولناک وحشت انگیز سماں پیدا کر دیتی تھیں۔
ایسے جگر گداز زہرہ خراش عالم میں وہ معصوم بچی اپنا اونچا سا کرتا پہنے اور پھٹی سی چادر سر سے لپیٹے دوڑ رہی ہے اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مظلوم زخمیوں کی خبر گیری کے لئے کوئی فرشتہ آسمان سے اتر آیا ہے اور ہوا میں اڑ رہا ہے گولوں کی بارش ہو رہی تھی اور فاطمہ اسی بارش میں تیرتی ہوئی ہرنی گرنے والی لاش کی آواز پر بجائے خوف وڈر کے اس کے دل میں طاقت کی ایک نئی روح

پیدا کر کے اسے وہاں پہنچادیتی۔ میں نے اس ہولناک منظر میں پکڑ کر سمجھایا کہ تو اس کم عمری میں موت کی آرزومند کیوں ہوگئی ہے تو تو اپنے باپ کی صرف ایک ہی یادگار ہے اس نے کہا چھوڑ دو مجھے اس وقت ملت کے کتنے فرزند پیاسے دم توڑ رہے ہیں یہ کہا اور نظروں سے غائب ہوگئی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ مجھ کو سرخ رنگ سے عشق ہے۔ آہ آخر ایک دن میں نے اس کی گردن اور دل کے نیچے سے یہی رنگ بہتا ہوا دیکھا۔

۱۲رجب ۱۳۳۱ھ کو اطالویوں نے دوماہ کی زبردست تیاری کے بعد زوارہ پر حملہ کیا عرب بھی خالی پڑے گھبرا گئے تھے۔ بھوکے شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ روما سے اس مورچے پر مرنے والے اطالوی ۶ ہزار بتائے گئے مگر اصلاً ۱۲ ہزار سے کم نہیں مارے گئے۔ اس مورچہ پر ترک و عرب فوج تین ہزار تھی شام تک مورچہ ہوا ہزاروں لاشیں چھوڑ کر اطالوی بھاگ گئے۔ اس روز کے مورچہ میں اٹالین توپ خانہ اور دس ہزار بندوقوں کی کڑک و گرج اور آگ برس رہی تھی۔ تمام ریگستان میں موت اور لاشوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس بہشت زار شہادت کی حورِعین فاطمہ بدستور زخمیوں کو پانی پلانے میں مشغول ہے دھوئیں و تپش سے اس کا چہرہ جھلسا ہوا ہے بالوں میں خون سے رنگین ریت کی تہ جمی ہوئی ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون شہیداں کے دھبے اس کے محبوب سرخ رنگ کے پڑے ہوئے ہیں اور رنگین ہوگئے ہیں اپنی مخصوص والہانہ تڑپ کے ساتھ فضائے جنگ میں اڑ رہی ہے۔ اس کی ماں بھی میدان جنگ میں لگی ہوئی ہے اور باپ بھی اپنے قبیلہ کے ساتھ مصروف جانبازی ہے۔

عصر کے قریب مجاہدین نے فیصلہ کن عزم کے ساتھ آخری حملہ کیا۔ ترک کمانڈر نوری بک بھی اپنے جیش کے ساتھ دشمنوں پر ٹوٹ پڑا توپ خانہ تک بڑھتا چلا گیا۔ مورچہ سخت تھا اپنی فوج سے فاصلہ پہ چند جانباز اطالویوں میں گھرے ہوئے لڑ رہے ہیں فاطمہ بھی اس خطرناک جگہ خدا معلوم کس طرح اڑ کر پہنچ گئی۔ یہ سپاہی لڑتے ہوئے نکل آئے جو زخمی ہو کر گر پڑے تھے ان میں سے ایک زخمی کے منہ سے فاطمہ نے مشک لگادی ایک ظالم اطالوی نے فاطمہ کا گریبان پکڑ لیا فاطمہ نے چھڑانا چاہا مگر ایک کم عمر بچی اس کی گرفت سے نہیں نکل سکی۔

فاطمہ نے فوراً ایک زخمی ترک کی تلوار اٹھا کر ماری جس سے اس کا ہاتھ کٹ گیا اس نے

دوسرے ہاتھ سے فاطمہ کو بندوق کی گولی سے شہید کر دیا۔ اسی وقت اطالوی فوج بھاگی عرب وترک سپاہی جب دشمن کے تعاقب میں آگے بڑھے تو انہوں نے دیکھا کہ چار ترک اور فاطمہ کی لاش پڑی ہے مشک کا منہ فاطمہ کے ہاتھ میں ہے مشک ایک ترک سپاہی کے سینہ پر پڑی ہے۔ شاید مرتے دم بھی زخمی ترک کو پانی پلانے کی کوشش کی تھی مگر مشک اس کے منہ تک نہ لے جاسکی۔

غزوۂ طرابلس میں عربی قبائل اور ترک فوجوں کے جذبۂ جہاد کے ایمان افروز واقعات نے پورے عالم اسلام کو متاثر کیا فاطمہ کی غیر معمولی قربانیوں پر ہر ملک نے خراجِ عقیدت پیش کیا اس کی شہادت پر آنکھوں نے آنسو بہائے اور مسلمانوں نے اس کا ماتم کیا اہل علم وعمل علماء کرام مشائخ شعراء اسلام سب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہمارے ملک ہندو پاک میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے اخبار "الہلال" کلکتہ میں فاطمہ کی تصویر دی اور ایک دردناک مضمون لکھا جس سے یہ مضمون لیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ و شفیق جونپوری مرحوم نے جو شعر کہے وہ درج کئے جاتے ہیں۔

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تری مُشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیانِ دین کی سقائی تیری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستے میں ہے بے تیغ وسپر
ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں خوابیدہ ہیں

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ ترے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے اک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
جو ابھی اُبھرے ہیں ظلمت خانۂ ایام سے
جن کی تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے

(علامہ اقبالؒ)

......☆......

سرِ میدان ہے اک نازوں کی پالی دیکھتا ہوں میں
بہ شکل تیغ اَبروئے ہلالی دیکھتا ہوں میں
ذرا سا قد مگر ہمت ہے عالی دیکھتا ہوں میں
کہ جگنو ہے مگر سوزِ ہلالی دیکھتا ہوں میں
ہوائے تند بن غازی سے جھونکے لے کے آتی ہے
انہی جھونکوں میں سلمائے شہادت گیت گاتی ہے

وہ مشکیزے لئے باغِ جناں کی حور آتی ہے
وہ دیکھو زخمیوں کو فاطمہ پانی پلاتی ہے
دوپٹے سے کسی زخمی پہ کرنے کو بڑھی سایا
کسی پیاسے کے ہونٹوں سے لگایا بڑھ کے مشکیزا
دیا جانباز لڑکی نے سبق مردانِ امت کو
کہ مومن ہو تو سینچو خون سے گلزارِ ملت کو
بدن سے فاطمہ کے بہہ رہے ہیں خون کے دھارے
نگاہیں کر رہی ہیں جنتِ کبریٰ کے نظارے
تری ساقی گری کی دھوم معصومی کا وہ عالم
کہ حلقے میں لئے ہیں تجھ کو سب ترک و عرب باہم
(شفیق جونپوری)

خوفناک رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور کمزور و ناتواں مائی اماں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھیں۔

بالآخر وہ جگہ بھی آ گئی جہاں مائی اماں نے پہنچنا تھا۔

مگر یہ کیا؟...... وہاں مجاہدین کا کوئی آدمی موجود نہیں تھا، حالانکہ مائی اماں کے روانہ ہونے سے قبل وائرلیس آپریٹر نے مجاہدین سے رابطہ کر کے ''امانت'' وصول کرنے کا وقت اور مقام متعین کر لیا تھا۔

مائی اماں یہ صورت حال دیکھ کر پریشان ہو گئیں......

''یا اللہ خیر کرنا'' ان کی زبان سے یہی الفاظ نکلے تھے کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ خیال آیا اور انہوں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد قدم آگے بڑھا دیئے۔

''مجاہدین کے گرد دشمن کا گھیرا بہت تنگ ہو گیا ہو گا۔ جبھی ان میں سے کوئی نہیں آ سکا'' مائی اماں کو یقین ہو چکا تھا...... اور اب وہ مقرر مقام سے آگے بڑھ کر بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئیں تھیں۔ جہاں سے دوسری طرف میں مجاہدین کا مورچہ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ مائی اماں اپنے مجاہدوں کی جھلک دیکھ کر خوشی سے بے قرار ہو گئیں۔ اور تیزی سے مورچہ کی جانب بڑھنے لگیں۔

عین اسی گھڑی اچانک کئی گولیاں فائر ہوئیں اور فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی مائی اماں کی جانب لپکیں۔

......☆......

حسین بی بی

ابن احمد شیخ

رات کی گہری تاریکی میں، اس فوجی جوان کی کرخت آواز گہرے سناٹے کو توڑتی ہوئی دور دور تک جا رہی تھی جو ہاتھ میں ریسیور اٹھائے، وائرلیس سیٹ پر نظر جمائے...... مسلسل ایک ہی رٹ لگا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت جلد کسی سے رابطہ کر کے کوئی اہم پیغام دینا چاہتا ہے۔ لیکن اب جب کہ اسے اس طرح کافی دیر ہو چکی تھی اس کے چہرے پر ہلکے ہلکے مایوسی کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ ابھی تک ناامید نہیں ہوا تھا اور اب بھی بار بار "ہیلو!...... ہیلو!" کی آواز لگا کر رابطہ کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسری طرف سے جواب ملنے کا کوئی امکان نہیں۔

"یا اللہ...... کہاں مر گئے ہیں یہ ہیڈ کوارٹر والے...... کوئی ہماری سننے والا بھی موجود نہیں ...... کسی کو کیا فکر کہ "اے کے تھری" کے جوانوں پر کیا بیت رہی ہے؟"

کوشش بسیار کے باوجود جب اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو اس نے ریسیور کو وائرلیس سیٹ پر پٹخ دیا اور خود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"اب کیا ہوگا!...... ؟؟" اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

......☆......☆......☆......

یہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا تذکرہ ہے۔ جب پاکستان کی شاہین صفت فوج کشمیر کی ڈوگرہ فوج

کے مقابلے میں آہنی دیوار بنے کشمیر کے مختلف محاذوں پر اپنے وطن کی ایک ایک بالشت زمین کے لئے برسر پیکار تھی۔ کشمیر سے ملنے والی پوری سرحد کی طرح پونچھ کے سرحدی علاقے میں بھی ہر روز قدم قدم پر خونی معرکے ہو رہے تھے۔ بلکہ اس علاقے میں تو جنگی سرگرمیاں کچھ زیادہ ہی تیز تھیں۔ کیونکہ پاکستان کے وہ غیرت مند مسلمان عوام جو اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لئے آئے دن کشمیر میں داخل ہو رہے تھے ان کا راستہ یہیں سے ہو کر گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن نے اپنی فورسز کا ایک بڑا حصہ اسی طرف لگایا ہوا تھا۔

افواج پاکستان کی جانب سے اس علاقہ کا دفاع "اے کے تھری رجمنٹ" کے بہادر جوانوں کی قسمت میں آیا تھا۔ جنہوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کٹ مر جائیں گے لیکن دشمن کو کسی صورت آگے نہیں بڑھنے دیں گے اور پھر انہوں نے اپنا کہا واقعی سچ کر دکھایا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ان کا دشمن ہر طرح کے جدید اور بھاری اسلحہ سے لیس تھا اور اسے روزانہ تازہ امداد بھی پہنچ رہی تھی، پاکستان کے ان شاہین صفت مجاہدوں نے اپنی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود ایسی کارنامے رقم کیے جنہیں سن کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

......☆......☆......☆......

وہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی ۶ اور ۷ تاریخ کی درمیانی رات تھی۔ جب پونچھ میں واقع تھوراڑ کی بستی میں موجود "اے کے تھری رجمنٹ" کے جری جوانوں کو دشمن کے محاصرے میں آئے تین دن گزر چکے تھے اور مجاہدین دشمن کا محاصرہ توڑنے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے، مگر دوسری طرف دشمن کا پلڑا بہت بھاری تھا۔ نفری کے اعتبار سے دشمن کو ایک مجاہد کے مقابلہ میں تیس افراد کی برتری حاصل تھی اور اسلحہ کے لحاظ سے مجاہدین کی پرانی ٹک ڈم رائفلوں کے جواب میں وہ برین گن اور مارٹر گن استعمال کر رہا تھا۔

اس خونریز معرکہ کو شروع ہوئے تین دن گزر چکے تھے اور اب وہ گھڑی آ پہنچی تھی جس کے بعد آزادی یا غلامی کا فیصلہ کن مرحلہ شروع ہونا تھا کیونکہ اکثر مجاہدین کے پاس گولہ بارود ختم ہو چکا تھا اور اب وہ اپنی گنوں کو صرف اسی وقت لاٹھی کے طور پر استعمال کر سکتے تھے جب دشمن ان کو گرفتار کرنے کی نیت سے ان کی جانب بڑھتا۔

''ہم مر جائیں گے......لیکن غلامی کی زندگی قبول نہیں کریں گے''......ان مایوس کن حالات میں بھی ہر مجاہد کی زبان پر یہی جملہ تھا۔

مگر اس کڑے محاصرہ سے نکل جانا کیسے ممکن تھا یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ ان کے ایک طرف وہ بلند پہاڑی تھی جس پر دشمن کی موجودگی لازمی تھی اور بقیہ تین طرف سے انہیں ذرا سے فاصلے پر دشمن نے گھیر رکھا تھا۔

بالآخر ان مجاہدین نے آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور ساتھ ہی اپنے اس فیصلے کی اطلاع اپنے سب سے قریبی رابطہ پوائنٹ پر موجود وائرلیس آپریٹر کو بھی دے دی۔ جو اس پہاڑ کی دوسری جانب مسلسل ان سے رابطہ میں تھا۔

رابطہ پوائنٹ پر موجود فرض شناس سپاہی پوری تندہی سے وائرلیس آپریٹر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مگر جب اس نے یہ اطلاع سنی کہ محاصرہ میں آئے ہوئے مجاہدین آخری قدم اٹھانے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو اس کی پریشانی کی انتہا نہ رہی۔ اس لئے کہ ''آخری قدم'' کا معنی وہ بخوبی سمجھتا تھا مگر وہ اس وقت بالکل بے بس تھا۔ کیونکہ اس کے پاس سوائے گولہ بارود کی ایک پیٹی کے اور کچھ نہیں تھا جو وہ مجاہدین کو بھیجتا۔

''مگر یہ پیٹی میرے ان مصیبت زدہ بھائیوں تک لے کر کون جائے گا؟'' اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے کہ اس وقت وائرلیس سیٹ پر اس کی عدم موجودگی کا مطلب رابطہ پوائنٹ کی تباہی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ویسے بھی کافی دیر مسلسل کوشش کے باوجود ابھی تک وہ ہیڈ کوارٹر سے رابطہ نہ کر پایا تھا۔

''کیا ہوا......؟؟''

وائرلیس آپریٹر ابھی اسی پریشانی کا حل تلاش کرنے میں مگن تھا کہ اچانک اسے بالکل قریب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''کون؟......'' اس نے جھنجھلا کر پوچھا، مگر پھر فوراً ہی اس نے آواز کو پہچان لیا......

وہ اماں حسین بی بی تھی۔

......☆......☆......☆......

تھوراڑ کی اس مختصری بستی میں جہاں حق و باطل کا یہ معرکہ گرم تھا چند ہی مکان تھے۔ جن میں سے دو مکان میدان جنگ کے عقبی حصہ کی جانب، پہاڑی کے دامن میں گھنے درختوں کے درمیان بنے ہوئے تھے۔ ان دونوں مکانوں کے در و دیوار اگرچہ کمزور سے تھے لیکن آہنی صفت مجاہدین کے لئے اس وقت وہ ایک مضبوط مورچہ کا کام دے رہے تھے۔

ان دونوں مکانوں میں سے ایک میں مجاہدین کا رابطہ پوائنٹ تھا اور دوسرے میں ایک ادھیڑ عمر بیوہ خاتون ''حسین بی بی'' اپنے یتیم بچوں کے ہمراہ مقیم تھی۔

''حسین بی بی'' بظاہر ایک گمنام سی دیہاتی خاتون تھیں مگر ملک و ملت کے لئے ان کی قربانیاں ایک ایسی ناقابل فراموش داستان ہیں جو اب کشمیری لوگوں کے لئے لوک کہانیاں بن گئی ہیں۔

''مائی حسین بی بی'' نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود اپنی ملت کے تحفظ کی قسم کھائی تھی۔ چنانچہ وہ ہر وقت ہر گھڑی دنیا کے ہر غم سے بے غم اور ہر فکر سے بے نیاز مجاہدین کی خدمت میں مگن نظر آتیں۔ جب اس علاقے میں مجاہدین باقاعدہ مورچہ زن ہو گئے تو حسین بی بی نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ صبح صبح اٹھ کر پہلے وہ فجر کی نماز ادا کرتیں۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت کرتیں اور اس کے بعد وہ ایک من آٹے کی روٹیاں پکا کر انہیں اپنے سر پر لاد کر مجاہدین تک پہنچاتیں۔ اس کے علاوہ زخمی مجاہدین کی خدمت کرنا اور دوسرے کاموں میں مجاہدین کا ہاتھ بٹانا مائی حسین بی بی کے معمولات میں شامل تھا۔

مائی حسین بی بی کے اسی مجاہدانہ کردار کی بنا پر انہیں آزاد کشمیر ریگولر فورس میں رجمنٹل نمبر (۲۰۷۱۱۔۳ر کے۔اے) دے کر بھرتی کر لیا گیا تھا اور اب وہ باقاعدہ ایک سپاہی کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ مجاہدین حسین بی بی کو محبت سے ''اماں مجاہدہ'' کہتے تھے۔

......☆......☆......☆......

مائی حسین بی بی کو دیکھ کر وائرلیس آپریٹر نے سوچا:

''کاش! اس وقت اس بوڑھی اماں کے بجائے کوئی جوان آ جاتا جو کسی طرح میری مدد کر سکتا''

''کیوں بیٹا...... کیا ہوا...... کیوں اس طرح پریشان ہو اور زور زور سے چیخ رہے ہو؟''

وائرلیس آپریٹر اس کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا لیکن مائی اماں کا محبت بھرا لہجہ دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکا۔

''کچھ نہیں اماں بس رابطہ کر رہا تھا...... ہیڈ کوارٹر سے...... لیکن......''

آپریٹر نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن...... لیکن کیا ہوا؟ مجھے بتاؤ تو سہی تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو......'' مائی اماں نے ایک مرتبہ پھر اسے پیار بھرے انداز سے کریدا۔

''ہاں اماں! مسئلہ ہی ایسا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟''

''مگر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ دیکھو میں بھی تو ایک سپاہی ہوں......'' مائی اماں نے اپنا کمزور سا جسم اکڑاتے ہوئے کہا۔

''اماں!...... محاذ پر مجاہدین اس وقت سخت پریشان اور مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں...... آپ کو تو معلوم ہے کہ وہ تین دن سے محاصرہ میں ہیں۔ لیکن اب ان کے گرد دشمن کا گھیرا بہت تنگ ہو چکا ہے۔ دشمن کی نفری بھی بہت زیادہ ہے اور اسے مسلسل تازہ کمک کے ساتھ جدید اسلحہ بھی پہنچ رہا ہے۔ جب کہ ہمارے مجاہدین کے پاس بارود ختم ہو چکا ہے اور اب وہ بالکل نہتے ہیں......''

''تو پھر...... اب کیا ہوگا؟'' وائرلیس آپریٹر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ مائی اماں بے صبری سے بولیں:

''مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی ان مجاہدین نے اطلاع دی ہے کہ اگر صبح تک کچھ نہ ہو سکا تو ہم آخری قدم اٹھائیں گے...... آر یا پار...... یا شہید ہو جائیں گے یا محاصرہ توڑ کر نکل آئیں گے...... مگر مجھے ان مشکل حالات میں اپنے ان بھائیوں کا زندہ نکل آنا مشکل نظر آتا ہے'' وائرلیس آپریٹر نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

اس کی بات سن کر مائی اماں بھی پریشان ہو گئیں اور بے اختیار ان کی منہ سے نکلا ''اب کیا ہوگا......؟''

''میرے پاس بارود کی ایک پیٹی ہے جو مجاہدین کو مل جائے تو کامیابی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے...... مگر...... مگر میرے پاس کوئی آدمی نہیں جو اسے مجاہدین تک پہنچائے...... اور میں خود بھی

رابطہ پوائنٹ چھوڑ نہیں سکتا" وائرلیس آپریٹر نے مائی اماں کو مزید تفصیلات بتلائیں۔

"مگر ... میں تو موجود ہوں ...... میں یہ پیٹی خود مجاہدین تک پہنچاؤں گی" مائی اماں بولیں۔

"لیکن یہ تو بہت بھاری ہے...... اور آپ کمزور سی عورت ہیں...... آپ یہ کیسے اٹھائیں گی......؟" فوجی جوان نے سراپا سوالیہ نشان بن کر مائی اماں کی جانب دیکھا۔

"کیوں؟...... میں دو وقت کی روٹی نہیں کھاتی؟...... کیا میرے بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں...... میں تو جنگل سے لکڑیوں کے گٹھ اٹھا کر لے آتی ہوں...... تو میرے لئے یہ پیٹی اٹھانا کون سا مشکل کام ہے؟" مائی اماں نے باقاعدہ احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ گویا وائرلیس آپریٹر نے انہیں کمزور سمجھ کر ان کی توہین کا ارتکاب کیا تھا۔

وائرلیس آپریٹر یہ باتیں سن کر ابھی حیرانی سے مائی اماں کی جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ مائی اماں نے اپنی بڑی سی سبز چادر جلدی سے زمین پر بچھا دی اور کہنے لگیں:

"لاؤ بیٹا...... وہ پیٹی اس چادر پر رکھ دو......"۔

مائی اماں کا پُرجوش حکم سن کر وائرلیس آپریٹر اپنی جگہ سے اٹھا اور بارود کی بھاری بھرکم پیٹی مشکل سے اٹھا کر چادر پر رکھ دی۔

مائی اماں نے قریب ہی رکھی روٹیاں اٹھائیں اور وہ بھی اس پیٹی کے اوپر رکھ کر چادر کے چاروں کونوں کو گرہ لگا کر گٹھڑی بنا لی۔

"اچھا بیٹا...... اب یہ گٹھڑی میرے سر پر رکھ دو......" مائی اماں نے ایک اور حکم دیا۔

وائرلیس آپریٹر جو ابھی تک خاموشی کے ساتھ حیران ہو کر بوڑھی اماں کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا کسی فرمانبردار بیٹے کی طرح جلدی سے اٹھا اور گٹھڑی مائی اماں کے سر پر رکھوا دی۔

بارود اور روٹیوں سے بھری گٹھڑی جونہی مائی اماں کے سر پر رکھی گئی تو ایک مرتبہ تو ان کے قدم ڈگمگا گئے لیکن پھر انہوں نے اپنی پوری قوت مجمع کر کے وائرلیس آپریٹر کو خدا حافظ کہا اور محاذ کی جانب چل دیں۔

......☆......☆......☆......

یخ بستہ رات کی تاریکی...... پہاڑی راستہ...... خاردار پودے......نوکیلے پتھر...... جان لیوا چڑھائی اور منوں بھاری گٹھڑی...... مائی اماں ان تمام مشکلات سے بے پرواہ ہو کر کبھی آہستہ کبھی تیز قدم اٹھاتی ہوئی محاذ کی جانب بڑھتی چلی جارہی تھیں۔

اس خطرناک راستے میں کئی جگہ انہیں ٹھوکریں لگیں...... پیروں میں کانٹے چبھے مگر وہ چلتی رہیں۔ بعض مرتبہ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے جب وہ بہت زیادہ تھک گئیں تو انہوں نے سوچا کہ کچھ دیر کے لئے بیٹھ کر سستا لیں۔ لیکن پھر یہ خیال آتے ہی دوبارہ آگے بڑھنے لگیں:

''میرے جانباز بیٹوں کا کیا ہوگا؟''...... جو تین دن سے موت کے منہ میں ہیں...... تین دن سے انہوں نے کچھ کھایا نہیں...... ان کی کیا حالت ہو رہی ہوگی؟...... اگر مجھے وہاں پہنچنے میں تھوڑی سی بھی دیر ہوگئی تو......'' وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔ اور پھر وہ بہتے آنسوؤں کے ساتھ مزید تیز چلنا شروع کر دیتیں۔

مائی اماں بار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتیں اور گزرتے وقت کا اندازہ کرتیں......

''ابھی صبح ہونے میں کچھ وقت باقی ہے'' یہ سوچ کر ان کے حوصلوں کو جلا ملتی۔

......☆......☆......☆......

خوفناک رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور کمزور و ناتواں مائی اماں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھیں۔

بلآخر وہ جگہ بھی آگئی جہاں مائی اماں نے پہنچنا تھا۔

مگر یہ کیا؟...... وہاں مجاہدین کا کوئی آدمی موجود نہیں تھا، حالانکہ مائی اماں کے روانہ ہونے سے قبل وائرلیس آپریٹر نے مجاہدین سے رابطہ کر کے ''امانت'' وصول کرنے کا وقت اور مقام متعین کر لیا تھا۔

مائی اماں یہ صورت حال دیکھ کر پریشان ہوگئیں......

''یا اللہ خیر کرنا'' ان کی زبان سے یہی الفاظ نکلے تھے کہ اچانک ان کے ذہن میں کچھ خیال آیا اور انہوں نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد قدم آگے بڑھا دیئے۔

''مجاہدین کے گرد دشمن کا گھیرا بہت تنگ ہو گیا ہوگا۔ جبھی ان میں سے کوئی نہیں آسکا''

مائی اماں کو یقین ہو چکا تھا...... اور اب وہ مقرر مقام سے آگے بڑھ کر بلند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئیں تھیں۔ جہاں سے دوسری طرف میں مجاہدین کا مورچہ دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا۔ مائی اماں اپنے مجاہدوں کی جھلک دیکھ کر خوشی سے بے قرار ہو گئیں۔ اور تیزی سے مورچہ کی جانب بڑھنے لگیں۔

عین اسی گھڑی اچانک کئی گولیاں فائر ہوئیں اور فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی مائی اماں کی جانب لپکیں۔

......☆......☆......☆......

دشمن کے محاصرے میں گھرے مجاہدین پر اس رات کا ایک ایک لمحہ پہاڑ بن کر گزر رہا تھا۔ اور اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ صبح کی روشنی طلوع ہوتے ہی انہیں "آخری قدم" اٹھانا ہوگا۔

"پھر اس کے بعد کیا ہوگا......" اس سوال کا جواب ہر مجاہد کی آنکھوں کے سامنے تھا کیونکہ باہر سے کچھ امداد کی توقع نہ تھی اس لئے کہ مائی اماں کے رابطہ پوائنٹ سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے امداد کی وصولی کے لئے جو پروگرام طے کیا تھا اب وہ اس پر عمل درآمد کرنے سے عاجز تھے اس لئے کہ دشمن نے ان کے گرد گھیرا مزید تنگ کر دیا تھا اور اب خود ان کے لئے وہاں سے نکلنا ناممکن تھا۔

اس صورتحال نے مجاہدین کو مزید پریشان کر دیا اور وہ ہر قسم کی امداد سے مایوس ہو کر ہر آنے والے لمحہ میں پیش آنے والے کسی بھی واقعہ سے نمٹنے کے لئے تیار ہونے لگے۔ اسی دوران اچانک انہیں اپنے عقب میں پہاڑی کی بلندی سے کوئی چیز لڑکھڑاتی ہوئی نیچے آتی دکھلائی دی...... سب مجاہدین حیرانگی سے اس جانب دیکھنے لگے...... قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک گٹھڑی تھی...... جسے کھولا تو اس میں سے روٹیاں اور بارود کی بڑی سی پیٹی برآمد ہوئی...... مجاہدین کی آنکھیں یہ دیکھ کر چمک اٹھیں...... انہوں نے جلدی جلدی پیٹی کو کھولا تا کہ اپنی بندوقوں میں بارود بھر سکیں مگر اچانک انہیں ایک مرتبہ پھر پہاڑی سے کوئی اور چیز لڑکھڑاتی دکھلائی دی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نسوانی چیخیں بھی تھیں۔

مجاہدین اس جانب بڑھے تو ایک کمزور سی عورت کا لاغر سا جسم جو گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا ان کے سامنے آ گرا۔

"اوہ!...... یہ تو مائی اماں ہیں"۔ کسی مجاہد کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

اجنبی سمت سے چلنے والی دشمن کی گولیاں مجاہدہ مائی اماں کے سینے اور ران میں پیوست ہو چکی تھیں اور درد کی شدت اور تکلیف کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے سامنے مکمل تاریکی چھا رہی تھی۔ مگر اس وقت بھی انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور پوری قوت کے ساتھ سر پر رکھی گٹھڑی مجاہدین کے مورچے کی جانب لڑھکا دی۔ اور پھر وہ خود بھی بے دم ہو کر گر پڑیں۔

مجاہدین کی اس امداد کی ساری خوشیاں مائی اماں کی حالت دیکھ کر خاک میں مل گئیں اور ہر آنکھ نم ہو گئی...... مگر یہ جان کر انہیں خوشی ہوئی کہ "اماں" ابھی زندہ ہیں...... لیکن بے ہوش۔

بہر حال مجاہدین نے جلدی جلدی اپنا اسلحہ تیار کیا اور پھر بغیر ایک لمحہ کے انتظار کے دشمن پر اچانک زبردست قسم کا فائر کھول دیا۔

بزدل دشمن جواب تک اپنی نفری اور اسلحہ کے زور پر محاصرہ کر کے مجاہدین کو زندہ گرفتار کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا یہ غیر متوقع صورت حال دیکھ کر سراسیمہ ہو گیا اور سمجھا کہ مجاہدین کو بھاری تعداد میں کمک پہنچ گئی ہے۔ اب ڈوگرہ فوج کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا..... چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے صرف پندرہ منٹ میں تین دن کا محاصرہ ختم ہو چکا تھا اور دشمن تھوراڑ کی بستی سے کوسوں دور پہنچ چکا تھا۔

تھوراڑ فتح ہو چکا تھا اور تھوراڑ کو فتح کرنے والی عظیم مجاہدہ بے ہوش پڑی تھی۔ اے کے تھری کے مسلح مجاہد سراپا غم واندوہ کی تصویر بنے اس کے اردگرد کھڑے تھے...... اسی دوران اچانک "مائی اماں" کو ہوش آیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولیں اور سوالیہ نظروں سے مجاہدین کی جانب دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہوں کہ بتاؤ فتح ہوئی یا شکست؟

عظیم مجاہدہ کی آنکھیں کھلتی دیکھ کر مجاہدین نے خوشی کے مارے نعرۂ تکبیر لگایا۔ اور "مائی اماں" کو فتح کی خوشخبری سنائی...... فتح کی خبر سن کر مائی اماں کی آنکھوں میں ایک لمحہ کے لئے چمک پیدا ہوئی اور پھر انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور آنکھیں موند لیں...... یہ دیکھ کر ایک مجاہد آگے بڑھا اور ان کی نبض کو ٹٹولا...... مگر مائی اماں سر پر فخر کا تاج سجائے اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ چکی تھیں!!۔

❁❁❁❁

خالدہ ادیب خانم

(وفات ۹ر جنوری ۱۹۶۴ء)

طالب الہاشمی

خالدہ ادیب خانم کا شمار جدید ترکی کی نامور ادبی وسیاسی شخصیات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے نہ صرف ترکی سیاست اور جنگِ آزادی میں حصہ لیا بلکہ علمی اور ادبی میدان میں بھی نہایت وقیع کام کیا۔ فی الحقیقت وہ ایک ایسی جامع کمالات خاتون تھیں جن پر کوئی قوم بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔

خالدہ ادیب خانم ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۴ء میں استانبول کے محلہ بیشکتاش میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ادیب بے، سلطان عبدالحمید ثانی (۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء تا ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء) کے عہد میں ''محکمہ جیب ہمایوں'' (خزانہ شاہی) کے معتمد اعلیٰ (چیف سیکرٹری) تھے۔ خالدہ ابھی کمسن تھیں کہ ان کی والدہ فاطمہ فوت ہوگئیں۔ والد نے دوسری شادی کرلی اس لئے ان کی پرورش زیادہ تر نانی کے گھر میں ہوئی۔ بچپن میں کچھ عرصہ نرسری میں رہیں۔ جب پانچ سال کی ہوئیں تو محلے کے ایک مدرسے میں داخل کرا دیا گیا اور گھر میں بھی استاد کا انتظام کردیا گیا۔

اسی زمانے میں انہوں نے قرآن مجید ختم کرلیا۔ سات سال کی عمر میں انہیں امریکی اسکول میں داخل کرایا گیا۔ اس زمانے میں اس قسم کی درسگاہوں میں ترک لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے خالدہ کو ایک سال بعد تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیونکہ سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے پیشگی سرکاری اجازت کے بغیر کسی ترک لڑکی کا امریکی درسگاہوں میں داخلہ ممنوع

قرار دے دیا تھا تاہم خالدہ کیلئے امریکی درسگاہوں میں تعلیم پانے کی اجازت حاصل کرلی۔ چنانچہ خالدہ دوبارہ امریکی اسکول میں داخل ہوگئیں۔ اسکول کی تعلیم ختم ہونے کے بعد انہوں نے امریکی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں اپنی تعلیم مکمل کرلی۔ اس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔

اس دوران میں انہوں نے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کرلی کہ ایک امریکی مصنف جیکب ایبٹ کی کتاب "دی مدران ہوم" (THE MOTHERIN HER HOME) کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ اس ترجمے کو سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور خالدہ کو ایک اعزازی نشان مرحمت فرمایا۔

خالدہ کی تعلیم صرف مدرسے اور کالج تک محدود نہ تھی بلکہ گھر پر بھی باصلاحیت اساتذہ سے پڑھانے کا انتظام تھا چنانچہ انہوں نے عربی اور انگریزی کی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اس زمانے میں مشہور فلسفی رضا توفیق سے انہوں نے فرانسیسی زبان وادب کی تعلیم حاصل کی۔ جس سال انہوں نے کالج کی تعلیم مکمل کی اسی سال ان کی شادی مشہور ریاضی دان صالح زکی سے ہوگئی، جو کالج کی تعلیم کے دوران میں ان کے استاد یا اتالیق تھے۔ ان سے خالدہ کے دو بیٹے آیت اللہ اور حکمت اللہ پیدا ہوئے۔ چند سال تک میاں بیوی کے تعلقات بہت خوشگوار رہے۔ اسی زمانے میں خالدہ نے ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کردیا۔ وہ انقلاب پسند نوجوانوں کی جماعت "انجمن اتحاد وترقی" کی رکن بن گئیں اور اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ابنائے وطن میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انجمن اتحاد وترقی کی جدوجہد کے نتیجے میں، ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں ملک میں دستوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد خالدہ نے نوجوانوں کے نمائندہ قومی اخبار طینن (THANIN) میں باقاعدہ لکھنا شروع کردیا۔ ان کے بعض مقالات کو علماء کے ایک طبقے نے پسند نہ کیا۔

۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں قدامت پسند جماعت "جمعیت محمدیہ" نے انجمن اتحاد وترقی کے خلاف محاذ آرائی شروع کردی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جماعت کو سلطان عبدالحمید خاں کی درپردہ حمایت حاصل تھی۔ انجمن اتحاد وترقی کے اراکین کیلئے یہ بڑا خطرناک زمانہ تھا کیونکہ مخالفین نے ان کے بہت سے سرکردہ افراد کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، اور سلطان کے حکم سے قوم پرستوں کی پکڑ دھکڑ بھی شروع ہوگئی تھی۔ خالدہ نے اپنی جان کو معرضِ خطر میں دیکھ کر پہلے اس کودار کے سلطان تپہ میں

اور پھر امریکی کالج میں پناہ حاصل کی۔ چند دن بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ مصر چلی گئیں اور وہاں سے انگلستان۔ انگلستان سے ترکی واپس آنے کے بعد خالدہ نے (۱۳۲۸ھ ۱۹۰۹ء، ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۲ء) ان کے جانشین بنے تھے۔ انہوں نے خالدہ کو بلا بھیجا۔ جب وہ شاہی دربار میں حاضر ہوئیں تو سلطان نے ان کی جبری غیر حاضری پر افسوس کا اظہار کیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی علمی ادبی اور رفاہی سرگرمیاں بلا کھٹکے جاری رکھ سکتی ہیں۔ اس کے بعد خالدہ نے استانبول میں معلمات کے ایک مدرسے میں پڑھانا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ مختلف رفاہی کام بھی زور شور سے شروع کر دیئے۔
۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں جنگِ بلقان شروع ہوگئی جس میں بلقان کے عیسائی ملکوں نے ایکا کر کے ترکی پر یلغار کر دی۔ سخت نامساعد حالات کے باوجود ترکوں نے زبردست مقابلہ کیا اور بالآخر دشمن کو شکست دے کر اپنے ملک سے نکال باہر کیا۔ اس جنگ کے دوران میں خالدہ ادیب خانم نے "تعالی نسواں" کے نام سے خواتین کی ایک جماعت قائم کی اور اس کے ذریعے مختلف امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ جنگ عظیم اوّل کے آغاز تک خالدہ نے بے شمار رفاہی کام کئے مثلاً "تعالی نسواں" کے تحت بہت سے شفاخانوں کا قیام، محکمہ اوقاف کے تحت متعدد مدارس کا قیام، خواتین کے اخبارات کی تعداد میں اضافہ وغیرہ شام کے گورنر جمال پاشا کو خالدہ کی گرانقدر قومی خدمات کا علم ہوا تو اس نے شام اور لبنان میں تعلیمِ نسواں کا کام خالدہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا (لبنان اس زمانے میں شام ہی کا حصہ تھا) چنانچہ وہ اس کی دعوت پر ۱۳۳۴ھ ۱۹۱۶ء میں بیروت چلی گئیں۔ وہاں ان کو شام اور لبنان کے زنانہ مدارس کا انسپکٹر جنرل بنا دیا گیا۔

وہ ابھی لبنان ہی میں تھیں کہ ان کے والد نے ان کی خواہش کے مطابق ۷/رجب ۱۳۳۵ھ (مطابق ۲۹/اپریل ۱۹۱۷ء) کو ان کا نکاحِ ثانی ڈاکٹر عدنان آدیوار[1] سے کر دیا۔ جمادی

---

[1] ڈاکٹر عدنان آدیوار کا شمار ترکی کے نامور اربابِ سیاست اور اہلِ علم میں ہوتا ہے وہ ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء سے ۱۳۵۸ھ ۱۹۳۹ء تک ترکی جمہوریہ میں وزیر رہے۔ متعدد کتابیں تصنیف کیں جن میں سے تین بہت اہم ہیں (۱) علم اور دین (۲) عثمانی ترکوں میں علم وحکمت (۳) فاؤسٹ کا تجزیہ اور تحلیل۔ وہ ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء سے ۷۵-۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء تک ترکی زبان کی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (اسلام انسٹی پیڈیسی) کی مجلس ادارت کے صدر بھی رہے۔

ڈاکٹر عدنان آدیوار نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق یکم جولائی ۱۹۵۵ء کو وفات پائی۔

الآخر ۱۳۳۶ھ (مارچ ۱۹۱۸ء) میں خالدہ لبنان سے استانبول واپس آ گئیں۔ یہاں استانبول یونیورسٹی کے شعبۂ ادبیات میں مغربی ادب کی پروفیسری پر ان کا تقرر ہو گیا۔

جنگ عظیم اوّل ترکی نے جرمنی (محوری طاقتوں) کا ساتھ دیا۔ اتحادیوں کو جنگ میں فتح ہوئی تو ان کی فوجوں نے درہ دانیال سے گزر کر استانبول پر قبضہ کر لیا لیکن اُدھر اناطولیہ میں مصطفیٰ کمال پاشا نے سیواس کے مقام پر متوازی حکومت قائم کر لی اور اپنے ملک کو اغیار سے تسلط سے نکالنے کیلئے مسلح جدوجہد شروع کر دی۔

آہستہ آہستہ استانبول کے قوم پرست پوشیدہ طور پر ان کے پاس پہنچنے لگے۔ اس طرح سیواس میں ایک قومی اسمبلی کی تشکیل ہوئی جسے بعد میں انقرہ منتقل کر دیا گیا۔ خالدہ نے بھی استانبول میں مارشل لا کے باوجود اپنی شعلہ بار تقریروں سے ترکی کے جذبۂ آزادی کو مہمیز لگائی۔ اس سلسلے میں دو جلسے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک جلسہ سلطان احمد ثانی کی مسجد کے سامنے ہوا۔ اس میں دو لاکھ کے لگ بھگ لوگ شریک ہوئے۔ اس میں خالدہ نے ایک پُر جوش تقریر کی۔ دوسرا جلسہ گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان میں ہوا اس میں بھی بے شمار لوگ شریک ہوئے۔ خالدہ نے ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا:

> ''تم سات سو برس تک فاتح قوم رہے ہو، تمہارا قومی پرچم ہمیشہ دوسری قوموں کے جھنڈوں سے اونچا نظر آتا رہا ہے۔ کیا آج تم یہ ذلت برداشت کرو گے کہ اسلام کے آخری دارالحکومت پر کفار کا استیلا ہو جائے اور تمہاری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ جائے۔ اٹھو اور دنیا کو بتا دو کہ ترکوں میں ابھی جان باقی ہے اور وہ کبھی کسی کی غلامی کا طوق گلے میں نہیں ڈال سکتے۔''

ولولہ انگیز تقریریں کرنے کے علاوہ خالدہ نے قراقول نامی ایک خفیہ تنظیم میں شامل ہو کر اناطولیہ تک اسلحہ پہنچانے کے کام میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے چالیس محبان وطن کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ ان میں خالدہ اور ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان آدیوار بھی شامل تھے۔ وہ دونوں انگریزوں کی کڑی نگرانی کے باوجود بھیس بدل کر استانبول سے اناطولیہ پہنچ گئے جہاں مصطفیٰ کمال پاشا نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کو اپنی کابینہ میں وزیر تعلیم مقرر کر دیا۔ ان

کے فرائض میں ترجمے اور صحافتی نوعیت کے کام بھی شامل تھے۔

یہ واقعہ رجب ۱۳۳۸ھ (اپریل ۱۹۲۰ء) میں کا ہے۔لیکن جلد ہی محب وطن ترکوں پر ایک نئی بلا نازل ہوگئی وہ یہ کہ یونانیوں نے انگریزوں کی انگیخت پر حملہ کر کے ازمیر (سمرنا) پر قبضہ کرلیا اور پیشقدمی کرتے ہوئے انقرۃ کے قریب دریائے سقاریہ تک پہنچ گئے۔ خالدہ نے پہلے تو محاذِ جنگ پر پہنچ کر ہلالِ احمر کے تحت زخمیوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کی پھر انقرہ واپس آکر نرسنگ کی خدمات انجام دیں۔ ۱۱رذی الحجہ ۱۳۳۹ھ (۱۶راگست ۱۹۲۱ء) کو خالدہ نے مصطفیٰ کمال پاشا سے فوج میں باقاعدہ شامل ہوکر محاذِ جنگ پر جانے کی اجازت طلب کی۔ یہ اجازت انہیں مل گئی اور انہیں ''اون باشی'' (کارپول) بنا کر محاذِ جنگ پر بھیج دیا گیا۔ انہوں نے سقاریہ کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں ترجمان اور نامہ نگار کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ وہ اکثر اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہوکر مجاہدین کی صفوں اور خندقوں میں مقیم جانبازوں کو دیکھنے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کیلئے گشت کیا کرتی تھیں۔

چنانچہ انگریزی اخبارات نے ان کو ''ترکیہ کی جون آف آرک'' کا خطاب دیا۔ترکوں نے سقاریہ کی لڑائی میں یونانیوں کو تباہ کن شکست دی اور اناطولیہ کو ان کے وجود سے پاک کردیا۔ خالدہ اپنی فوج کے ساتھ ۷رمحرم ۱۳۴۱ھ مطابق ۳۰راگست ۱۹۲۲ء کو فاتحانہ ازمیر (سمرنا) میں داخل ہوئیں۔ اس موقع پر ان کی فوجی خدمات کے اعتراف میں ان کو باش چاوش (سارجنٹ میجر) کے عہدے پر ترقی دی گئی۔اس کے بعد انہوں نے اس کمیٹی میں کام کیا جو یونانیوں کے مظالم کی تحقیق کیلئے قائم کی گئی تھی۔ خود مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک تار کے ذریعے ان کی خدمات کو سراہا۔

جب مصطفیٰ پاشا نے اتحادیوں کو ترکی سے نکال کر آزاد جمہوریہ قائم کی تو خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر ترکی سے باہر چلے گئے۔اس کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان دونوں کا تعلق اس طبقۂ فکر سے تھا جو ترکی میں خلافت قائم رکھنا چاہتے تھے اور جس کی قیادت رؤف بے اور کاظم قرہ بکر کر رہے تھے۔اس کے علاوہ یہ لوگ برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کے حامی تھے۔مگر کمال اتاترک خلافت کو ہر صورت میں ختم کرنا چاہتے تھے اور ایک لادینی یک جماعتی نظامِ

حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اوّل الذکر طبقۂ فکر کے بہت سے لوگ مایوس ہو کر وطن سے باہر چلے گئے۔

خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان بھی ان لوگوں میں شامل تھے۔ جد میں ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں سعید کردی کی بغاوت کے بعد اتاترک نے سرکاری طور پر جن ڈیڑھ سو افراد کو باقاعدہ جلاوطن کر دیا ان میں غازی رؤف پاشا، خالدہ ادیب خانم اور ڈاکٹر عدنان کے نام بھی شامل تھے۔

خالدہ ادیب خانم اور ان کے شوہر پورے پندرہ سال ترکی سے باہر رہے۔ چار سال تک انگلستان میں اور گیارہ سال فرانس میں اس دوران میں انہوں نے کئی ملکوں کے دورے کئے اور مختلف یونیورسٹیوں میں ترکی کے ادب، سیاست اور تاریخ وغیرہ پر لکچر دیئے۔ ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۵ء میں خالدہ ادیب خانم مشہور مسلم رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم کی دعوت پر ہندوستان آئیں اور دو ماہ (جنوری و فروری) کے عرصے میں جامعہ ملیہ (قرول باغ) دہلی میں آٹھ لیکچر دیئے۔

ہر تقریر کے موقع پر جلسہ کی صدارت ملک کا کوئی ممتاز رہنما کرتا تھا۔ علامہ اقبالؒ اور گاندھی جی نے بھی ایک ایک جلسے کی صدارت کی۔ اس کے علاوہ خالدہ ادیب خانم نے لاہور، پشاور، لکھنؤ، بنارس کلکتہ، حیدر آباد دکن اور بمبئی کی سیاحت بھی کی اور وہاں اپنے اعزاز میں منعقد ہونے والے اجتماعات میں تقریریں بھی کیں۔ بعد میں انہوں نے اس سفر کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھے جو "INSIDE INDIA" (اندرونِ ہند) کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء میں کمال اتاترک کے انتقال کے بعد ترکی حکومت نے جلاوطن افراد کو وطن واپس آنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ خالدہ اور ان کے شوہر بلا تاخیر ترکی واپس پہنچ گئے۔ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ (دسمبر ۱۹۳۹ء) میں خالدہ ادیب خانم نے استانبول یونیورسٹی میں انگریزی کی پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔ گیارہ سال بعد انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور ۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء ترکی کی پارلیمنٹ (مجلس کبیر ملی) کی رکن منتخب ہو گئیں۔ چار سال بعد ۱۳۷۳ھ ۱۹۵۴ء وہ پارلیمنٹ کی رکنیت چھوڑ کر استانبول یونیورسٹی میں واپس آ گئیں۔ ۱۳۷۴ھ ۱۹۵۵ء میں

ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان آدیوار فوت ہو گئے۔

خالدہ ادیب خانم اب ضعیف العمر ہو چکی تھیں اور ان کو طرح طرح کے عوارض لاحق ہو چکے تھے تاہم انہوں نے تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا اور نو سال کے عرصے میں کئی کتابیں مکمل کیں۔ ۲۳ر شعبان ۱۳۸۳ھ مطابق ۹ جنوری ۱۹۶۴ء جمعرات کے دن ۲ار۲ بجے خالدہ ادیب خانم نے وفات پائی اور اگلے دن استانبول کے قبرستان مرکز آفندی میں سپرد خاک کردی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

خالدہ ادیب خانم نے ۵۴ کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ ان میں ۳۶ کتابیں ان کی طبع زاد تصانیف ہیں (۳۵ کتابیں ترکی زبان میں ہیں اور ایک انگریزی زبان میں) نو کتابیں ایسی ہیں جن کو دوسری زبانوں سے ترکی زبان کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔

✿✿✿✿

عائشہ بی بی باقاعدہ مسلح ہو کر دشمن کے علاقے میں جاتی اور اپنے لوگوں کے مویشی واپس لے آتی۔ اس علاقے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس کے راستے میں آتا۔ ۱۹۶۵ء میں جب کشمیر میں مسلح بغاوت کا آغاز ہوا تو ایک دن عائشہ بی بی کے مویشی نالہ ارسل پار کر کے مقبوضہ علاقے میں چلے گئے۔ اتنے میں بھارتی فوج کے مسلح جوان پٹرول کرتے ہوئے اس طرف آ نکلے اور عائشہ بی بی کے مویشیوں کو ہانک کر اپنے مورچوں کی طرف لے جانے لگے۔ عائشہ بی بی کو خبر ہوئی تو وہ چھپتے چھپاتے نالہ عبور کر کے بھارتی فوجیوں کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ جونہی بیس کے قریب دشمن سپاہی اس کے سامنے سے گزرے عائشہ بی بی نے جھاڑیوں کی اوٹ سے ان پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ آناً فاناً ایک فوجی جوان کے سر پر بڑا پتھر لگنے سے نیچے گر پڑا۔ باقی فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عائشہ بی بی نے گرے ہوئے فوجیوں پر اس انداز سے فائر کھول دیا کہ انہوں نے سمجھا وہ مسلح حریت پسندوں کے گھیرے میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے زخمیوں کو میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے اور عائشہ بی بی تنہا انہیں للکارتے ہوئے اپنے مویشی ہانک کر واپس لے آئی۔ عائشہ بی بی دن رات مجاہدین کی خدمت کرتی۔ انہیں کھانا پکا کر کھلاتی اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی اور جس قدر ممکن ہوتا انہیں ضروری معلومات فراہم کرتی۔

......☆......

عائشہ بی بی

(تاریخ شہادت۔۹ فروری ۱۹۹۱ء)

ابن احمد شیخ

اس دن بڑا ہی خوفناک معرکہ برپا ہوا تھا۔ ہندوستان کے بزدل فوجیوں نے بالکل اچانک ہی آزاد کشمیر کی ایک چوکی پر حملہ کر دیا تھا۔ جبکہ اس چوکی میں چند پاکستانی فوجیوں کے سوا اس وقت کوئی بھی موجود نہ تھا جو اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود شیر صفت جوان دشمن کی اندھادھند فائرنگ کے سامنے یوں ڈٹ گئے جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ چنانچہ دشمن جو اپنے بھاری بھرکم اسلحہ کے بھروسہ پر اپنی شامت کو دعوت دے چکا تھا۔ اب تک چند قدم سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ حالانکہ اس دن حملے کا پروگرام طے کرنے والوں کو یقین تھا کہ وہ بہت آسانی کے ساتھ پاکستان کی اس سرحدی چوکی پر قبضہ کر لیں گے۔ لیکن اب جب انہیں اینٹ کا جواب پتھر سے مل رہا تھا تو ان کے ہوش وحواس اڑنے لگے۔ چنانچہ فوری طور پر مزید مدد طلب کر کے اس حملے کو زیادہ طاقتور بنانے کی کوشش کی گئی۔

دوسری جانب پاک فوج کے ان شاہینوں کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس سوائے چند بندوقوں کے کچھ نہیں تھا۔ جن سے وہ مقامی آبادی کی حفاظت کا فریضہ تو سرانجام دے سکتے تھے لیکن اتنے بھاری حملے کا جواب وہ زیادہ دیر تک نہ دے سکتے تھے۔ ان کے لئے مزید پریشانی کا باعث یہ سامان بھی تھا کہ مسلسل کوشش کے باوجود وہ اپنے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ مگر

ان سب مشکلات کے باوجود وہ ابھی تک اپنے مورچوں پر نہ صرف ڈٹے ہوئے تھے بلکہ ان میں سے بعض تو اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر آگے بڑھ کر دشمن کے علاقے میں بھی پہنچ گئے تھے۔ اور بالکل قریب سے دشمن پر جوابی فائر کر رہے تھے۔ دراصل انہیں معلوم تھا کہ اصل طاقت اللہ کی ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے۔ جبھی تو انہیں نہ اپنی کمزوری کا احساس تھا اور نہ ہی کمک نہ پہنچنے کا غم۔

اس صورتحال میں دونوں طرف سے بھڑکنے والی آگ تیز تر ہوتی چلی گئی اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے وادیٔ سانی کی سرزمین پھٹ چکی ہو اور اس میں سے آگ کے شعلے برس رہے ہوں۔

اسی دوران ایک سانحہ پیش آ گیا۔ معرکہ کے بالکل درمیان میں ایک فوجی جوان جو دونوں فوجوں کی درمیانی سرحد "نالہ ارسل" کو پار کر کے دشمن کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا اچانک فائرنگ کی زد میں آ کر شہید ہو گیا۔ جب کہ ایک دوسرے جوان کی ٹانگ شدید زخمی ہو گئی۔ یہ دیکھ کر مجاہدین میں تشویش کی لہر دوڑ گئی کیونکہ یہ دونوں دشمن کے علاقے میں اس قدر اندر تک چلے گئے تھے کہ اب اتنی شدید برستی ہوئی آگ میں انہیں اٹھا کر واپس لانا تقریباً ناممکن تھا۔ جبکہ شہید کی لاش کو دشمن کے نیچے سے نکالنا تھا اور زخمی کو جلد از جلد طبی امداد فراہم کرنی تھی۔ مگر یہ سب کچھ کیسے ممکن تھا؟ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

فوجی جوان ابھی اپنے شہید اور زخمی ساتھیوں کو دشمن کے علاقے سے نکالنے کے لئے پلاننگ کر ہی رہے تھے کہ اچانک انہیں قریبی جھاڑیوں سے سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ سب یک دم چونک گئے اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر چند ہی لمحوں بعد یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ ایک دبلی، پتلی سی کمزور عورت اپنے کندھے پر اسی زخمی مجاہد کو لادے ہوئے آ رہی ہے۔ مگر اس قدر مشکل کام کے باوجود اس کے چہرے پر نہ خوف وہراس ہے اور نہ ہی پریشانی کے آثار۔

اس عورت نے زخمی مجاہد کو باقی فوجیوں کے درمیان چھوڑا اور یکدم تیزی سے گھوم کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔

فوجی جوان ابھی حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک مرتبہ پھر جھاڑیوں سے آواز آئی اور وہی عورت دوبارہ نمودار ہوئی اور اب اس کے کندھے پر شہید مجاہد کی لاش

تھی۔اس نے تیزی سے وہ لاش فوجیوں کے درمیان رکھی اور زخمی مجاہد کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئی۔ جہاں اس نے اس مجاہد کے زخموں پر مرہم پٹی لگائی۔

یہ دلیر خاتون جس نے یہ عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا کشمیر کی عظیم مجاہدہ بی بی عائشہ تھی۔

عائشہ بی بی ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئی۔۱۹۳۸ء سے وہ موہڑہ گڑھی میں اپنے شوہر سوار خان اور بچوں کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں مقیم تھی۔موہڑہ گڑھی آزاد کشمیر کے ضلع بھمبر کی تحصیل سماہنی موضع کہاولیاں کا انتہائی خوبصورت اور سرسبز وشاداب گاؤں ہے۔"گڑھی کہاولیاں" کشمیر میں جنگ بندی لائن کے قریب چالیس فٹ چوڑے نالہ ارسل پر واقع ہے جو بھارتی مقبوضہ کشمیر کے درمیان ایک عارضی حد قائم کرتا ہے۔عائشہ بی بی کا خاندان کئی پشتوں سے یہاں آباد تھا۔۱۹۴۷ء کے بعد سے بھارتی فوج نے اس کے گھر کے عین سامنے نالے کے دوسرے کنارے پہاڑی کی نشیب میں مستقل مورچہ بنایا ہوا ہے۔لیکن عائشہ بی بی کی وجہ سے کبھی بھارتیوں کو مورچے سے نکل کر سامنے کھڑے ہونے کی جرأت نہیں ہوئی۔عائشہ بی بی قیام پاکستان سے قبل بھی اپنے علاقے کے مظلوم مسلمانوں کو ڈوگروں کے ظلم وستم سے بچانے کے لئے طاقت ور لوگوں کے خلاف نبرد آزما رہتی تھی۔علاقہ کا نمبردار بشیر و خان ڈوگروں سے ملا ہوا تھا۔انہیں خوش کرنے کے لئے مسلمانوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا۔حتیٰ کہ ان کے مال مویشی اور فصلیں زبردستی چھین کر ڈوگروں کے حوالے کر دیتا۔عائشہ بی بی تک بات پہنچی تو وہ بلاخوف اس کے گھر چلی جاتی اور مسلمانوں کا مال واسباب اس سے واپس لے کر انہیں دلا دیتی۔

۱۹۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے غیر قانونی، غیر آئینی اور غیر فطری طور پر شیخ عبداللہ اور پنڈت نہرو سے سازباز کر کے کشمیر کا ناجائز الحاق ہندوستان سے کر دیا تو پوری ریاست جموں وکشمیر میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔عائشہ بی بی نے اپنے گاؤں کی آبادی کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی حال میں ہجرت نہیں کریں گے۔اپنے گھروں میں ڈٹے رہیں گے اپنی زمین کی حفاظت کریں گے یا تو یہاں آزادی کا سبز ہلالی پرچم لہرائے گا یا پھر سب شہادت کا جام نوش کر کے وطن کا حق ادا کریں گے۔چنانچہ عائشہ بی بی نے مردانہ وار اپنے گاؤں کے بہادر مردوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ ڈوگرہ فوج کا مقابلہ کیا۔وہ ایک پیدائشی مجاہدہ تھی۔اعلان جہاد کے بعد وہ ہر روز اپنے

گاؤں کے لوگوں کو جمع کر کے کلہاڑیوں، تلواروں اور بندوقوں سے جنگ کرنے کی تربیت دیتی۔ کبوتر گلہ اور ارسل نالہ سے مسلح ڈوگرے جتھوں کی صورت میں گزرتے تو عائشہ بی بی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ درختوں کے جھنڈ میں چھپ کر ان پر حملہ کرتی۔ ڈوگرے اچانک کاروائی پر بوکھلا کر اسلحہ اور لاشیں چھوڑ کر بھاگ جاتے اور کسی کو اس گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوتی اس طرح اس کے پاس کافی اسلحہ جمع ہو گیا تھا جو اس نے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کبوتر گلہ اور نالہ ارسل میں ڈوگرہ فوج اور مجاہدین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔ عائشہ بی بی کی کوششوں سے گاؤں کے ایک بھی آدمی نے اپنا گھر نہیں چھوڑا بلکہ سب دشمن کے خلاف ڈٹے رہے۔ بالآخر اس علاقے میں دشمن کو عبرتناک شکست ہوئی اور سہانی کی شاداب وادیوں میں آزادی کا سبز پرچم لہرانے لگا۔

جنگ بندی کے بعد اکثر اوقات آزاد علاقے کے لوگوں کے مویشی گھاس چرنے کے لئے مقبوضہ علاقے میں چلے جاتے۔ عائشہ بی بی باقاعدہ مسلح ہو کر دشمن کے علاقے میں جاتی اور اپنے لوگوں کے مویشی واپس لے آتی۔ اس علاقے میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ اس کے راستے میں آتا۔ ۱۹۶۵ء میں جب کشمیر میں مسلح بغاوت کا آغاز ہوا تو ایک دن عائشہ بی بی کے مویشی نالہ ارسل پار کر کے مقبوضہ علاقے میں چلے گئے۔ اتنے میں بھارتی فوج کے مسلح جوان پٹرول کرتے ہوئے اس طرف آ نکلے اور عائشہ بی بی کے مویشیوں کو ہانک کر اپنے مورچوں کی طرف لے جانے لگے۔ عائشہ بی بی کو خبر ہوئی تو وہ چھپتے چھپاتے نالہ عبور کر کے بھارتی فوجیوں کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئی۔ جونہی بیس کے قریب دشمن سپاہی اس کے سامنے سے گزرے عائشہ بی بی نے جھاڑیوں کی اوٹ سے ان پر پتھروں کی بارش شروع کر دی۔ آناً فاناً ایک فوجی جوان کے سر پر بڑا پتھر لگنے سے نیچے گر پڑا۔ باقی فوجیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ عائشہ بی بی نے گرے ہوئے فوجیوں پر اس انداز سے فائر کھول دیا کہ انہوں نے سمجھا وہ مسلح حریت پسندوں کے گھیرے میں آ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے زخمیوں کو میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے اور عائشہ بی بی تنہا انہیں للکارتے ہوئے اپنے مویشی ہانک کر واپس لے آئی۔ عائشہ بی بی دن رات مجاہدین کی خدمت کرتی۔ انہیں کھانا پکا کر کھلاتی اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی اور جس قدر ممکن ہوتا انہیں ضروری

معلومات فراہم کرتی۔

۱۴۔ آزاد کشمیر رجمنٹ کے کیپٹن میر افضل نے یہ تمام واقعات دستاویزی ثبوت کے ساتھ جی ایچ کیو راولپنڈی لکھ کر بھیجے اور ساتھ ہی وہ رائفل بھی بھیجی جو عائشہ بی بی نے بھارتی فوجیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے چھینی تھی۔ اس رپورٹ پر صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے بذریعہ یونٹ کمانڈر ۱۴۔ اے کے رجمنٹ عائشہ بی بی کو انعام کے طور پر ایک خودکار رائفل اور پانچ ہزار روپے نقد انعام دیا۔

ان تمام کاروائیوں کی وجہ سے عائشہ بی بی دشمن کی ہٹ لسٹ پر تھی۔ دن کے وقت کسی بھارتی فوجی کی جرأت نہ تھی کہ وہ اپنے مورچے سے نکل کر گڑھی کہاولیاں کے گھروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔ عائشہ بی بی کا گھر دشمن کے مورچے کی زد میں تھا۔ لیکن جونہی کوئی بھارتی فوجی اپنے مورچے سے باہر نکلتا وہ اپنی رائفل لے کر چھت پر چڑھ جاتی اور اسے للکار کر واپس اپنے مورچے میں جانے پر مجبور کر دیتی۔ بھارتی فوجیوں کے ساتھ اس کی ازلی اور قومی دشمنی تھی۔ اگست ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتے میں ایک دن دشمن نے مجاہدہ عائشہ بی بی کی کاروائیوں سے تنگ آ کر رات کے اندھیرے میں اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔ دشمن کو اندازہ نہ تھا کہ مسلمان مجاہد مرد ہو یا عورت نیند سے آشنا نہیں ہوتا۔ مجاہدہ عائشہ بی بی آہٹ سنتے ہی انعام میں حاصل کی ہوئی اپنی رائفل لے کر گھر کی چھت پر چڑھ گئی اور آم کے گھنے درخت سے دشمن پر فائر کھول دیا۔ اس اچانک اور غیر متوقع جوابی کاروائی سے دشمن کا ایک جوان عائشہ بی بی کے گھر کے قریب ہی گر کر جہنم واصل ہو گیا اور دوسرا شدید زخمی ہوا۔ عیار اور بزدل دشمن اپنے دو ساتھی عائشہ بی بی کے کھیت میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دراصل وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کا مقابلہ ایک تنہا عورت کر رہی ہے جس کے ہاتھوں ان کے دو قیمتی آدمی ضائع ہو چکے تھے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران مجاہدہ عائشہ دن رات مسلح حالت میں چاق و چوبند رہتی۔ اس کی بدولت جنگ کے باوجود گاؤں کے لوگوں میں قطعاً خوف و ہراس نہ تھا۔ نہ ہی دشمن کو ادھر کا رخ کرنے کی جرأت ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۸۹ء میں مقبوضہ کشمیر میں جہاد آزادی کا آغاز ہوا تو عائشہ بی بی کے سر پر شوق شہادت کا جنون سوار تھا۔ اس نے اپنی پوری جوانی وطن اور اللہ کی جس راہ میں دی تھی

اپنا انجام بھی اسی میں کرنے کی آرزومند تھی۔ ساٹھ برس کی عمر میں اس کا جوش وخروش جوانوں جیسا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں مقبوضہ کشمیر سے لٹے پٹے مہاجرین کا قافلہ آزاد کشمیر میں سرحد عبور کر کے داخل ہوا تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ اب بھارت کا ایک فوجی بھی ریاست جموں وکشمیر کی ایک انچ زمین پر نہیں ٹھہر سکتا۔ چنانچہ نالہ ارسل کے پار دشمن اس سے خوفزدہ رہتا، اور اس کی حرکات اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہتا۔ ۹ر فروری ۱۹۹۱ء کو دن کے گیارہ بجے یہ شیر دل خاتون پورے اعتماد کے ساتھ اپنے مویشیوں کو لے کر کھیتوں سے گزر رہی تھی کہ دشمن نے نشانہ لے کر مشین گن کا فائر کھول دیا۔ کشمیر کی یہ عظیم مجاہدہ سر میں گولیاں لگنے سے موقع پر ہی اپنے وطن عزیز اور اسلام کی ناموس پر قربان ہوگئی۔ پاک فوج نے اس عظیم شہید خاتون کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ گڑھی کہاولیاں کی اس پاک سرزمین میں دفن کیا جس کی آزادی اور عزت کے لئے اس نے پوری زندگی مردانہ وار غاصب دشمن کا مقابلہ کر کے اسے ذلت آمیز پسپائی پر مجبور کئے رکھا تھا۔ اس کے دو بیٹے پاک فوج میں وطن کی سرحدوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دے کر ریٹائر ہوئے اور ایک بیٹی فرزند بیگم جو اس کی اکثر کاروائیوں میں اس کے ساتھ رہتی تھی سر اور بازو میں دشمن کی گولیاں لگنے سے شدید زخمی ہوئی۔

شہید عائشہ بی بی کی ولولہ انگیز زندگی اور آبرومندانہ شہادت اب اپنے علاقے میں لوک داستان کی طرح زبان زد عام ہو چکی ہے۔ جٹ برادری کی یہ بے مثال خاتون اب اسلام کی بہو بیٹیوں کے لئے سرمایہ افتخار بن کر لوک گیتوں میں زندہ رہے گی اور کشمیری قوم اس پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

❁❁❁❁

عصر حاضر کی چند بہادر خواتین کے متفرق واقعات

ایک عرب مجاہد کا بیان ہے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اسے ایک غیر ملکی ہوائی کمپنی میں ملازمت مل گئی پھر وہ شادی کی غرض سے واپس سعودی عرب آیا تو اس کے ایک دوست نے بتایا کہ افغانستان میں کفر و اسلام کے مابین ایک خونریز معرکہ شروع ہو گیا ہے اور روس نے افغانستان میں نور خداوندی کو مٹانے کے لئے بھرپور کوشش شروع کر دی ہے اور اب وقت ہے کہ ہم مسلمان اس کفر کے مقابلے کے لئے کمربستہ ہو کر جہاد فی سبیل اللہ شروع کریں لیکن میں عیش پرستی میں ڈوبا ہوا تھا اور میں نے اسے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ تم پر جنون طاری ہو چکا ہے اور گھر پہنچ کر اپنی والدہ کو یہ خبر سنائی۔

سناتے سناتے میں نے اچانک اپنی والدہ کی طرف دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گیا، میری والدہ کا چہرہ آنسوؤں میں تر ہو چکا تھا۔ میں نے حیرانی سے اس کی وجہ پوچھی تو ماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا:

''خدارا مجھے افغانستان لے چلو میں خدا کی راہ میں شہید ہونا چاہتی ہوں''۔ والدہ کے یہ الفاظ مجھ پر بجلی بن کر گرے اور مجھے اپنی ذات سے نفرت ہونے لگی۔ اس ماں کے علاوہ میرے سامنے ان ماؤں کا عکس آنے لگا جس کی وجہ میری غفلت تھی۔

''مجھے افغانستان لے چلو'' ماں کی آواز نے ایک بار پھر جھنجھوڑا۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ نہ جائیں، آپ کی طرف سے میں خود اپنی جان قربان کروں گا۔ ''میں خود جہاد میں شرکت کرنا چاہتی ہوں'' والدہ نے انتہائی پرعزم لہجے میں کہا۔ بالآخر بحث مباحثے کے بعد یہ

طے پایا کہ میں پہلے جا کر حالات کا جائزہ لوں گا اور رہائش وغیرہ کا بندوبست کروں گا۔ اس فیصلے پر والدہ بمشکل راضی ہوئیں اور میں پاکستان آ گیا اور آتے ہی پشاور میں میں نے رہائش کا انتظام کرا دیا اور پھر واپس والدہ کو لینے سعودی عرب گیا تو والدہ ہسپتال میں تھیں اور بقول ڈاکٹروں کے آخری سانس لے رہی تھیں، میں نے جاتے ہی کہہ دیا کہ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ والدہ کے ناتوان جسم میں برقی لہر دوڑ گئی اور فوراً ہسپتال سے چھٹی ہو گئی۔

اپنے بھائیوں اور بہنوں کو روتا چھوڑ کر والدہ کو لے کر پشاور آ گیا اور اب والدہ جلد از جلد محاذ پر جانا چاہتی تھیں۔ میں نے مشورہ کیا تو ہمارے امیر صاحب نے کہا کہ مجھے اپنی والدہ کے پاس لے چلو۔ میں لے گیا، والدہ نے وہ تمام زیورات وغیرہ جو مجاہدین کے لئے وقف کر دیئے تھے امیر صاحب کے حوالے کر دیئے۔ امیر صاحب نے والدہ کو سمجھایا اور کہا کہ آپ کی یہ خدمت کافی ہے اور آپ بوڑھی ہیں لہٰذا آپ واپس چلی جائیں۔ امیر صاحب کے آگے انکار کی مجال نہیں تھی لہٰذا روتی پیٹتی واپس چلی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد فون آیا کہ والدہ کی طبیعت بہت سخت خراب ہے اور انہیں ہر وقت جہاد کی تڑپ ہے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد فون آیا کہ فلاں تاریخ کو اسلام آباد آ رہی ہیں اور آتے ہی والدہ سیدھی افغانستان کے شہر جلال آباد کے محاذ پر تشریف لے گئیں۔ والدہ کے خوشی کے باعث مسرت کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔

ہم جلال آباد پہنچے تو مجاہدین نے بوڑھی خاتون کو اسلام کی سربلندی کی خاطر برسر پیکار دیکھا تو فلک شگاف نعروں سے پہاڑ گونج اٹھے۔ چنانچہ والدہ محاذ پر تھیں اور دشمن کی طرف سے گولہ باری شدید ہو گئی اور بس پھر مجاہدین نے روسی سپر پاور کے مقابلے میں اس بوڑھی عورت کو لا کھڑا کیا اور خاتون پانچ گھنٹوں تک ''بسم اللہ اللہ اکبر'' کا نعرہ لگا کر توپ سے گولے برساتی رہی۔ روسی فوج تو بھاگ گئی اور مجاہدین حفاظتی تدابیر کے تحت مورچوں میں چلے گئے کیونکہ روسی طیارے اب بمباری کے لئے آ گئے لیکن یہ خاتون میدان میں کھڑی رہی اور اللہ سے شہادت مانگتی رہی۔ کافی دیر تک یہ منظر رہا لیکن پھر والدہ نے یہ دعا شروع کر دی کہ یا اللہ اگر میری قسمت میں شہادت نہیں تو زخم عطا کر دے۔ چنانچہ یہ دعا فوراً قبول ہوئی اور یہ عظیم خاتون اللہ کی راہ میں زخمی ہونے کی فضیلت حاصل کر کی مکہ مکرمہ لوٹ گئی۔

جب ایک بچی نے میدان مارلیا

خوفناک روسی ٹینک پتھروں اور جھاڑیوں کو روندتے ہوئے تیزی کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے۔ ٹینکوں کی آواز فوجیوں کے نعرے اس قدر شدید تھے کہ پہاڑ لرز رہے تھے۔ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر سرخ جھنڈے لہرا رہے تھے روسیوں کے لشکر کی بے خوفی کے عالم میں پیش قدمی کی وجہ جاسوسی ذرائع کی یہ خبر تھی کہ درمیان کی ساری بستیاں خالی ہو چکی ہیں یا خالی کردی گئی ہیں اور راستے کے حالات، اجڑے ہوئے مکانات، لٹی ہوئی بستیاں اس خبر کی تصدیق کر رہی تھیں۔ چنانچہ یہ لشکر بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا نوائے کا ہر سپاہی دل میں خطرناک عزائم لئے ہوئے تھا۔ کفر کی محبت اور اسلام کی نفرت کا جذبہ ہر دل میں موجزن تھا۔ تاتاریوں کی طرح مسلمانوں کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا وہ انہی خرمستیوں میں جا رہے تھے۔

اچانک سامنے والی پہاڑی سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ ٹڈی دل بزدل لشکر خوف سے تھرتھرانے لگا۔ خلاف توقع ہونے والی فائرنگ بہت کاری تھی، دشمن کا کچھ نقصان بھی ہوا تھا۔ اس اچانک حملے نے سارے لشکر کو پریشان کر دیا۔ پیش قدمی رک چکی تھی۔ دشمن کے ٹینک، توپیں مشین گنیں فائرنگ کی سمت آگ اگلنے لگیں۔ دشمن کے فوجی مختلف جھاڑیوں میں پوزیشن سنبھال کر اس اچانک حملے کو روکنے میں لگ گئے۔ پورا علاقہ اس خوفناک گولہ باری سے لرز اٹھا۔ آسمانوں پر سیاہ بادل کے دھویں چھا گئے۔ بزدل دشمن نے ٹینک کے گولے مار مار کر سامنے والی پہاڑی کو بالکل اڑا دیا۔ اس اطمینان کے بعد کہ حملہ آور تہس نہس ہو چکا ہے، دشمن نے گولہ باری روک دی مگر اچانک دائیں طرف کی ایک پہاڑی سے ہونے والی فائرنگ نے دشمن کے کئی فوجیوں کو واصل جہنم کر دیا۔

اس اچانک حملے نے دشمن میں بھگدڑ مچا دی۔ پھر ایک مرتبہ اندھا دھند گولہ باری شروع ہو چکی تھی۔ یہ گولہ باری پہلے سے زیادہ سخت تھی۔ لشکر میں کھلبلی اور بدنظمی کی وجہ سے کئی فوجی اپنے ہی ہاتھوں فنا ہو رہے تھے۔ توپوں کی گولہ باری سے بھی اپنا ہی نقصان کر رہے تھے۔ پورا لشکر اس خدائی

آفت سے پریشان تھا۔ یہ گولہ باری کافی دیر تک جاری رہی۔ حملہ آور کی طرف سے فائرنگ بالکل بند ہو چکی تھی۔ کمانڈر نے خوفزدہ ہو کر فوراً پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ حملہ آور کی تباہی کے باوجود دشمن خوفزدہ تھا۔ نقصان بھی کافی ہو چکا تھا۔

لشکر پیش قدمی شروع ہی کر رہا تھا کہ فائرنگ کی آواز نے سب کو چونکا دیا یہ فائرنگ بائیں طرف سے ہو رہی تھی۔ دشمن کے کئی فوجی خون میں لت پت پڑے تھے۔ اس حملے نے تو لشکر کی صفوں کو الٹ دیا تھا۔ ٹینک آگ اگلنے لگے۔ جس کا جدھر منہ سمایا ادھر بھاگنے لگا۔ فوجی اپنے ٹرکوں کے پیچھے پڑے ہوئے خوف سے کانپ رہے تھے۔ اس مرتبہ بھی دشمن کا شدید نقصان ہوا۔ غلط گولہ باری کی وجہ سے گاڑیاں اور ٹینک تباہ ہو چکے تھے۔ سرخ انقلاب والے سرخ خون میں تڑپ رہے تھے۔

اچانک کمانڈر نے ایک تدبیر سوچی اور اپنے گوریلا فوجیوں کو ان پہاڑیوں پر حملے کا حکم دے دیا جن سے یہ خطرناک فائرنگ ہوئی تھی۔ گوریلا فوجی کئی پہاڑیاں چھان چکے تھے مگر کوئی زندہ یا مردہ حملہ آور نہیں مل رہا تھا، کسی قسم کے نشانات بھی نہیں مل رہے تھے۔ سب پریشان تھے کہ حملہ آور کا کیا ہوا۔ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ بالآخر چھوٹے چھوٹے قدموں کے نشان انہوں نے پائے۔ ان نشانوں کے تعاقب میں کانپتے کانپتے بڑھ رہے تھے۔ یہ نشانات واضح ہوئے جا رہے تھے اور ان کی راہنمائی کر رہے تھے۔ مگر یہ کسی فوجی یا مجاہد کے قدموں کے نشانات محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ اچانک نشانات ختم ہو گئے۔ اب سرخ خون نظر آ رہا تھا۔ کسی کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک نو سالہ افغان مسلمان بچی خون میں لت پت پڑی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ اسؓ کی کلاشنکوف رکھی ہوئی ہے۔ عقدہ کھل چکا تھا۔ دشمن اپنی بزدلی اور ایک معصوم بچی کی بہادری پر حیران و پریشان کھڑا تھا۔

☆

عظیم مائیں

امتیاز انجم

یہ مضمون دراصل ایک کشمیری خاتون کے ساتھ پیش آنے والے سچے واقعات پر مبنی ہے
آیئے خود انہی کی زبانی سنتے ہیں اور اپنے ایمان کو تقویت اور جذبات کو تازگی بخشتے ہیں۔

''یہ غالباً جنوری ۱۹۹۰ء کی ایک سرد ترین شام کا ذکر ہے مظفر آباد کے ایک مقامی ہائی اسکول میں جہاد کشمیر سے متعلق ایک جلسے کے سلسلے میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ جس میں خواتین کی شرکت کا بھی انتظام تھا۔ جلسے کے اختتام پر میری نظر ایک کم سن لڑکے پر پڑی۔ روشن چہرے والے اس انتہائی خوبصورت لڑکے کی عمر بمشکل تیرہ چودہ برس کے درمیان تھی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پھیلی ہوئی فرشتوں کی سی معصومیت ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے پامپور کے زعفران کا سارا رنگ روپہلی چاندنی میں ڈھل کر اس کے چہرے پر اتر آیا ہے۔ مظفر آباد میں یہ اجنبی سا تھا۔

میں نے غیر ارادی طور پر سوال داغ دیا۔ ''بیٹا! کہاں سے آئے ہو؟''......

''سری نگر''......اس نے اپنی بیٹھی ہوئی آواز میں بمشکل جواب دیا۔

کچھ جلسے کا ماحول رقت آمیز تھا اور کچھ یک بارگی بدلے ہوئے قومی حالات کا جبر اس طرح کا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے بچھڑے ہوئے وطن (کشمیر) کی مٹی کی خوشبو میرے سارے وجود میں بس گئی ہو۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بخار سے بری طرح دہک رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا ''تمہیں تو بخار ہے''۔ اس نے چپکے سے اپنا سر ہلایا اور زمین پر نظریں گاڑ دیں۔

میری چشم تصور میں اس کی اداس ماں کا چہرہ ثبت ہو گیا جو شاید خلاؤں میں اسے تلاش کر رہی ہو گی۔ اس کے ساتھ مقبوضہ کشمیر کا ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کا کوڈ نام "مدبر" ہے اور یہ ہمارے ساتھ ایک کیمپ میں رہتا ہے۔ ابھی یہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہے کیونکہ سری نگر سے یہاں تک کئی بلند برفانی پہاڑ اور یخ بستہ مشکل راستے عبور کرتے ہوئے اس کے پاؤں کی انگلیاں خراب ہو گئی ہیں اور گلا بھی سوجا ہوا ہے۔ اس لیے اس کو تیز بخار ہے۔ ہم اس کی ضد کی وجہ سے جلسے میں لے آئے ہیں حالانکہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

"مدبر" میں نے سوچا...... اس کا مطلب ہے عمل تدبیر سے خزاں کو بہار کرنے والا۔ عہد زوال کی خزاں یافتہ سوکھی بھربھری مردہ شاخوں کو زندگی کی طرف لوٹا کر مژدۂ بہار سنانے والا۔ ویرانے کو گلشن میں تبدیل کر کے جہانِ نو کا پیغام دینے والا۔ کوڈ نام کس قدر خوبصورتی سے اس کی شخصیت پر چسپاں ہو رہا تھا۔ میں نے اس کا اصل نام پوچھا تو نوجوان نے قدرے پس و پیش کے بعد کہا ساجد مظفر بھٹ۔ میں نے اس سے التجا کی بیٹا! یہ بہت بیمار ہے اور کمسن بھی ہے اگر ممکن ہو تو میں اسے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ نوجوان کا نام اشرف ڈار تھا۔ اس نے بڑے محکم لہجے میں کہا: "اگر ہم لوگ اتنے نازک ہوتے تو گھر سے کیوں نکلتے۔ ہم نے اپنے لئے جہاد اور آزادی کے مشکل ترین راستوں کا انتخاب کیا ہے۔ یہ چھوٹی موٹی تکلیفیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ آپ بے فکر رہیں یہ کیمپ میں ہی تندرست ہو جائے گا"۔

جلسہ ختم ہوا تو اشرف ڈار نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام لیا اور وہ ایڑیوں پر چلتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس رات بہت تیز یخ بستہ ہوائیں چلتی رہیں، میری بھوک اور نیند اڑ چکی تھی۔ میرے اپنے تینوں بچے گھر سے بہت دور اپنے اپنے مادر علمی کے ہوسٹلز کے ٹھنڈے کمروں میں امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ مامتا کی عجیب خلش تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی میں ان لوگوں کے کیمپ میں پہنچ گئی اور اس کے کمانڈر سے اس کی کم عمری کے حوالے سے منت سماجت کر کے اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ شام کو میرے شوہر دفتر سے واپس لوٹے تو بیٹوں کے کمرے میں جگمگ کرنے والا چاند دیکھ کر ان پر خوشی کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور

وارفتگی میں دیر تک اس معصوم سے فرشتے کو سینے سے چمٹائے دعائیں دیتے رہے۔ دن تیزی سے گزرتے گئے۔ مدثر (ساجد) کے آنے سے یوں لگا جیسے اچانک بہار آ گئی اور ہمارا گھر رونق سے بھر گیا ہو۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ ننھا مجاہد شہر میں اس قدر ہر دلعزیز ہے کہ سارا دن اس کی خیریت دریافت کرنے والوں کے فون بجتے رہتے اور اس کے ساتھی لڑکے دوست اس کے پاس آتے رہتے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کا بخار اتر گیا اور چلنے پھرنے کے قابل بھی ہو گیا۔ لیکن ابھی گلے کی سوزش باقی تھی جس کا علاج جاری تھا وہ بہت جلد ہمارے ماحول میں گھل مل گیا تھا۔ ہم دونوں کو امی ابو کہتا۔ صبح کی نماز پڑھنے میرے شوہر لطیف صاحب کے ساتھ بارش اور برفانی طوفان میں بھی باقاعدگی سے مسجد جاتا۔ واپسی پر ہمارے کمرے میں بیٹھ کر چائے کی پیالی کے ساتھ لطیف صاحب سے قرآن شریف کا درس بھی سنتا۔

چند دنوں میں یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ ہمارے ہی جگر کا ٹکڑا ہو۔ حیا اس کی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور خاندانی وقار اس کی شخصیت کے ہر پہلو سے ہویدا تھا۔ میں نے اسے مصروف رکھنے کے لئے اس کے سپرد یہ ذمہ داری کر دی کہ دن بھر مختلف کیمپوں میں جا کر زخمی اور بیمار لڑکوں کا پتہ کرو اور جس کسی کو ہماری مدد کی ضرورت ہو اسے اپنے ساتھ لے آؤ۔ ہم نے اپنے مہمان خانے میں ان قیمتی مہمانوں کا بندوبست کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد ہمارا چھوٹا بیٹا بھی میٹرک کا امتحان دے کر ایبٹ آباد سے گھر آ گیا اور یہ دونوں مل کر زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

ایک دن میں نے مدثر (ساجد مظفر) سے پوچھا: "بیٹا! تم بہت چھوٹے ہو، جہاد تم پر فرض نہیں پھر تم کیا سوچ کر گھر سے نکلے تھے؟"

اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ کہنے لگا "مجھے نہیں معلوم وہ کیا جذبہ تھا پورے شہر کے لڑکے "پنڈی چلو، پنڈی چلو" کی صدائیں دیتے ہوئے قافلہ در قافلہ بسوں میں سوار ہو کر نکل رہے تھے۔ ایسے ہی ایک قافلے میں میں بھی اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ درس قرآن کی محفل سے اٹھ کر سپارے سمیت قافلے میں شامل ہو گیا۔ اس وقت ہمارا جذبہ یہ تھا کہ ہم چھوٹے بچے بھی گن اٹھا کر جہاد کریں گے اور بھارت کو کشمیر سے غاصبانہ قبضہ ختم کر کے نکل جانے پر مجبور کر دیں گے"۔

اس وقت وہ ترنگ میں تھا اور اپنی بات پوری کرنا چاہتا تھا۔ ہم بھی ہمہ تن گوش تھے۔ وہ

بولتا رہا۔ ”میں پاکستان کی سرزمین پر عجیب وغریب طریقے سے پہنچا۔ مسلسل سات دن اور سات راتیں برف سے ڈھکے ہوئے بلند وبالا پہاڑوں پر چڑھتے اور اترتے ہم بھوک پیاس اور تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکے تھے۔ ہم کل دس لڑکے تھے۔ ساتویں رات چودھویں کا چاند برف کی چادر پر نور برسا رہا تھا۔ مجھے نیند آ گئی اور میں وہیں سو گیا۔ صبح سورج کی حرارت سے میری آنکھ کھلی تو میں تنہا تھا اور ساتھی مجھے مردہ سمجھ کر جا چکے تھے۔ بھوک اور پیاس سے میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور پاؤں اور ہاتھ بھی سوجھ چکے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر برف چاٹنی شروع کر دی جس سے میرا گلا بند ہو گیا۔ اچانک میری نظر ایک باریک سے سفید سانپ پر پڑی جو تقریباً ایک فٹ لمبا تھا وہ میرے گرد چکر کاٹنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک خاص سمت کی طرف رینگنے لگا، میں بھی اس کے پیچھے چل دیا۔ ایک جگہ وہ رک گیا۔ یہاں سے دو راستے جاتے تھے۔ ایک اوپر چوٹی کی طرف اور دوسرا پہاڑ کے دوسرے رخ ڈھلوان کی طرف، دونوں راستوں پر قدموں کے نشان تھے۔ سانپ ڈھلوان کی طرف رینگنے لگا۔ میں تذبذب میں پڑ گیا کہ کون سا راستہ آزاد کشمیر کا ہو سکتا ہے۔ اتنے میں سانپ پھر واپس آیا اور کچھ دیر چکر کاٹنے کے بعد دوبارہ ڈھلوان کی طرف رینگنے لگا۔ اب میں نے اس کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ آگے کی طرف گیا تو نیچے ایک مکان کی کچی سی چھت نظر آئی۔ اس پر پاکستان کا سبز چاند تارے والا پرچم لہرا رہا تھا۔ مجھ پر پھر نیند طاری ہونے لگی یا پھر میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب میں ہوش میں آیا تو پشاور میں افغان مجاہدین کے امریکی ہسپتال میں تھا اور میرے پاؤں اور ہاتھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بعد میں میرے ساتھی بھی مل گئے جنہوں نے مجھے بتایا کہ اوپر والا راستہ بھارتی چوکی کی طرف جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سانپ کے ذریعے تمہاری رہنمائی کی ہے“۔

اس کی باتیں سن کر میں نے سوچا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ اس کی معصومیت اور پاکیزہ صورت کے پیچھے اللہ کی رضا ہے۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ وہ کیمپوں میں سے الطاف، فیروز، اعجاز اور سلیم کو اٹھا لایا۔ یہ سب شدید بیمار تھے۔ مدثر (ساجد) دن بھر ان کی تیمارداری کرتا اور رات کو گھر میں موجود مجاہدین اسلام کے واقعات والی تاریخی کتابیں پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔

وہ اپنی ماں کو موج کہتا تھا۔ اس کے تکیے پر جا بجا پنسل سے لکھا ہوتا: ”پیاری موجے میں

آپ کو بہت یاد کرتا ہوں"۔ سرہانے کی دیوار پر بھی اس نے کئی بار لکھا تھا "موج سلام۔ میں جلد آؤں گا"۔ وہ بے حد محبت کرنے والا لڑکا تھا۔ اپنی ساتھیوں کی دیکھ بھال اس طرح کرتا جیسے ڈیوٹی پر مامور ہو۔ یہ سب لڑکے عمر میں اس سے بڑی تھے اس لیے اسے بے حد چاہتے تھے۔

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ انتہائی خوبصورت اور پُر بہار موسم میں دھند کی عجیب پھوار میں یہ لڑکے پھولوں سے لدے ایک سرسبز و شاداب باغ میں سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر مخروطی تکون سی بنائے بیٹھے ہیں جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان کے ہمراہ رضوان بھی تھا جو مدثر (ساجد) کی عمر کا ان کے محلے کا بہت نیک لڑکا تھا۔ میرے ہاتھ میں نئے کپڑوں کے کچھ جوڑے تھے۔ میں نے مدثر سے کہا یہ لو۔ انہیں پہن لو، تمہارے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر جواب دیا، نہیں امی! ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بلایا ہے۔ انہیں ہمارے پرانے کپڑے اور جوتے ہی پسند ہیں۔ ہم اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لئے ہم یہ کپڑے تبدیل نہیں کریں گے"۔

شام کو میں مہمان خانے میں ان لوگوں کے لئے چائے لے کر گئی تو مجھے رات والا خواب یاد آ گیا جسے میں نے من و عن سنا دیا۔ اچانک مدثر (ساجد مظفر) کے منہ سے نکلا، امی! اس کا مطلب ہے کہ ہم سب شہید ہوں گے اور ہمیں رسول پاک ﷺ کا قرب حاصل ہوگا۔ میں اندر سے دہل سی گئی اور دل سے دعا نکلی کہ اللہ ان سب کو اپنے عظیم مقصد میں کامیاب کرے اور انہیں اپنی ماؤں کے پاس بحفاظت و بخیریت پہنچائے۔ لیکن پھر بات دہرانے کا یارا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ان کی واپسی کا پروگرام بن گیا۔ ۹ر جون ۱۹۹۰ء کو نصف شب کے قریب اشرف ڈار کا فون آیا کہ ساجد مظفر وغیرہ کہاں ہیں؟ ہم نے بتایا کہ سوئے ہوئے ہیں تو فون بند ہو گیا۔

دو بجے رات دروازے پر دستک ہوئی اور نوجوان مولوی اعجاز انہیں لینے کے لئے آ گیا۔ مدثر (ساجد) نے ہمارا دروازہ ہلکے سے کھٹکھٹایا اور دبی دبی آواز میں کہا "امی، ابو ہم جا رہے ہیں"۔ ہم دونوں ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ساجد کو ہم نے بہت کہا کہ یہیں رہ جاؤ حالات بہتر ہوں گے تو چلے جانا۔ میٹرک پاس کر لو تمہیں کالج میں یہاں داخلہ بھی مل سکتا ہے، لیکن وہ نہیں مانا۔ اس نے کہا: "ہم نے جنگ بندی لائن توڑ کر سری نگر پہنچنا ہے اور اپنے وطن کی آزادی

کے لئے جہاد کرنا ہے۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ سری نگر میں میری بہنیں ہیں، اور ہمارے دروازوں پر بھارتی فوجی شکاری کتوں کی طرح تاک میں کھڑے ہیں۔ گھروں کے مکینوں کو دروازے اندر سے بند کرنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ میں یہاں آرام سے کیسے رہ سکتا ہوں۔ اس ننھے مجاہد میں مکمل ذہنی پختگی آ چکی تھی۔ ہم دونوں انہیں گیٹ کے باہر تک خدا حافظ کہنے گئے۔ مدثر (ساجد) دیر تک لطیف صاحب سے بغلگیر رہا۔ میں نے سب کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں۔ رات کے اندھیرے میں لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے یہ سب فرشتے آنسوؤں کی دھند میں غائب ہو گئے۔

اگلے روز روسی عفریت کو افغانستان سے نکالنے کے لئے مجاہدین کا ایک قافلہ خوست کے محاذ پر جا رہا تھا۔ اس میں ہمارا بیٹا بھی شامل تھا۔ جگر لخت لخت تھا۔ اللہ کے شیروں کا ایک قافلہ سری نگر روانہ ہو رہا تھا اور دوسرا افغانستان، لیکن روح میں ایک عجیب سا ارتعاش تھا۔ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تقریباً ایک ماہ اسی طرح بے چینی میں گزر گیا۔

ایک دن سری نگر کے اخبار ''آفتاب'' کا پرچہ موصول ہوا۔ اس میں مدثر (ساجد مظفر) رضوان، فیروز اور دیگر چھ لڑکوں کی شہادت کی خبر مع تصاویر کے درج تھی۔ میں نے یہ سب تصاویر پہلی ہی نظر میں پہچان لیں۔ یہ وہی گلدستہ تھا جو میں نے خواب میں سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر رسول اللہ ﷺ کے انتظار میں سجا ہوا دیکھا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اشرف ڈار کی شہادت کی خبر بھی موصول ہوئی۔ بعد میں ملنے والی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنے گھروں کو جا ہی نہیں سکے، راستے ہی میں بھارتی فوج کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ میں شہید ہو گئے۔ مجھے رہ رہ کر ان کی ماؤں اور بہنوں کا خیال آ رہا تھا۔ میرے خدا! ان پر کیا گزری ہو گی؟ ایک عرصے تک دل کی یہی کیفیت رہی۔ ہم دونوں کو کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ روح کی ایک عجیب اجنبی دنیا تھی جس میں ہم اترتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ انتہائی ڈرامائی انداز میں ہم دونوں کو اچانک حج کا بلاوا آ گیا۔ جو ایک الگ عجیب داستان ہے۔ وہاں طواف بیت اللہ کے دوران صفا مروہ میں منیٰ عرفات اور مزدلفہ میں ہر کہیں ان معصوم شہداء کے مبارک چہرے نظروں کے سامنے رہتے۔ ساجد کی آواز کہیں فضاؤں سے میرے کانوں میں گونجتی، امی امی میں یہاں ہوں۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ جانے کا وقت آ گیا۔ سارے

راستے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی اور اپنا خواب مجھے تڑپاتا رہا۔ روضۂ اقدس پر پہنچے تو ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ دل سے ایک چیخ سی نکلی۔"آقا کشمیر کے گلابوں کو اپنے حضور بلایا تھا تو بتا اب انہیں کس گلشن میں کھلایا ہے؟ میرے وہ چاند تارے کہاں ہیں؟ میرے لب پر درود وسلام تھا لیکن روضۂ اقدس کی جالی اور بصارت کے درمیان آنسوؤں کا سمندر حائل تھا۔ پاسِ ادب اور گناہوں کے بوجھ سے وجود مٹی ہوا جاتا تھا اور معراجِ محبت اور حدِ ادب کے ضابطوں میں شرک و بدعت کے خوف سے سرکندھوں سے لڑھک رہا تھا۔ دفعتاً عورتوں کا ایک ریلا آیا اور میں گھسٹتی ہوئی ریاض الجنۃ میں پہنچ گئی۔

یہاں بصد مشکل بھیڑ میں دو نفل ادا کئے باہر نکل رہی تھی کہ عقب سے سسکیوں کی آواز آئی، ایک خوبصورت افغان عورت روضے سے ملحقہ بیرونی دیوار سے لگ کر رو رہی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ اس کا شوہر اور بھائی شہید ہو چکے ہیں۔ میں نے بھی بتایا کہ ہم بھی بھارت کے ستائے ہوئے کشمیری ہیں۔ پھر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے گلے مل کر دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ لگتا تھا پورا عالم اسلام ہم دونوں کے درمیان سمٹ آیا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مدینہ منورہ میں چالیس نمازیں پوری کرنے میں ایک ہفتہ لگا، واپسی کا دن آیا تو عجیب بے چینی تھی۔ آنکھیں متورم اور جسم ٹوٹ رہا تھا، رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگلی صبح فجر کے بعد روانگی تھی اور اپنے آقا و مولا ﷺ کے حضور آخری سلام بھی کہنا تھا۔

وقت گھڑی کی ٹک ٹک میں پہلو بدلتے گزر رہا تھا کہ پچھلے پہر عجیب قصہ رونما ہوا۔ خدا معلوم یہ خواب تھا یا حقیقی منظر تھا۔ جاگنے اور سونے کی درمیانی سی کیفیت تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے مسجد نبوی میں قرآن پاک رکھنے والی الماری کے پیچھے بیٹھی ہوں۔ عشا کی نماز پڑھی جا چکی ہے اور لوگ آہستہ آہستہ مسجد سے واپس جا رہے ہیں۔ کچھ دیر میں ساری مسجد خالی ہو گئی ہے اور تالے لگنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مسجد میں ایک عجیب سا سناٹا طاری ہے۔ دور دور تک پھیلی ہوئی وسیع و عریض مسجد میں میرے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ روضۂ اطہر کے سبز گنبد پر خون کو منجمد کر دینے والی خاموشی

طاری ہے۔ معاً کیا دیکھتی ہوں کہ ساری مسجد سفید دودھیا روشنی کی چکاچوند میں نہا گئی ہے اور روضۂ اطہر کی سمت سے ایک آواز ابھرتی ہے کہ تمام زمانوں کے انبیاء کرام تشریف لا رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ امامت فرمائیں گے اس کے بعد امت کے بارے میں مشورہ ہوگا۔

اگلے لمحے مسجد کے تمام دالان کمرے انتہائی دراز قد اور بارعب انسانوں سے کھچا کھچ بھرنے لگتے ہیں۔ ان سب کی پشت میری طرف اور رخ روضۂ اطہر کی طرف ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی اوٹ میں روضۂ اطہر میری نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے معاً نور کا لپکا سا ابھر کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ریاض الجنۃ کے پاس روشنی کا تخت بچھا ہوا ہے اور حضور انور ﷺ اس پر جلوہ افروز ہیں۔ یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں پا رہی صرف محسوس کر رہی ہوں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ دائیں طرف مدثر (ساجد مظفر) ہاتھ میں خوبصورت مرصع صراحی لئے کھڑا ہے اور بائیں طرف ایک چھوٹا سا افغان بچہ سرخ شنیل کی واسکٹ اور ٹوپی پہنے ہاتھ میں کچھ پکڑے کھڑا ہے۔ ساجد نے سبز رنگ کا وہی لباس زیب تن کر رکھا ہے جو وہ آخری دن پہن کر نکلا تھا۔ مجھے ان دونوں لڑکوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

مسجد نبوی کے تمام اطراف میں جس طرح کے پرجلال انسانوں سے بھرے پڑے تھے ان میں سے اکثر کے سر مسجد کی چھت تک لگ رہے تھے۔ کسی نے سفید لباس پہنا ہوا تھا، کوئی گہرے چمکدار سبز رنگ کے بڑے بڑے ریشمیں تھوں جیسی کسی پوشاک میں ملبوس تھا۔ ہر ایک کی اپنی آن جان اپنا انداز جلال و جمال تھا۔ لیکن یہ سب مؤدب اور خاموش کھڑی تھے۔ خاموشی بھی ایسی کہ سانسوں کی آواز بھی سنائی دے۔ کچھ دیر کے بعد مدثر (ساجد مظفر) نے سرخ رنگ کا مشروب صراحی سے انڈیل کر تقسیم کرنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ دوسرا لڑکا بھی تھا۔ یہ دونوں بڑھتے بڑھتے میری طرف آ رہے تھے۔ عجیب و غریب خوشبو کی لپیٹیں ان کے آگے آگے پھیل رہی تھیں۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن سے گزر گیا، کاش ساجد مجھے دیکھ لے اور میری سفارش کر کے ملاقات کے لئے شرف باریابی دلوا دے۔

اس خیال کے ساتھ ہی مجھے میرے پورے وجود سمیت میری اوقات نے لپیٹ لیا۔ اے گنہگار انسان تو یہاں کہاں! تو یہاں کہاں! میں پوری قوت سے چیخ رہی تھی اور میرے جسم کا

رواں رواں پسینے میں شرابور خوف سے لرز رہا تھا۔

مدینہ منورہ کے پاکستان ہاؤس کی دیواریں میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھیں۔ میرے شوہر میرے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کا تولیہ رکھے گڑگڑا رہے تھے۔ "خدارا ہوش میں آیئے آج ہماری واپسی ہے اور ہم نے الوداعی سلام بھی کہنا ہے"۔ مسجد نبوی کے میناروں سے اذانِ فجر کی روح پرور آواز میرے خون میں گردش کرتے ہوئے میرے جسم کے اجنبی سیارے کے مدار میں طواف کر رہی تھی۔ میں نے آج اپنے اندر کی ایک نئی دنیا کو دریافت کیا تھا جس کے ہر گوشے میں ایک ہی آواز گونج رہی تھی......

اللہ اکبر اللہ اکبر، اللہ اکبر اللہ اکبر

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

فدائی حملوں میں جامِ شہادت نوش کرنے والی خواتین

تلخیص و ترجمہ: سلیم باسط

عالمی جنگوں کی تاریخ خودکش حملے کرنے جاں بازوں کے تذکرے سے بھری پڑی ہے۔ ان جاں بازوں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خاطر وہ عظیم قربانی دی جس کا عام زندگی میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے بیشتر کی قربانیاں رنگ لائیں اور ان کے ملک اور قوم کو غلامی کی ذلت سے محفوظ رہنے کا ایک موقع مل گیا۔ دورِ حاضر اگرچہ مادہ پرستی کا دور ہے، جذبوں اور جوش کی کمی ہے۔ اس کے باوجود کئی ملکوں میں سرفروشی کی وہ شمع روشن ہے جس نے دشمنوں کو دہلا کر رکھ دیا ہے اور تمام دنیا میں ان کی اس سرفروشی اور عظیم قربانی کی گویا دھوم مچی ہوئی ہے۔

فسلطین اور چیچنیا دنیا کے دو ایسے خطے ہیں جہاں کے لوگ ظلم و جبر کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان دو علاقوں میں خودکش حملوں کے ذریعے ایک جانب دشمن کو شدید نقصان پہنچایا جا رہا ہے تو دوسری جانب دنیا کی تمام مہذب اقوام اور عالمی ادارہ بھی ان حملوں کی شدت کی وجہ سے چونک سا گیا ہے۔

جہاں تک چیچنیا کا تعلق ہے، وہاں مجاہدین کی باقاعدہ تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں۔ چیچنیا کے مسلمان غاصب روسی فوجوں کے ظلم کے خلاف مسلسل احتجاج کر رہے ہیں اور احتجاج کا یہ دائرہ اب خواتین تک محیط ہو گیا ہے۔

مارک فرنچیٹی نے چیچنیا کے دارالحکومت گروزنی سے سن ڈے ٹائمز کو اپنی تازہ ترین رپورٹ میں ایک مجاہدہ کی کہانی بیان کی ہے، جو اپنے شوہر کی روسی فوجیوں کے ہاتھوں بہیمانہ موت

کے بعد سراپا انتقام بن چکی ہے اور خودکش حملے کے لیے تیار ہے۔ مارک نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ چیچنیا کا ایک مضافاتی علاقہ ...... رات پوری طرح پھیل چکی ہے۔ ایک منزلہ مکان کے دروازے سے ایک سیلون کار اندر داخل ہوتی ہے۔ کار کے شیشے گہرے رنگ کے ہیں۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان بیوہ انتہائی تحمل کے ساتھ کار کی پچھلی جانب کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس خاندان نے اپنے سر اور چہرے کو رومال ڈھانپ رکھا ہے۔ اس کے ساتھی دو انقلابی جنگ جو مکان میں داخل ہو گئے ہیں اور انہوں نے اس بات کا اطمینان حاصل کر لیا ہے کہ وہ یہاں محفوظ ہیں۔

وہ خاتون بلب کی مدھم روشنی میں سائے کی طرح نظر آ رہی ہے۔ اب اس خاتون نے مکان کے فرش پر اپنے قدم رکھے ہیں اور میں اس سے اُن الم ناک واقعات کی تفصیل معلوم کر رہا ہوں جو اُس کے ساتھ گزشتہ چار ہفتوں کے دوران پیش آئے ہیں۔

اس کی گفتگو سنے بغیر کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ اس نوجوان خاتون کے شوہر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے شوہر کے قاتلوں میں سے ایک شخص کو چند گھنٹوں قبل عبرت ناک انداز میں مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس شخص کا گلا کاٹ دیا گیا تھا۔ اس خاتون نے اب سے چند گھنٹوں قبل ہی اپنی ایک سال کی اکلوتی بیٹی کو آخری بار پیار بھی کیا تھا۔

اب یہ خاتون جسے اس کے ساتھی ''کاوا'' کے نام سے جانتے ہیں، چیچنیا کی ''سیاہ پوش بیواؤں'' میں شامل ہو چکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کی موت کا انتقام لینے کے لئے خود کو ایک ''انسانی بم'' میں بدلنے کے لئے تیار ہے۔

کاوا اپنی نوعیت کے اس پہلے انٹرویو میں کہتی ہے۔ ''اب میرا ایک ہی خواب اور ایک ہی مشن ہے کہ میں اپنے آپ کو روس میں دھماکے سے اڑا دوں۔ یہ مقام اگر ماسکو میں ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ روسی میرے ساتھ ہلاک ہوں۔

میں چاہتی ہوں کہ مجھے اس مشن پر بھیجا جائے۔ میں انتقام لینا چاہتی ہوں۔ روسی فوجوں کو چیچنیا کے عوام کے قتلِ عام سے باز رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح انہیں پیغام مل جائے اور وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔

بائیس سالہ ''کاوا'' نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب خود کو بم سے اُڑانے کے علاوہ اس کی زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ چیچنیا گزشتہ نو سال سے روسی فوجیوں اور مجاہدینِ آزادی کے درمیان تصادم کی وجہ سے ساری دنیا میں اہمیت اختیار کر چکا ہے۔

گزشتہ دو جنگوں کے دوران اس علاقے میں ایک لاکھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس کے بعد ہی چیچن جاں بازوں اور روسی فوجوں کے درمیان ایک مکمل جنگ کا آغاز ہوا ہے۔ اس جنگ کے ساتھ ساتھ علاقے میں ایک گوریلا جنگ کا بھی آغاز ہوا ہے۔ اس جنگ میں ''کاوا'' جیسی خواتین ''خودکش بمبار'' انسانوں کی حیثیت سے اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

گزشتہ سال ۱۸؍اکتوبر کو یہ خواتین ان چالیس چیچن جاں بازوں کے ساتھ شریک تھیں، جنہوں نے ماسکو تھیٹر کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ یہ ایک ایسا محاصرہ تھا جس کا اختتام ۱۲۹؍افراد کی موت پر ہوا تھا۔ یہ سب کے سب تھیٹر کے ناظرین تھے۔ تھیٹر کو محاصرے میں لینے والے مجاہدین بھی اس حملے میں ہلاک (شہید) ہو گئے تھے۔ اس سال جولائی میں دو خواتین نے ماسکو کے قریب ایک راک فیسٹیول پر حملے کیے۔ ان حملوں میں 16 افراد ہلاک ہو گئے تھے اور روس اور اس کے اطراف کے ملکوں میں زبردست خوف وہراس پھیل گیا تھا۔

گزشتہ تین ماہ کے دوران چیچنیا میں جاں بازوں کی جانب سے جو سات خودکش حملے ہوئے ہیں، ان میں سے چھ حملے خواتین نے کیے تھے۔

اور اب ''کاوا'' کی باری ہے۔ اپنی کمسن بچی کو ساس کے حوالے کر کے وہ ان جاں بازوں کے پاس پہنچ گئی تھی، جن کی تعداد بیس سے تیس کے درمیان تھی۔ یہ جاں باز اپنی قومیت کے لئے جنگ نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ان کا بنیادی مقصد چیچنیا کو ایک اسلامی مملکت بنانا ہے۔

کاوا کے شوہر کی طرح یہ افراد بھی وہابی ہیں، جو اپنے عقائد پر نہایت سختی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ اب کاوا اپنی زندگی کے آخری لمحات اسلامی کتب کے مطالعے اور عبادات میں گزارے گی تا کہ مکمل طور پر جذبۂ شہادت سے سرشار ہو سکے۔

جب تک کاوا اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتی، اس پر چوبیس گھنٹے سخت پہرا رہے گا۔ اب اُس کا اپنے خاندان سے کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے خاندان کے افراد کو بھی اُس کے

منصوبوں کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔اب وہ مکمل طور پر اپنے کمانڈر کے رحم وکرم پر ہے۔ کمانڈر ہی اُس کے ٹارگٹ اور اس کے وقت کا تعین کرے گا۔اسے اس دوران دھما کا کرنے کی تربیت دی جائے گی۔دھماکا خیز مادہ اس کی کمر میں بندھی ہوئی بیلٹ میں رکھا گیا ہے۔

جب اس سے سوال کیا گیا کہ ایک سالہ بچی کی ماں اتنا بڑا قدم کیسے اُٹھا سکتی ہے؟ تو کاوا نے جواب دیا۔"دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں۔میرے شوہر کے رشتے دار میری بچی کی دیکھ بھال کریں گے۔"

اس کی آواز میں کسی بھی قسم کے خوف یا اُداسی کی جھلک نہیں ہے۔میں اسے ایک بار پھر اس کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"تمہاری بچی کو تو زندہ رہنے کا حق ہے۔" وہ جواب میں کہتی ہے"ہم ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔"

میں اس غیر معمولی خاتون کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔اس کا قد تقریباً پانچ فٹ تین انچ تھا اور وہ ایک نیلے رنگ کا لمبا سا لباس پہنے ہوئے تھی ،جس پر خوب صورت پھول کڑھے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا اصلی نام بھی معلوم نہیں تھا۔مگر اس کے مضبوط ارادوں کا بخوبی علم تھا۔

روسی فوجوں سے اس کی نفرت کا آغاز 1995ء میں اس وقت ہوا تھا، جب اس کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔روسی فوجیوں نے رات کے وقت اس کے گھر پر چھاپا مارا تھا اور اس کے والد کو ہلاک کر دیا تھا۔

اس نے بتایا کہ فوجیوں کا ایک گروہ دروازہ توڑ کر اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔وہ سب کے سب نشے میں تھے۔انہوں نے مردوں کو ایک کمرے میں اور عورتوں کو بچوں کو دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد میں فائرنگ کی آواز سنی۔میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں ڈرانے کے لئے ہوائی فائرنگ کر رہے ہیں۔لیکن جب ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو میں نے دیکھا کہ میرے والد مردہ حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور میرے دادا زخمی ہیں۔اس واقعے کے بعد موت میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گئی۔

بعد میں وہ سلمان کی محبت میں گرفتار ہو گئی جو اس سے دو سال بڑا تھا۔وہ گروزنی میں

ساتھ ساتھ اسکول جاتے تھے اور اس دوران وہ کئی بار شاید بم باری سے بال بال بچے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے یہاں کبھی اتنی شدید بم باری نہیں ہوئی تھی۔

چیچنیا میں جاں بازوں اور روسی فوجوں کے درمیان شدید تصادم کے باوجود کاوا ایک اچھی طالبہ تھی۔ وہ اسکول میں انگریزی سیکھ رہی تھی، مگر اس کے تمام خواب اس وقت ادھورے رہ گئے جب اب سے دو سال قبل ان دونوں نے شادی کرلی۔ سلمان نے شادی کے بعد جاں بازوں کے ایک چھوٹے سے گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔

چیچن انقلابیوں کے پرانے گروپ کے برعکس جو سوویت یونین کے دور سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا، سلمان اور اس کے ساتھی اپنی جدوجہد کو ماسکو کے خلاف ایک مقدس جنگ سمجھتے تھے۔

کاوا اپنے شوہر اور اس کے ساتھیوں کی جدوجہد کی مکمل حمایت کرتی تھی۔ اس نے نقاب پہننی شروع کردی اور اپنے آپ کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ اسلامی تعلیمات سے متعلق مختلف کتب سلمان گھر لے کر آتا تھا۔

گزشتہ ماہ سلمان کو روس دشمن قرار دے دیا گیا۔ ماسکو نواز چیچن قوتوں نے چیچن چھاپہ ماروں کے چھوٹے گروپوں کے خلاف ایک بڑی مہم کا آغاز کیا۔ سلمان پر رات کے وقت چھپ کر حملہ کیا گیا۔ اسے کئی گولیاں ماری گئیں۔ اس کا چہرہ مشین گن کی فائرنگ سے مسخ ہوگیا تھا اور اسے پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اسی وقت اس کی شہادت کا انتقام لینے کی قسم کھائی۔

سلمان کے ساتھی جاں بازوں نے اسپیشل فورسز کے بارے میں ایک اطلاع ملنے پر اس ٹیم کے ایک چیچن رکن کو نشانہ بنایا جس نے سلمان کو شہید کیا تھا۔ سلمان کے ایک دوست نے بتایا کہ ہم اس شخص کو ایک محفوظ مکان میں لے گئے۔ ہم کل سات افراد تھے۔ ہم نے سلمان کے قاتل کو کاوا کے سامنے پیش کیا اور اسے اس بات کا موقع دیا کہ وہ اس شخص کو سب سے پہلے گولی مارے مگر وہ اس پر گولی چلائے بغیر واپس چلی گئی۔

سلمان کا قاتل بچوں کی طرح رو رہا تھا اور رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ ہم نے سب سے پہلے اس کی ایک ٹانگ پر گولی ماری۔ اس کے بعد دوسری ٹانگ پر۔ اس کے بعد اس نے ان دیگر افراد کے نام بتا دیئے جو سلمان کی شہادت میں شریک تھے۔ اس کے بعد ہم نے اس شخص کے

کندھوں پر گولیاں ماریں اور آخر میں اس کا گلا کاٹ دیا۔ یہ منظر کاوا نے بھی دیکھا۔ ہمارے لیے یہ ایک مشکل کام تھا، ہم نے اس کی مکمل فلم بندی کی۔

کاوا نے اس واقعے پر اپنے ردِّعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اس شخص کو اپنے ہاتھوں سے اس لیے ہلاک نہیں کیا کہ میرے منصوبے کچھ اور تھے۔ میں دیگر لوگوں کے انداز میں نہیں سوچ رہی تھی۔ مجھے اس شخص کی موت پر افسوس ہے مگر وہ اسی کا مستحق تھا۔ کاوا نے کہا کہ مجھے اس واقعے پر کوئی جھٹکا نہیں لگا۔ میں اس سے قبل کئی بار لوگوں کو ہلاک ہوتے ہوئے دیکھ چکی ہوں۔

اس واقعے کے بعد بھی کاوا کے دل میں لگی ہوئی انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اس کے کئی دن بعد وہ سلمان کے کمانڈر کے پاس گئی اور اس بات کا حلف اٹھایا کہ وہ اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہے۔

اس حلف کے بارے میں اس کے شوہر کے بعض قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا تاہم کچھ عرصے قبل سلمان کی والدہ کو اس بات کا شبہ ہوا کہ کاوا کی جان خطرے میں ہے۔

کاوا کو اچانک اپنے ہی گھر میں محصور کر دیا گیا۔ سلمان کی والدہ جو اپنے اکلوتے بیٹے کی شہادت پر پہلے ہی غم زدہ تھیں، اب اپنی بہو اور پوتی کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے پہلے کاوا کے باہر نکلنے پر پابندی لگائی پھر اسے ایک کمرے میں بند کر دیا۔

اس تشویشناک صورتِ حال کو سلمان کے کمانڈر نے کم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنا ایک نمائندہ کاوا کے گھر بھیجا اور اس کی رہائی کی درخواست کی۔ سلمان کی والدہ نے کاوا کو باہر بھیجنے سے انکار کر دیا۔ یہ صورتِ حال تین روز تک جاری رہی۔ اس کے بعد سلمان کا کمانڈر بذاتِ خود کاوا کے گھر گیا اور اسے قیدِ تنہائی سے رہائی دلوادی۔ چیچن انقلابی کاوا کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس کی کمسن بچی کو پیچھے چھوڑ دیا۔ سلمان کی والدہ اب بھی اس بات سے واقف نہیں تھی کہ ان کی بہو اب واپس نہیں آئے گی۔ کاوا نے بتایا کہ گھر سے رخصت ہوتے وقت اس کے کسی کو خدا حافظ بھی نہیں کہا۔

چیچنیا میں "سیاہ پوش بیواؤں" کے حوالے سے رائے عامہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اکتوبر میں چیچنیا کے روس نواز سربراہ کے عہدے کے لئے انتخاب ہونے والے ہیں اور اس دوران تناؤ میں مزید اضافے کا امکان ہے۔

چیچنیا کے قدامت پسند مسلمان خواتین کی ان سرگرمیوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، مگر نوجوان نسل کا خیال ہے کہ خواتین کو ان سرگرمیوں میں ضرور حصہ لینا چاہئے کیونکہ وہ بلاشک وشبہ ہر مقام پر پہنچ سکتی ہیں۔

عائشہ بوکھو یوا ان خواتین میں شامل تھی، جنہوں نے ماسکو تھیٹر پر حملے میں حصہ لیا تھا، اس کے چار بھائی چیچنیا میں ہلاک کیے جا چکے تھے۔ حملے کے وقت اس نے اپنے سینے پر دھما کا خیز مادہ باندھ رکھا تھا۔ اس حملے میں حصہ لینے والی خواتین میں سے سب سے کم عمر خاتون کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ اس وقت سولہ ہزار روسی چیچنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ کریملین کا دعویٰ ہے کہ جن خواتین کو خودکش حملوں پر مجبور کیا گیا تھا، ان میں سے کئی خواتین کی عصمت دری بھی کی گئی تھی۔ کاوا ان تمام الزامات کو جھوٹ قرار دیتی ہے، اس کا کہنا ہے کہ زیادہ تر واقعات میں ان خواتین کا مقصد روسی فوجوں سے انتقام لینا تھا۔ انہیں کسی نے خودکش حملوں کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ ان میں زریتا بیراکووا بھی شامل ہے۔ جس کی عمر صرف بیس سال تھی۔ اس کے خودکش حملے کے پس منظر میں کوئی جذبۂ انتقام بھی نہیں تھا۔ زریتا کی والدہ مرینہ نے بتایا کہ ایک سہ پہر جب وہ اور زریتا نماز پڑھ رہی تھیں تو دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولنے پر ایک عورت گھر میں داخل ہوئی جسے انہوں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ عورت زریتا کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ پانچ منٹ بعد زریتا نے باہر آ کر کہا کہ وہ کچھ دیر کے لئے باہر جانا چاہتی ہے۔ اس کے گھر والوں نے اس کے بعد اسے نہیں دیکھا۔

جہاں تک کاوا کا تعلق ہے، اس کے مستقبل کا آخری فیصلہ اس کے کمانڈر ہی کریں گے۔ اب وہ اپنی شہادت کی تیاریاں کر رہی ہے اور روانگی کے لیے تیار ہے۔ میں نے اسے آخری بار سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تم اپنی کمسن بچی کی خاطر اپنے ارادے سے باز آ جاؤ۔'' کاوا نے ایک نظر میری جانب دیکھا، پھر بولی ''آپ مجھے خدا حافظ کہیں۔'' اس کے بعد وہ گہرے اندھیروں میں غائب ہو گئی۔ الفاظ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

......☆......

فلسطین کی جانباز خواتین

۲۰۰۲ء کے دوران فلسطین میں خواتین کی جانب سے خودکش حملوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صورت حال پر عالمی سطح پر تشویش کا اظہار بھی کیا گیا۔ مشرق وسطیٰ خصوصاً فلسطین میں جن خواتین نے خودکش حملوں میں حصہ لیا ہے، ان میں سب سے پہلی خاتون ۲۶ سالہ وفا ادریس ہیں۔ ان کا تعلق رملہ کے مہاجر کیمپ سے تھا اور وہ ایک ایمبولینس ورکر تھیں۔ اس سال جنوری میں وفا نے وسطی بیت المقدس میں خود کو بم سے اڑا لیا تھا۔ اس حملے میں ایک اسرائیلی ہلاک اور سو سے زائد افراد زخمی ہوئے تھے۔

بیس سالہ دارین ابوعیش، نابلس یونیورسٹی کی طالبہ تھیں۔ انہوں نے حماس کی جانب سے رکنیت نہ ملنے پر الاقصاء بریگیڈ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنے آپ کو وسطی بیت المقدس میں بم سے اڑا لیا تھا۔ اسرائیلی پولیس کا ایک اہلکار حملے میں ہلاک ہوا تھا۔

آیت الاخراس کی عمر ۱۸ سال تھی، اُن کا تعلق بیت اللحم کے ایک مہاجر کیمپ سے تھا۔ انہوں نے ایک پُر ہجوم سپر مارکیٹ میں خود کو بم سے اڑا لیا تھا۔ جس کے نتیجے میں دو افراد ہلاک ہو گئے تھے۔

چیچن خواتین موت کی شاہراہ پر

جون ۲۰۰۰ء

بائیس سالہ خاوا بیری وا ایک ٹرک چلاتی ہوئی جس میں دھماکا خیز مادہ لدا ہوا تھا، ایک روسی فوجی کیمپ میں گھس گئی۔ یہ کیمپ گروزنی سے چھ میل جنوب میں واقع تھا۔ اس خوف ناک دھماکے میں سترہ روسی فوجی ہلاک ہوئے۔

نومبر ۲۰۰۱ء

ایلزا گیمزدیاوا اپنے کپڑوں میں دستی بم چھپا کر لے گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو ایک فوجی قافلے کے سامنے اڑا لیا۔ ایک روسی کمانڈر بھی اس کے ساتھ ہی ہلاک ہو گیا۔ یہ واقعہ چیچنیا کے ایک شہر عرگن مارتن میں پیش آیا۔

مئی ۲۰۰۳ء

گروزنی کے ایک گاؤں الیاس خان یورٹ میں دو خواتین نے خودکش بم دھماکوں کے ذریعے ۳۰ افراد کو ہلاک اور ۱۵۰ کو زخمی کر دیا۔

جون ۲۰۰۳ء

ایک چیچن خاتون نے چیچنیا کی سرحد کے قریب ایک روسی اڈے مزدوک میں ایک بس میں خود کو بم سے اڑا لیا۔ بس میں روسی فضائیہ کے افراد سوار تھے۔ اس واقعے میں ۱۸ روسی ہلاک ہوئے۔

جولائی ۲۰۰۳ء

ایک چیچن خاتون نے ماسکو کے ایک راک کنسرٹ کے دوران خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اس واقعے میں سولہ افراد ہلاک ہوئے۔ ماسکو میں ہونے والا یہ پہلا خودکش حملہ تھا۔ خاتون نے دھماکا خیز مادہ اپنی بیلٹ میں چھپا رکھا تھا۔

جولائی ۲۰۰۳ء

ماسکو کے وسطی علاقے میں ایک چیچن خاتون کو گرفتار کیا گیا۔ اس خاتون نے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑانے کی کوشش کی تھی۔ بم ڈسپوزل سے متعلق ایک روسی افسر اسی دوران ہلاک ہوا۔

خدا اِس دور کی عورت کو ایسا ولولہ بخشے

ظفر اقبال ظفر

نظر کے سامنے تاریخ کے اوراق آتے ہیں
بہادر بیبیوں کے تذکرے غیرت دلاتے ہیں
وہ کیسی عورتیں تھیں دینِ حق نے جن کو عظمت دی
مؤرخ نے جنہیں ہر حال میں دادِ شجاعت دی
جنہیں کچھ ڈر نہیں ہے ضعف سے، پیرانہ سالی سے
جو تلواروں کے سائے میں کھڑی ہیں عزمِ عالی سے
کہیں شامی مقابل ہیں کہیں رومی مقابل ہیں
مگر وہ لشکرِ اسلام کی ہر صف میں شامل ہیں
اگرچہ حضرتِ صفیہؓ کی وہ پیرانہ سالی تھی
مگر احزاب میں دادِ شجاعت کیا مثالی تھی

ابھی تک نقش ہے تاریخ میں یرموک کا میداں
ڈٹی ہیں حضرتِ اسماءؓ جہاں پر صاحبِ ایماں
یہ عظمت آج تک بھی اُمِ عبداللہؓ کی بابت ہے
کہ بیٹے کی لٹکتی لاش پر جوشِ خطابت ہے
اُحد میں زخم کھا کر کامراں ہیں اُمِ عمارہؓ
درِ خیبر تلک پھر جاوداں ہیں اُمِ عمارہؓ
وہ ضعفِ حضرتِ خنساءؓ، وہ بیٹوں کی جوانمردی
کہ جن کے رُعب سے چھائی تھی روئے کفر پر زردی
وہ ہو کر کامراں اُمِ سلیمؓ آئی ہیں خیبر سے
یہ وہ دادِ شجاعت ہے جو ملتی ہے مقدر سے
یہ کیسی شان سے اُمِ ابانؓ ہوتی ہیں صف آراء
مقابل رومیوں کے بج گیا نصرت کا نقارہ
گواہی کے لئے تاریخ کے دشت و بیاباں ہیں
فتوحاتِ عراق و شام میں خولہؓ نمایاں ہیں
یہ منظر چشمِ باطل نے بھی دیکھا تھی حیرت سے
بڑھیں یرموک تک اُمِ حکیمؓ اپنی شجاعت سے
قیامت تک کوئی ذکرِ شجاعت اب جہاں ہو گا
جنابِ زینبؓ اُمُ المصائب کا بیاں ہو گا
جو کوہِ عزم تھی پُرسوزِ جاں تھی مثلِ پروانہ
وہ ارضِ ہند پر اک حکمراں تھی رضیہ سلطانہ

حکایت اماں زرغونہؒ کی ہے تاریخ میں عالی
کہ جس کی کوکھ نے بیٹا جنا تھا شاہِ ابدالیؒ
جو اپنے عزم و ہمت سے زمانوں میں مکرّم تھیں
حمیدہؒ بانو ، عنو بی بی اور ماہم بیگم تھیں
کہو کیا چشم پوشی ایک بھی تاریخ داں نے کی
کہ ہندوستان پر شاہی کبھی نور جہاں نے کی
پسِ ماضی وہ جتنے زمزمہ پیرا زمانے ہیں
بہادر عورتوں کی شان و عظمت کے ترانے ہیں
فلسطیں ہو کہ ہو کشمیر عورت اب بھی قرباں ہے
کہ وہ لطفِ شہادت آج بھی مقصودِ نسواں ہے
شجاعت عورتوں کی تمغۂ لوح و قلم ہو گی
کہ یہ تاریخِ دورِ حاضرہ جب بھی رقم ہو گی
خدا اس دور کی عورت کو ایسا ولولہ بخشے
ظفرؔ جو دین کو اپنی شجاعت سے جِلا بخشے

اسلامی پہیلیاں
مولانا روح اللہ نقشبندی غفوری
تقریظ
شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا علاؤ الدین صاحب دامت برکاتہم
مکتبہ عمر فاروق
4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

سکون اور راحت کے متلاشی گھرانوں
کے لیے ایک تحفہ نایاب

مثالی گھرانہ

تالیف و ترتیب
مولانا ثناء اللہ سعد شجاع آبادی

- کامیاب ازدواجی زندگی کا راز
- مسرت بخش زندگی کے گُر
- خواتین کو دین دار بنانے کا طریقہ
- لڑائی جھگڑوں سے حفاظت کی عمدہ تدبیریں
- رنج و غم میں مومنانہ کردار
- گھر برباد کیوں ہوتے ہیں؟
- شوہر کو تابع کرنے کی تدبیر
- بچے کی نشو و نما ابتداء سے انتہا تک
- میاں بیوی میں اختلاف کی وجہ
- اسلام میں اولاد کی تربیت
- اولاد کی پرورش کرنے کا طریقہ
- خاندان اور بچے کی مثالی تربیت
- جوان لڑکی کی ذمہ داری
- بیٹیوں کے لئے رشتے تلاش کرتے وقت کی ہدایات
- لڑکے کی ذمہ داری
- سسرال میں رہنے کا طریقہ
- دلہن بننے والی بچی کو ہدایات

مکتبہ عمر فاروق

ناشر

شاہ فیصل کالونی نمبر 4، کراچی۔ فون نمبر: 4594144-8352169
موبائل: 0334-3432345